شمارہ نمبر 03

ادبیات انٹرنیشنل

اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات انٹرنیشنل

آن لائن شمارہ نمبر 3، سال 2023

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ ایٹ، ون، اسلام آباد

CamScanner

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

بین الاقوامی مجلس مشاورت

ضروری گزارشات

- ☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں۔
- ☆ نگارشات کے ساتھ اپنا اصل نام، قلمی نام، ای میل اور ڈاک کا پتہ تحریر کریں۔
- ☆ قابل اشاعت نگارشات کے نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

ترتیب

تن بیتی

تہذیب، روایت، اسلوب

تتلیاں خیال کی

ہماری نحیف سی شمع

اکادمی ادبیات پاکستان میں ذمے داری ملی تو میرے ذہن میں کئی منصوبے کروٹیں لے رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ دنیا بھر میں تیزی سے پھیلتی ہوئی اردو کی نئی بستیوں کو ایک ترجمان فراہم کیا جائے اور اس مقصد کے لیے "ادبیات انٹرنیشنل" کے نام سے پرچہ شائع کیا جائے۔

ڈاکٹر فاروق عادل صاحب کو میں نے اپنا راز دان بنایا۔ انھوں نے اس منصوبے کی افادیت کی تائید کی تو میں نے یہ ذمے داری بھی برادرانہ دباؤ ڈال کر ان کے سپرد کر دی۔ الحمدللہ میرا تجربہ کامیاب رہا۔ پرچہ بھی کامیابی سے شائع ہو گیا اور اس کے ذمے داروں کی شبانہ روز محنت سے اردو کی نئی بستیوں کے ادیب اور شاعر بھی ایک لڑی میں پروئے گئے۔

یہ سطور لکھتے ہوئے میرا دل خوشی سے بھر گیا ہے کہ آج تیسرا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ امید کرتا ہوں کہ ہم ہوں نہ ہوں، مہجری ادب کو زبان دینے کے لیے ایک چھوٹی سی شمع جو ہم نے جلائی ہے، آنے والے دنوں بھی فروزاں رہے گی ان شاء اللہ۔

اپنے رفقائے کار کی محنت اور لگن کا اعتراف کرتے ہوئے میں دنیا بھر میں مقیم اردو ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کی سپاس گزاری بھی ناگزیر سمجھتا ہوں جنھوں نے اس کار خیر میں ہمارا ہاتھ بٹایا یعنی ہماری درخواست پر اپنی قابل قدر تخلیقات سے ہمیں نوازا۔ یہ ان بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں کا فکری اثاثہ ہی ہے جس نے اس پرچے کو معیار اور اعتبار عطا کیا۔ اس کرم فرمائی پر میں اردو کی نئی بستیوں کے تمام باسیوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

ایسا کم ہوتا ہے کہ جو سفر ایک خاص خیال کے ساتھ شروع کیا جائے، اسی شعور اور جذبے کے ساتھ وہ جاری و ساری بھی رہے لیکن مجھے خوشی ہے کہ ادبیات انٹرنیشنل کے مدیر اور ان کے ساتھیوں

ڈاکٹر جنید آزر اور اطہر قیوم راجا نے اس خیال کو بلا کم و کاست پروان چڑھایا۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں "ادبیات انٹرنیشنل" کے شمارے اسی جوش و جذبے کے ساتھ آپ کے ذوقِ مطالعہ کی آبیاری کرتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔

ڈاکٹر یوسف خشک میریٹوریس پروفیسر
چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

تمنا کا تیسرا قدم

یہ ہماری تمنا کا تیسرا قدم ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اردو کی نئی بستیوں میں مقیم احباب نے توقعات سے بڑھ کر حوصلہ افزائی کی۔

خیال تو یہی تھا کہ ادبیات انٹرنیشنل کا ہر شمارہ ایک مرکزی خیال کے تحت پیش کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ ہمارا اردو دان طبقہ جب ترکِ وطن کر کے دور دیسوں میں جا بستا ہے تو وہاں اس کے مشاہدات مختلف ہوتے ہیں۔ تہذیب، ثقافت، انسانی رویے اور وہ باتیں جنھیں اقبال نے زمانے میں پنپنے کی باتیں قرار دیا ہے۔ ادیب جب وطن سے دور جا کر یہ سب کچھ دیکھتا ہے تو اس کے من میں چھپی ہوئی تخلیقی قوت زندگی کے کسی خاص مرحلے پر کروٹ لے کر بیدار ہوتی ہے اور پھر ایسا ظہور میں آ جاتا ہے جسے معجزۂ فن کی نمود کہا جا سکے۔

ادبیات انٹرنیشنل کے پہلے دو شماروں میں اس معجزۂ فن کی جھلکیاں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ تیسرے شمارے میں صورت حال ذرا مختلف ہے۔ اس انداز کی تحریروں کا معتد بہ حصہ اردو لکھنے والوں کے بجائے زبانِ غیر سے میسر آیا ہے۔

جناب نصر ملک ہمارے وہ ادیب، دانش ور اور صحافی ہیں جن پر حضرت امیر مینائی کا وہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا۔ نصر ملک صاحب نے صحافت میں سکہ تو جمایا ہی تھا، ادب پر بھی گہرا نقش چھوڑا ہے۔ اب وہ تراجم کی طرف مائل ہیں۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ انگریزی کے بجائے براہ راست ڈینش زبان سے ترجمہ کرتے ہیں۔ اس طرح اردو کا دامن ڈینش زبان و ادب کے موضوعات، تکنیک اور لہجے سے متعارف ہوتا ہے۔ خلد آشیانی انتظار حسین نے نغز گو حضرت عبدالعزیز خالد کے تعلق سے لکھا ہے کہ وہ دوسری زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور مال وحاذ کر کے اردو کو

نئے الفاظ سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ ڈینش زبان کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہی کام ہمارے نصر ملک بھی کر رہے ہیں۔ اس شمارے کے لیے انھوں نے ڈینش زبان میں لکھی گئی پانچ کہانیوں کے تراجم ارسال کیے۔ ان کہانیوں کی مصنفہ ایک ڈینش سفارت کار کی اہلیہ محترمہ برگیٹے والو ہیں۔ اپنے شوہر کی ذمے داریوں کے باعث انھیں ہندوستان میں قیام کا طویل موقع میسر آیا جہاں ان کے اندر کے ادیب نے ہندوستانی معاشرے میں ذات پات کے استحصالی نظام سے پیدا ہونے والی ناانصافی کو اپنے فن کا موضوع اس طرح بنایا کہ ادب عالیہ وجود میں آگیا۔ یوں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ کہانیاں اس پرچے کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

ہماری خواہش تھی کہ ہمارا اردو ادیب بھی اسی ڈینش خاتون کی طرح اپنے نئے وطن میں یا ہجرت کے مقام سے کچھ اسی قسم کے مشاہدات کو اپنی تخلیق کا حصہ بنائے۔ یہ کام ہوا ضرور ہے لیکن اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکا جس کی خواہش تھی۔ اللہ نے چاہا تو ایک روز یہ منزل بھی سر ہو جائے گی۔

اس پرچے کو خیال سے حقیقت میں بدلنے کا کٹھن مرحلہ پورا نہ ہو پاتا، اگر پرچے کے لیے لکھنے والے دوستوں کا فراخ دلانہ تعاون ہمیں حاصل نہ ہو پاتا یا ان میں سے بعض دوستوں نے دیگر دوستوں کو اس کے لیے لکھنے کی بھرپور ترغیب نہ دی ہوتی۔ ان سب دوستوں کا فرداً فرداً شکریہ۔

یہ پرچہ اپنے مقررہ وقت کے مطابق تیار نہ ہو پاتا اگر ہمارے نگران اور اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف خشک کی توجہ اور راہ نمائی ہمیں حاصل نہ ہوتی۔ ادبیات کے مدیر برادر محترم اختر رضا سلیمی کا بہت سے پیچیدہ فنی معاملات میں بھی محبت بھرا تعاون ہمیں حاصل رہا جس پر ہم ان کے بھی ممنون ہیں۔

اس پرچے کا شعری حصہ تو مکمل نہ ہو پاتا اگر برادر عزیز ڈاکٹر جلیل آزر اس کام میں جت نہ جاتے۔ ہمارے بھائی اطہر قیوم راجا بھی ہمیں اس سفر میں مسلسل مشوروں سے نوازتے رہے۔

ان سب کے لیے بھی بہت سی محبت اور دعائیں۔

ڈاکٹر فاروق عادل

مدیر اعزازی

رئیس وارثی (نیویارک: امریکہ)

ہے کہاں اس کی حد

سرنگوں ہے قلم
کیا کرے یہ رقم
مضطرب فکر ہے
یہ عجب ذکر ہے
ذہن الجھا ہوا
علم سہما ہوا
لفظ جھجھکے ہوئے
حرف بکھرے ہوئے
ہے پریشاں زباں
اس کی حمد و ثنا
میرے بس میں کہاں
یہ زمیں آسماں
چاندنی کہکشاں
لوح و کرسی قلم
اہل جاہ و حشم
اس کی تخلیق سب
وہ تو سب کا ہے رب
صاحب کن فکاں

اس کی حمد و ثنا
میرے بس میں کہاں
جو ہے سب سے بڑا
جو ہے سب کا خدا
جس کی دہلیز پہ
سب کے جھکتے ہیں سر
جس کی خیرات پہ
انبیا کا گزر
قائم ولامکاں
اس کی حمد و ثنا
میرے بس میں کہاں
وہ ازل وابد
ہے کہاں اس کی حد
کون سمجھے اسے
کون جانے اسے
صرف اتنی خبر
ہے دل معتبر
ہے وہی کبریا
اور اس کے سوا
کیسے ممکن بیاں
اس کی حمد و ثنا
میرے بس میں کہاں

سلیم محی الدین (بھارت)

مہر حسن و مہر ماہ عشق

مہر حسن و مہر ماہ عشق
وجہ تخلیق جہاں
اے سبیل راہ عشق
آپ سے منسوب ہے
آہ عشق و واہ عشق
اے شرائی لقب
آپ ہیں آگاہ عشق
آپ کا فیضان ہے
بے خطر راہ عشق
دل ہے صوفی باصفا
در تلک پہنچا سلیم
سچ ہوئی افواہ عشق

☆☆☆

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)

فراق، شخصیت، فن اور رباعیات کا مختصر جائزہ

فراق گورکھپوری کی رباعیات پر تفصیلی گفتگو سے پہلے ہم مختصر طور پر ان کے سوانح عمری کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں جس سے ان کے فن اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں سہولت ہوگی اور یہ گفتگو عام اور عالم، طالب علم اور اسکالر کے لیے سود مند رہے گی۔

رگھوپتی سہائے فراق 28 اگست 1896 کو شہر گورکھپور میں پیدا ہوئے اور پچاسی سال عمر بسر کرکے 3 مارچ 1982 کو دہلی میں انتقال کیا۔ فراق کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت اردو فارسی کے ادیب تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ فراق کے پانچ بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ فراق کی ابتدائی تعلیم گھر اور بعد میں اسکول میں ہوئی جہاں سے انھوں نے 1913 میں میٹرک پاس کرکے سینٹرل کالج الہ آباد میں ایف۔اے میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے بی۔اے کیا اور آخرکار 1930 میں آگرہ یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ خود فراق نے "میری زندگی کی دھوپ چھاؤں" میں لکھا ہے کہ وہ بچپن سے پڑھنے لکھنے میں تیز تھے اس لیے اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے۔ اگرچہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ انھیں کھیل کود، کشتی، کسرت وغیرہ سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ فطری طور پر جذباتی اور حسن پرست تھے۔ ایف۔اے کی طالب علمی کے دوران ان کی شادی کشوری دیوی سے کی گئی جو ان کی پسند نہ تھی۔ اس موضوع پر اردو کے ادیبوں اور سوانح نگاروں نے بہت کچھ فراق کی تحریروں سے فائدہ اٹھا کر لکھا ہے جسے ہم صرف فراق ہی کے دو چار جملوں پر تمام کرکے آگے بڑھتے ہیں۔ بقول فراق "خود مجھے اور میرے خاندان کو دھوکا دے کر ایک صاحب نے میری شادی ایک ایسے خاندان اور ایک ایسی لڑکی سے کروادی کہ میری زندگی ایک ناقابلِ برداشت عذاب بن گئی۔ میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہ تھا۔ اس کا میرے گھر آنا منحوس ثابت ہوا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو دوسری شادی کرلیتا یا سن مار کر رہ جاتا۔ میں دوسری شادی بھی نہ کرسکا اور تب سے آج تک میری زندگی ایک ناقابلِ برداشت اذیت اور تنہائی کا شکار رہی۔ پورے ایک سال شادی کے بعد مجھے نیند نہیں آئی اور عمر بھر میں اس اذیت کو نہیں بھول سکا۔"

اس گھریلو ناپسند زندگی کے علاوہ ان کے والد کی موت نے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری ان کی گردن پر ڈال دی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے چہیتے جوان بھائی کی ناگہانی موت اور ان کے جوان بیٹے کی خودکشی نے زندگی بھر کا غم مہیا کردیا جس نے ان کی فکر اور اخلاق پر گہرے نقوش چھوڑے، جس کا ذکر انھوں نے نقوش

کے مدیر طفیل احمد کو اپنے خطوط "من آنم" میں لکھا ہے۔

فراق نے اپنے والد کے انتقال کے بعد ڈپٹی کلکٹری کی ملازمت حاصل کی لیکن بہت جلد ترک موالات کی تحریک میں شامل ہو کر استعفیٰ دے دیا اور پنڈت جواہر لال نہرو کی وساطت سے آل انڈیا کانگریس کے سکریٹری کے عہدے پر کئی سال تک کام کرتے رہے لیکن اس دوران ادبی جریدوں میں تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے اور آخر کار لکھنؤ اور کانپور کے کالجوں میں بحیثیت معلم کام کر کے الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے چھبیس سال مشغول رہ کر علاحدہ ہوئے۔ فراق کھانے پینے کے شوقین تھے۔ وہ بزم اور محفل کے آدمی تھے۔ پوشاک میں اُتنے بڑھیا نہ ہوں لیکن ان کا معیار اونچا تھا جو لنگ جھنگ آٹھ سو روپے کا ماہانہ وظیفہ ملتا وہ ضروریات کے لیے کافی نہ تھا، چناں چہ وہ مشاعروں، سیمیناروں اور ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کرتے، انگریزی اُردو اور ہندی کے مضامین لکھتے اور پھر ان کی تصانیف کی رائلٹی کے پیسوں سے وہ اپنا خرچ نکالتے تھے۔ انھیں کبھی اکادمی ایوارڈ، کبھی پدم بھوشن ایوارڈ اور کبھی گیان پیٹھ ایوارڈ کے ہمراہ بھی رقم ملتی اور مسلسل سرکاری مقام بھی انھیں حکومت کے خزانے سے نوازتے رہتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ شاعر کو شاعر ہی اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے The Faculty of a poet is to judge a poet فراق کے فن اور شخصیت پر جو کچھ جوش نے کہا ہے اس سے بہتر گفتگو ممکن نہیں کیوں کہ دونوں ہم عصر عظیم شاعر تھے۔ فراق، جوش سے دو سال بڑے تھے لیکن دونوں شاعروں نے 1982 میں سفر ابدی اختیار کیا۔ جوش اور فراق نہ صرف دوست تھے بلکہ ایک دوسرے کے فن کے قائل بھی تھے۔ دونوں رند خراباتی، مذہب سے دور، انگریزی سامراج کے مخالف اور خاندانی شاعر تھے۔ جوش کے پردادا نواب فقیر محمد اور والد بشیر تخلص کرتے تھے اور صاحب دیوان شاعر تھے تو فراق کے والد عبرت گورکھپوری بھی عمدہ شاعر تسلیم کیے جاتے تھے جن کی مثنوی حسن فطرت موجود ہے۔

جوش نظم کے شاعر تو فراق غزل کے شاعر مانے جاتے تھے لیکن دونوں کی رباعیات قادر الکلامی کی عمدہ مثال۔ فراق انگریزی ادب کے استاد تھے تو جوش فارسی کے ماہر۔ فراق کا مطالعہ مغربی ادب میں گہرا تھا تو جوش فارسی ادب کے غواص تھے جو در شہوار برآمد کرتے تھے۔ جوش بذلہ سنج اور خاندان کے افراد سے منسلک تو فراق باغی اور خاندان سے غیر ذمہ دار، جوش رند مشرب تو فراق مشتعل۔ ان تمام تضادات اور مماثلات کے باوجود دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

جوش نے یادوں کی برات۔ میں فراق کی شخصیت اور فن پر مختصر گفتگو کر کے کوزہ میں سمندر سمو دیا۔ جوش کا ریویو اگرچہ مختصر ہے لیکن کئی طوالتی مقالوں پر بھاری ہے۔ جوش کا ایک ایک لفظ شخصیت اور فن کا آئینہ

معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

مجموعۂ اضداد، آمیزۂ بلور و فولاد، گاہ نسیمِ بوستاں، گاہ صرصرِ بیاباں، گاہ بے خضر رہ گاہ، گاہ بے غم کردہ راہ، گاہ شب غم برگ، گاہ شعلۂ جوالہ و بے باک، گاہ یزداں با آغوش، گاہ اہرمن بردوش، رند قدح خوار، گوہر شاہوار، آسمانِ خوش تخیلی کے بدر، انجمن آگہی کے صدر، اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار، اقلیم ذرّت نگاہی کے تاجدار، خودوت پناہ، خطا نگاہ، مسجودِ جبرئیل، شاعرِ بزرگ و جلیل۔

اپنے فراق کو میں قرنوں سے جانتا اور ان کی خلاقی کا لوہا مانتا ہوں۔ مسائلِ علم و ادب پر جب وہ زبان کھولتے ہیں، تو لفظ و معنیٰ کے لاکھوں موتی رولتے ہیں۔ اور اس افراط سے کہ سامعین کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

وہ بلا کے حسن پرست اور قیامت کے شاہد باز ہیں۔ اور یہ وہ عادت مخصوص ہے، جو دنیا کے تمام عظیم فنکاروں میں پائی جاتی ہے۔ گو نہاد صالحین پر آوازے کستے ہیں، اور وہ اُن بے توفیقوں کے کھوکھلے پن پر دل ہی دل میں ہنستے ہیں۔ لیکن ان کی راتوں سے جو ہوشیار ہیں، پینے سے پیشتر وہ یار غمگسار ہوتے ہیں اور پینے کے بعد دشمن خونخوار بن جایا کرتے ہیں اور نہایت استعجاب آمیز تعلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا اپنی رفیقۂ حیات سے جو برتاؤ ہے، وہ جبینِ انسانیت کا ایک ہولناک گھاؤ ہے۔ اور ان کے تشدد سے تنگ آ کر، ان کا بیٹا خودکشی کر چکا ہے۔

وہ ایک زہری شخصیت کے انسان ہیں، کبھی مسیح دوراں ہیں اور کبھی موسیٰ عمراں، کبھی مہکتے گلزار، کبھی اپنی تلوار۔ دہلی کے دوران قیام میں، ایک بار، وہ مجھ سے بھی، بہت ہی بُری طرح، الجھ پڑے تھے، اس وقت اگر میں اپنی مخصوص [illegible] کا گلا گھونٹ دیتا تو بڑا خون خراب ہو جاتا۔ اس رات کی صبح کو میں نے ان پر ایک نظم کہی تھی جس کا صرف ایک شعر یاد ہے

نہ عطا کر سکا مجھے معبود
بھول کر بھی شب وصال فراق

آخر میں نہایت افسوس کے ساتھ، میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان نے ابھی تک فراق کی عظمت کو پہچانا نہیں ہے، سرکار ہند کو چاہیے کہ وہ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دے، اور ان کو، بہمہ وجوہ، مطمئن کر کے اپنے دامن کو مزید پھولوں سے بھرے، اور ملک مرائی کے داغ سے اپنی پیشانی کو بچالے۔

جو شخص یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فراق کی عظیم شخصیت، ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکا، اردو زبان کی آبرو، اور شاعری کی مانگ کا صندل ہے وہ ابدائی قسم کا مادرزاد ہے۔

اس مضمون میں ہم نے دونوں عظیم المرتبت شعرا کا تقابلی جائزہ نہیں لیا ہے جو ایک جدا گانہ بحث ہے کیوں کہ دونوں کہنہ مشق پختہ شاعر تھے، دونوں کے اسلوب جدا جدا اور منفرد تھے۔ دونوں شاعروں کے پاس جمالیاتی احساس کی پرتیں جدا جدا ہیں، ایک نظم کا عاشق تو دوسرا غزل کا دلدادہ ایک میر تقی میر کا پیرو تو دوسرا سودا کے تخیلات کا شیدا۔ دونوں ایک دوسرے کے معترف۔

29 مئی 1946 کو الہ آباد سے فراق گورکھپوری نے اپنی رباعیات کا مجموعہ روپ شائع کیا اور اس کا انتساب کیا: شاعر اعظم جوش ملیح آبادی کے نام۔

جوش کچھ دونوں کی بات ہے کہ میرٹھ کے مشاعرے سے ہم تم ساتھ ساتھ دلی آئے اور ایک ہی جگہ ٹھیرے رات باقی تھی۔ ہم لوگوں کے اور ساتھی ابھی سو رہے تھے لیکن تھوڑے سے وقفے کے آگے پیچھے ہم تم جاگ اٹھے۔ باتیں ہونے لگیں۔ تم نے مجھ سے پوچھا کہ فراق تم رباعیات نہیں کہتے؟ میں نے کہا کچھ بہت کچھ رباعیات کہی تھیں ادھر تو نہیں کہیں، بات آئی گئی ہو گئی۔

بعد کو دلی کے اس قیام میں مجھ سے تم سے ان بن بھی ہو گئی تھی اور آپس میں تیز تیز باتیں بھی ہو گئی تھیں جس کی تکلیف ہم دونوں کو بہت دنوں تک رہی، شاید اب تک ہے۔ تم پونا چلے گئے اور میں الہ آباد چلا آیا۔ اب اسے وقت کی ستم ظریفی کہو گے یا اقبال نیک بتاؤ گے کہ الہ آباد آ کر جو پہلی چیز مجھ سے ہوئی وہ ایک رباعی ہوئی جس میں میں نے تمہیں کو مخاطب کیا اور دلی میں ہو جانے والی اسی ان بن کی طرف اشارہ کیا۔

رباعی یہ تھی:

معصوم خلوص باطنی کچھ بھی نہیں
وہ قرب وہ قدر باہمی کچھ بھی نہیں
اک رات کی وہ جھڑپ وہ جھک جھک سب کچھ
اور آٹھ برس کی دوستی کچھ بھی نہیں

یہ رباعی روپ کی ان رباعیوں کا شگون تھی۔ اسے کہنے کے دو ہفتوں کے اندر اندر ڈھائی سو رباعیاں ہو گئیں، جو دو مہینوں میں بڑھ کر ساڑھے تین سو کی تعداد تک پہونچ گئیں۔ اسی آٹھ برس کی دوستی کی یاد میں جو ایک اضطراری کمزوری کے زیر اثر تھوڑی دیر کے لیے کچھ بھی نہیں ہو گئی تھی اب یہ ترانے جو آج روپ کے نام سے شائع ہو رہے ہیں، انتہائی خلوص و محبت سے تمہارے نام معنون کرتا ہوں۔ اگر تم اب بھی مجھ سے صاف نہیں ہوئے تو بھی میں ناامید نہیں۔

مے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بہ تو صد حساب باقیست

الٰہ آباد۔ 29 دسمبر 1946ء فراق

اشرف صالوی نے جوش اور فراق کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سچ کہا ہے:

اُدھر ہیں جوش شہنشاہِ نظم شعلہ بیاں
اِدھر فراق ہیں بزمِ غزل کی روحِ رواں
اُدھر جلالِ شراب و شباب کا شاعر
اِدھر جمالِ شبِ ماہتاب کا شاعر
اُدھر ہے لب پہ اگر انقلاب زندہ باد
اِدھر حیاتِ درخشاں کا خواب زندہ باد
اُدھر ہے گیسوئے الفاظ میں اگر شانہ
اِدھر ہے زلف گرہ گیر کا وہ دیوانہ
اُدھر زباں پہ اگر نعرۂ بغاوت ہے
اِدھر غزل کی زباں نغمۂ محبت ہے
اُدھر ہے عرفی و فردوسی کی سخن سازی
اِدھر ہے میر کے قلبِ حزیں کی غمازی
اُدھر جو حافظ و خیام کا ہے کیف و سرور
اِدھر ہے جذبۂ مومن کی ساحری بھرپور
یہ دو منارۂ عظمت ہیں دونوں لاثانی
ادب کے دونوں ہی شہکار ہیں یہ لافانی
کتابِ زیست کے دونوں ہیں عہد ساز ورق
جوابِ جوش ہے مشکل، محال مثلِ فراق

جوش کے علاوہ ان کے مشاہیر ہم عصروں نے بھی ان کی شخصیت بالخصوص ان کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی عظمت کا اقرار کیا ہے۔ فراق کے ہم وطن اور دوست مجنوں گورکھپوری نے فراق کو ان کا پیاری یعنی آٹھ دماغوں کا مجموعہ کہا ہے یعنی فراق بیک وقت آٹھ دماغ ایک جگہ جمع تھے۔ فراق شاعر، ادیب، نقاد، استاد،

خطیب، انگریزی شاعر اور مجاہد آزادی تھے۔

یگانہ چنگیزی کہتے ہیں: دنیا سے جاتے ہوئے غزل کو فراق کے ذمے چھوڑے جارہا ہوں۔

جگر مرادآبادی کہتے ہیں: جب لوگ ہم لوگوں کو بھول جائیں گے اس وقت بھی فراق کی یاد تازہ رہے گی۔

اصغر گونڈوی کہتے ہیں: اردو شاعری میں آنے والی شخصیت فراق کی شخصیت ہے۔

نیاز فتح پوری کہتے ہیں: اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ آج کے شعرا میں سب سے درخشاں مستقبل کس کا ہے تو تنہا فراق کا نام لوں گا۔

احتشام حسین کہتے ہیں: اگر احساسات کی لطافت، جذبات کی شدت اور حسن اظہار کی ندرت غزل میں ایک جگہ دیکھنا ہو تو فراق کی غزلیں دیکھنا۔

کلیم الدین کہتے ہیں: میں فراق کو اردو غزل کا ایک اہم ستون قرار دیتا ہوں۔

گیان چند کہتے ہیں: فراق کی عروضی حس جتنی کمزور تھی مشاہیر شعرا میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ہندی بحر، بحر متقارب اور متدارک اور رباعی میں وہ خاص طور سے ٹھوکریں کھاتے رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فراق جینیس یعنی نابغہ روزگار تھے۔ بعض اردو کے اکابرین نے انھیں ڈاکٹر جانسن کا خطاب ان کی شعری تنقید اور ذہانت کو دیکھ کر دیا ہے۔ یہ بھی درست ہے جس طرح مغربی دانش والوں نے جینیس کو غیر عادی یا abnormal کہا ہے۔ Robert Stevenson کہتا ہے جینیس وہ ہے جس میں رجحان کھلا پایا جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس جانسن کو کوئی Buswell یا گوئیٹے کو کوئی ایکرمن Ackerman نہیں ملا۔ جو ان کی ملفوظات اور بصیرت افروز باتوں کو جمع کرتا۔ فراق جس موضوع پر بھی بات کرتے وہ علم و ادب فلسفہ و حکمت کا خزینہ ہوتا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ بات کرنے سے نہیں تھکتے تھے اور ان کے سامنے سب گونگے ہو جاتے تھے۔

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق تھا گھر کا ماحول شاعرانہ تھا اور گورکھپور شاعری کا زرخیز منطقہ بھی تھا چنانچہ بارہ تیرا سال کی عمر میں شاعری کی اور 1916 میں اور بھی نظم کہی۔ فراق نے ریاض خیرآبادی، وسیم خیرآبادی، ناصری جیسے اساتذہ سے زبان و بیان کے نکات اور شاعری کے علوم سے آشنائی حاصل کی۔ فراق کو اردو، انگریزی اور ہندی پر عبور حاصل تھا وہ فارسی سے بخوبی واقف تھے۔ عربی اور سنسکرت کے الفاظ سے آشنائی تھی۔ فراق کا شمار اگرچہ اردو ادب کے بلند پایہ صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے لیکن وہ ان خوش نصیب شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھیں اپنی زندگی ہی میں مقبولیت عام بھی حاصل ہو چکی تھی۔ فراق کے قول کے مطابق انھوں

نے ایک ہزار سے زیادہ غزلیں کہیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظم، قطعہ اور سات سو سے زیادہ رباعیات بھی کہی ہیں۔ فراق نے مشرقی اور مغربی شعرا کا وسیع طور پر مطالعہ کیا اس لیے ان کا کلام مشرق اور مغرب کی ادبی سماجی تہذیبی ثقافتی قدروں کی جلوہ گری کرتا ہے۔ اگر ان کے پاس سنسکرت اور بھاشا کے قدیم شاعروں کی رومانی حسیت ہے تو میر، سودا، مصحفی، جرأت، مومن اور حسرت کی شعریت کی جلوہ نگاری اور مغربی شعرا میں مخصوص ورڈس ورتھ، کیٹس، شیلے، براؤننگ اور اسپنسر کی منظر کشی کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔

تصانیف:

1۔ گل نغمہ (کلیات فراق کا پہلا حصہ)
2۔ مشعل (غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا انتخاب)
3۔ روح کائنات (مجموعہ نظم و رباعیات)
4۔ پچھلی رات
5۔ شعرستان
6۔ شبنمستان (غزلوں کا مجموعہ)
7۔ غزلستان
8۔ اسپتال کی شام (ایک طویل نظم)
9۔ اوراق گل (مجموعہ کلام)
10۔ شعلہ ساز (مجموعہ انتخاب غزلیات)
11۔ رمز و کنایات (غزلوں کا مجموعہ)
12۔ رنگ و نور (عشقیہ اشعار کا مجموعہ)
13۔ روپ (جمالیاتی رباعیات کا مجموعہ)
14۔ گل رعنا
15۔ سرگم
16۔ بزم زندگی رنگ شاعری
17۔ اندازے (مضامین فراق)
18۔ حاشیے (مضامین فراق)
19۔ اردو کی عشقیہ شاعری (مقالہ)

20۔ من آنم (مکتوب نگاری)

21۔ Gold Treasury of Essays

22۔ A Garden of Essays

23۔ Reading and Reflection

ان تصانیف کے علاوہ فراق کے ریڈیو فیچرس، انٹرویوز، اخبارات، رسالوں، مجلّوں اور جریدوں کے مضامین جو اردو شعروادب کا عظیم ذخیرہ تصور کیا جاتا ہے ابھی بکھرا پڑا ہے۔ اگرچہ طلبا نے ادب سے دلچسپ مقالے لکھے، دو تین تحقیقی کام اور مکتوب نگاری وغیرہ کے سوا کوئی خاص کام فراق پر نہیں ہوا۔ آج کے دور میں فراق کی یاد بس اس شعر سے تازہ ہوتی ہے

آنے والی نسلیں تم پہ رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا ہے

مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں انھوں نے دو درجن کے قریب فراق کے انگریزی میں اسٹنزا (Stanza) دیکھے تھے جن کی تعریف الٰہ آباد یونیورسٹی کے انگریزی پروفیسر امرناتھ جھا نے بھی کی تھی۔ افسوس ہے یہ انگریزی شاعری کے نمونے ہمارے درمیان نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فراق کا سارا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام صحیح متن کے ساتھ مدون کیا جائے اور راقم اس سنگ گراں کو اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

فراق کی شاعری

فراق اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

شاعری کا چرچا گھر میں تھا اور میری طبیعت میں موزونیت تھی۔ اس لیے شعر کہنے کا شوق تو بچپن سے تھا لیکن 19 برس کی عمر تک مجھ سے شعر نہیں ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ اگرچہ اردو غزل کے کئی سو اشعار مجھے بچپن ہی سے یاد تھے لیکن عام طور پر اردو شاعری میں مجھے ایسے لوگوں کا مزاج ملتا تھا جن کا دل کڑا تھا اور جن کے لہجے میں تکلف کم تھا اور جہاں تھا وہاں ملاوٹ سے خالی۔ اس شاعری میں دنیائی پاکیزگی کا احساس بھی کم تھا۔ یہاں شکوہ اور شکایت کے دفتر باز تھے، زیادہ تر ناکام تعیش اور لذتیت کے عناصر اس شاعری پر غالب تھے۔ مادے کی روحانیت اور طہارت کا احساس مفقود تھا۔ اس شاعری میں غم کے احساس ذاتی ناکامی کا اظہار تھا اور زیادہ تر اشعار ذاتی یا نفسیاتی خواہشوں کے پورا ہونے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس شاعری میں خیر و برکت کے عناصر مفقود تھے۔ اس میں امرت کی برکھا نہیں ہوتی تھی، جیسے شعر میں کہنا چاہتا تھا، اس کے نمونے ہی مجھے نہیں ملتے تھے۔ وہ دھونی یعنی گونج، وہ آواز نہیں ملتی تھی۔ جو بیک وقت زمین اور آسمان کی آواز ہے، جو یہ بتائے کہ دنیا اور دنیا

کی زندگی سے پاکیزہ دیوتائی مذاہب دیکھنے میں ایسی شاعری پا جاتا تھا جو روحانیت سے لبریز کفر (Paganism) کے لیے بنا سکوں۔

تو ہی اے دل اب زمانے کو پیام کفر دے
تو نے دیکھا بھی ہے ان آنکھوں کا سحر سامری

قید فرنگ میں تو کچھ غزلیں کہنے کا موقع ملا ان خوبیوں سے میں نے اردو شاعری کو عام طور پر محروم پایا تھا۔ ان کے علاوہ جو خوبیاں اردو شاعری میں موجود تھیں، لیکن جن سے فائدہ اٹھانے کے لیے خلوص اور نازک احساسات کی ضرورت تھی۔ انھیں بھی مشق اور غور و فکر، سماعی تخیل (Anditory Imagination) کی مدد سے حاصل کرتا رہا۔ لیکن میں شاعری ایسی کرنا چاہتا تھا کہ اپنے اشعار میں ایسی روح، ایسی فضا اور فضا میں ایسی تھرتھراہٹ کہ وہ تمام خوبیاں جلوہ گر اور ایما گر ہو جائیں جو اس قوم کی تہذیب میں ملتی ہیں۔ جس قوم نے رامائن اور مہابھارت، سیتا، شکنتلا، کرشن، بدھ اور ہندوستان کے قدیم آرٹ کلچر کو پیدا کیا اور جس کلچر پر اسلامی اور جدید مغربی تہذیبوں کے اثرات سے اور بھی جلا ہوتی گئی۔ اگر ان صفات کی کچھ جھلک میرے دس فیصدی اشعار میں بھی ملتی ہے تو میں اپنی کاوشوں اور کوششوں میں شاید ناکام نہیں رہا۔ بہرحال پچیس سال زیادہ تر میں غزلیں کہتا رہا ہوں۔ نظمیں بھی میں نے کہی ہیں، لیکن میری غزلیں لوگوں کو زیادہ متوجہ کر سکی ہیں۔ میں اس صنف سخن کی عظمت اور اس کے بلند امکانات کا قائل ہوں جسے نظم کہتے ہیں لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ غزل میں حقیقی احساسات مشاہدے اور زندگی کے تجربے ظاہر نہیں کیے گئے یا نہیں کیے جا سکتے۔ ہاں اس اظہار حقیقت میں بہت داخلیت اور جامعیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ابتدائی دور میں فراق گورکھپوری کی شاعری پر اساتذہ کا اثر رہا جو آہستہ آہستہ کم ہو گیا۔

مصحفی کا رنگ دیکھیے

لے کے جب ناز سے انگڑائی وہ بستر سے اٹھا
فتنۂ صبح قیامت بھی برابر سے اٹھا

فراق کی شاعری میں لکھنوی کلاسیک شاعری کا رنگ دیکھیں۔ فراق کا عہد جوانی کی زندگی کی تلخیوں سے بھرا ہوا رہا تھا ان کے وطن پرستی کے جذبے کو بھی ابھار رہا تھا جیسا کہ فراق کہتا ہے:

ہماری وطن پرستی کا جذبہ ہماری اپنی تلخیوں اور ناکامیوں کی پیداوار نہیں بلکہ آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔

فراق دوڑ گئی روح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا مرے فسانے میں

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہو یا تجھے بھلانے میں
ہمیں ہیں گل ہمیں بلبل ہمیں ہوائے چمن
فراق خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

فراق نے اپنی ابتدائی شاعری میں فانی کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا تتبع نہیں کیا۔ فانی کا غم ذاتی غم تھا لیکن فراق غم کائنات کے ترجمان تھے

کبھی ساز طرب سن کے بھی آنکھیں جھپک جاتی ہیں
نوائے شاعر فطرت الم کی داستاں کیوں ہو

یا بھی کہتے ہیں

وہ ترا غم ہو یا غم آفاق
شمع سی دل میں جھلملاتی تھی

فراق اس دور میں لکھنؤ کے شعرا کے رنگ میں بھی شعر کہہ رہے تھے۔ فراق کے شعر میں عزیز کے شعر کی بازگشت دیکھیے

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں
ادھر آؤ تم کو گلے سے لگا لیں

(عزیز)

کبھی ہم بھی تو حوصلے نکالیں
آؤ تمھیں سینے سے لگا لیں

(فراق)

فراق نے سب سے پہلی غزل 1916ء میں کہی جبکہ بی اے میں تعلیم پا رہے تھے۔ خود فراق کہتے ہیں: میں زیادہ تر امیر مینائی کا متبع ہوں اور چونکہ عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی، ناصری، مولانا حسرت، اصغر، یگانہ اور خاص اقبال کے کلام کو اصلاح خیال کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس لیے ان تاثرات سے بھی کلام رنگین ہے۔

فراق کی شاعری میں ان کا اپنا رنگ ابھرا ہوتا گیا ان کے کلام میں تبدیلی اور نکھار بڑھتا گیا۔ انھوں نے بحروں کے انتخاب اور الفاظ کے چناؤ میں نئے تجربے کیے اور غزل کے قدیم بدن میں تخیل کا جدید خون داخل کیا

بس اک تسلسل تغیر حال قائم ہے
نصیب عشق فنا و دوام بھی تو نہیں

یہ سچ ہے کہ فراق کے پاس یہ تغیر 1937 کے بعد نظر آتا ہے اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اب تک میں بہت کچھ بن بگڑ چکا ہوں اور شاید بدل بھی چکا ہوں۔ شاعر ہونے کی مجھے بہت مہنگی قیمت بھی دینی پڑتی ہے خون جگر کھانے کے معنوں میں نہیں بلکہ ان معنوں میں کہ وجدانی شخصیت منقسم اور محدود سی ہو جاتی ہے۔ شاعری میں میرا رنگ طبیعت جیسے جیسے نکھرتا گیا اس میں ایک انفرادیت آتی گئی۔

یہ سچ ہے کہ رگھوپتی سہائے فراق اردو ادب کی اہم شخصیت اور اردو شاعری کے ممتاز شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ بیسویں صدی کے صف اول کے غزل کے شاعروں میں نظر آتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو غزل کی بہار کے آخری پھول ہیں۔ اسی لیے یگانہ چنگیزی نے کہا تھا کہ ہم غزل کو فراق کے سپرد کر رہے ہیں اور جگر نے پیشین گوئی کی تھی کہ مستقبل میں جب لوگ ہمیں بھول جائیں گے اس وقت بھی فراق کو یاد رکھیں گے۔

اسی لیے آج اکیسویں صدی میں بھی فراق ایوان غزل کے اہم ستون تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے جب ایک شخصیت شعر و ادب میں فکر و نظر میں کئی جہتیں رکھتی ہو تو زمانہ اسے عموماً اسی معروف و مشہور ہنر سے جانتا اور مانتا ہے جو اس کی شناخت بن چکا ہے۔ چناں چہ فراق بحیثیت ایک ادیب، نقاد، استاد، خطیب، مجاہد آزادی، انگریزی شاعر کم پہچانے جاتے ہیں اور دنیا انھیں ایک عظیم اردو شاعر، وہ بھی غزل کے شاعر کے نام سے جانتی ہے جب کہ انھوں نے عمدہ نظمیں اور منفرد موضوعات پر صد ہا رباعیات بھی کہی ہیں جس کا خود فراق نے گلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اردو کے بے شمار ادبی نقادوں نے ان کی دوسری اصناف کے ساتھ خاطر خواہ انصاف نہیں کیا۔ ہماری اس تحریر کا مقصد فراق کی شعری اصناف میں غزلوں اور نظموں کو بالائے طاق رکھ کر صرف ان کی رباعیات کو محراب تنقید شعر میں دیکھنا، دکھانا، سمجھنا، سمجھانا اور رچانا ہے۔

فراق نے 1968 کے گلبانگ کے پیش لفظ میں رباعیات کی تعداد ایک ہزار سے کچھ زیادہ بتائی ہے لیکن ہماری تحقیق کے مطابق رباعیات کی تعداد سات سو سے کچھ کم ہے۔ امکان ہے کچھ اور رباعیات جو غیر مطبوعہ ہیں دریافت ہوں لیکن فراق کے انتقال کے تقریباً چالیس سال بعد ان گمشدہ رباعیات کا ملنا آسان نہیں۔ مزید فراق نے اپنی غزلوں کی تعداد بھی ایک ہزار کے لگ بھگ بتائی ہے۔ جب کہ اتنی تعداد میں غزلیں موجود نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فراق کا کچھ کلام مفقود اور ضائع ہو گیا جیسا کہ وہ درجن انگریزی کے عمدہ سانیٹ جن کا مطالعہ مجنوں گورکھپوری اور الہ آباد یونیورسٹی کے انگریزی کے استاد ساجہانے کیا تھا اب ان کا کوئی پتہ نہیں۔

فراق کی رباعیات جو ان کے مختلف مجموعہ کلام میں شائع ہوئیں ان کو بقول جمیل جالبی ہم دو زمانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور 1929 سے شروع ہوتا ہے ان رباعیات پر آسی غازی پوری کا اثر نمایاں ہے لیکن اسی کے ساتھ انیس و حالی کا ملا جلا اثر بھی موجود ہے۔ پہلے دور میں اڑسٹھ رباعیات ہیں۔ دوسرا دور جو 1945 سے شروع ہوا اس میں فراق نے روپ کے عنوان سے تین سو اکیاون رباعیات شائع کیں۔

رباعیات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

روح کائنات	68	رباعیات
روپ	351	رباعیات
گلِ نغمہ	158	رباعیات
روپ انتساب (متفرق)	01	رباعی
انقلاب چین	52	رباعیات
کل رباعیات مطبوعہ	631	رباعیات

اُردو شاعری کا دامن گلہائے رباعی سے بھرا ہے۔ اس گلشن رباعی پر فارسی بہار کا اثر ہے۔ اُردو کے ہر بڑے اور ممتاز شاعر نے رباعیات کہی ہیں۔ ولی، میر، سودا، انیس، دبیر، غالب، اکبر، رشید وغیرہ کے علاوہ بیسویں صدی میں جن شاعروں نے رباعی گوئی میں نام کمایا ان میں رواں، اکبر، امجد، جوش اور فراق سرفہرست ہیں۔

علامہ اقبال کے کلام میں جو چار مصرعوں کی ترکیب نظر آتی ہے ان میں صرف تین رباعیات کو چھوڑ کر اور رباعی نہیں کہوں کہ وہ رباعی کی ہیئت میں نہیں انھیں قطعہ، چار مصرعے، دوبیتی، ترانہ وغیرہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ رباعی کے اوزان میں نہ ہونے کی وجہ سے رباعی کی صنف میں شمار نہیں ہو سکتیں۔ اگر چہ اس سے علامہ اقبال کے کلام و پیام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

فراق کی پہلی رباعی ان کے والد کے انتقال پر ہے جس کی نشاندہی انھوں نے اپنی خودنوشت "میری زندگی کی دھوپ چھاؤں" میں کی ہے۔ یہ رباعی فراق کے مجموعہ کلام روح کائنات میں ہے۔ اگر چہ یہ 1918 میں لکھی گئی ہے

ظلمت کا حجاب کوہ و دریا سے اٹھا
پردہ فطرت کے روئے زیبا سے اٹھا
پو پھٹنے کا سماں سہانا ہے بہت
پچھلے کو فراق کون دنیا سے اٹھا

فراق کی رباعیوں کی شہرت روپ کی رباعیات سے ہے جنھیں انھوں نے 1946 میں الہ آباد سے شائع کیا اور اس کا انتساب شاعر اعظم جوش ملیح آبادی کے نام کیا تھا۔

یہ بھی ہمارے ادب کا المیہ ہے کہ تخلیق کار کو صرف ایک ہی زاویہ سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ چنانچہ اُردو دنیا ان کو صرف عمدہ عظیم غزل گو جانتی اور مانتی ہے جب کہ انھوں نے عمدہ نظمیں اور جدید طرز پر رباعیات بھی لکھی ہیں۔ یہی نہیں وہ ایک ساتھ فکر نقاد، ایک باعلم ادیب ایک عمدہ استاد، خطیب، انگریزی شاعر اور مجاہد آزادی بھی تھے اسی لیے ان کے ہم وطن اور دوست مجنوں گورکھپوری نے انھیں 'آلو بخارا' کہا تھا یعنی ایک سر میں آٹھ دماغ۔ اُردو ادب کے مایہ ناز شاعر اور ادیب وحید اختر نے اپنے مضمون 'شعر فراق ماسوائے غزل' میں بہت صحیح لکھا ہے جب بھی ہم کسی شاعر پر حکم لگانے بیٹھتے ہیں تو اسے کسی ایک خانے میں قید کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ غلط تصور ہمارے یہاں مروج ہے کہ کوئی بھی لکھنے والا یا تو نثر نگار ہوگا یا شاعر۔ دو خانے کیوں؟ اسے لوگ قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے کہ ایک ہی شخص بیک وقت اعلیٰ درجے کا نثر نگار بھی ہو سکتا ہے اور شاعر بھی۔ اگر کوئی شخص بدقسمتی سے نثر بھی لکھتا ہے اور شاعری بھی کرتا ہے تو اسے یہ جملہ سننا پڑے گا کہ تم تو نثر کے آدمی ہو شعر خواہ مخواہ کہتے ہو اور نثر والے اس سے کہیں گے کہ تم تو شاعر ہو شاعری پر اپنی توجہ مرکوز رکھو۔ یہ تقسیم ہماری زبانی تنقیدوں ہی میں نہیں بلکہ تحریری تنقیدوں میں بھی نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے لیے میں نے بہت سے شاعروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ تو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور بہت سے افسانہ نویسوں کو یہ کہتے پایا ہے کہ وہ اصل میں شاعر ہیں۔ مغربی ادب میں تو ایک ہی شخص بیک وقت نقاد بھی ہوتا ہے، ناول بھی لکھتا ہے، ڈرامے بھی قلم بند کرتا ہے اور شاعری بھی کرتا ہے اور شاعری بھی کسی ایک ہیئت (form) کی پابند نہیں ہوتی۔ میر کے لیے لاکھ کہیے کہ وہ تو غزل کے شاعر تھے لیکن ان کی مثنویاں، قصیدے، مرثیے اور دوسری چیزیں اس خیال کی تردید کے لیے گواہ عادل ہیں۔ سودا کے لیے ان کی زندگی میں کسی نے کہہ دیا اور آگے چل کر کسی نے لکھ دیا کہ وہ تو قصیدے کے بادشاہ تھے اور ہمارے روایت پرست نقاد یہ جملے لے اڑے حالانکہ سودا کی ہر غزل زبان حال سے کہہ رہی ہے

جو یہ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہی ہے خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاتا ہوں

انیس نے مرثیے کے علاوہ جو بھی لکھا وہ نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ان کی رباعیوں کی کمیت اور کیفیت کو سب جانتے ہیں اس کے علاوہ ان کے سلام بتا رہے ہیں کہ اگر وہ غزل لکھتے تو کس درجہ کی لکھتے۔ اقبال کی بڑائی ان کی نظمیہ شاعری ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ انھوں نے غزل کو نئی زندگی اور توانائی عطا کی...... بڑے شاعروں کی شخصیت اتنی تہہ دار ہوتی ہے کہ اسے کسی صنف میں بند کیا ہی نہیں جا سکتا وہ ہر

صنف میں اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور براہ راست راہ نکال لی ہے۔ اس لیے فراق کے مطالعے کو محض ان کی غزلوں تک محدود رکھنا ان کی شخصیت اور شاعری کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

فراق کی رباعیات پر مزید تفصیل سے گفتگو کی جائے تو پہلے ان نکات پر توجہ دینا ضروری ہے۔

الف۔ فراق نے اپنی رباعیات کی تعداد گھنا گنگ کے جشن الاٹ میں ایک ہزار سے زیادہ بتائی ہے جب کہ مطبوعہ رباعیات 630 سے کم ہیں۔ اگر فراق کی بیاضوں اور قدیم رسالوں، مشاعروں کی رپورٹوں سے استفادہ کیا جائے تو شاید موجودہ تعداد میں اضافہ ہو سکے۔

ب۔ فراق کی رباعیوں کی شہرت روپ کی رباعیات سے ہے جن کی تعداد 351 ہے۔ ان رباعیات کا موضوع زیادہ تر سنگھار رس سے مربوط ہے۔ جب کہ ان کی تقریباً چالیس فیصد سے زیادہ رباعیات حب الوطنی، قومی یک جہتی، ہندوستانی کلچر اور تہذیب، آفاقیت، بھگتی اور فلسفہ پر مبنی ہیں۔

ج۔ سنگھار رس کی رباعیات کا طرز بیان، لہجہ، موضوع، اس کی زبان، تلمیحات، استعارات، تشبیہات ان کی دوسری رباعیات سے خاصے فرق رکھتی ہیں۔ ان میں سنسکرت کے ہندی کے نامانوس اور ثقیل لفظوں کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اسی روپ کی رباعیات پر اعتراضات کیے گئے اور ان میں عریانی کو تاہیوں کی نشاندہی بھی کی گئی۔ اگرچہ فراق نے روپ کے مقدمے مطبوعہ 1946 میں اس بات کا انکشاف کیا تھا۔ ان رباعیات میں کہیں کہیں ایطا کا بھی میں مرتکب ہوگیا ہوں۔ ایطا کو میں صرف کبھی کبھی اور کہیں کہیں جائز سمجھتا ہوں ممکن ہے کچھ اور فروگذاشتیں بھی ان رباعیات میں نظر آئیں۔

د۔ اردو رباعی پر بھی فارسی رباعیات کے مضامین تصوف، اخلاق واخلاص نگاری، پند و نصیحت، فلسفہ حیات و ممات کی چھاپ گہری ہے جب کہ فراق کی رباعیات میں یہ مضامین یا کم ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ھ۔ فراق کی رباعیات میں جتنی ہندوستانیت، ہندوستانی کلچر، ہندوستانی مناظر، ہندوستانی تاریخ و جغرافیہ اور تمدن کی نقش نگاری موجود ہے وہ کسی اور اردو شاعر کے پاس نہیں۔

شاعر خوش گوار رات کی تنہائی میں حیات اور ذات کے رموز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فراق نے اپنی شاعری میں رات کے تذکرے سے روشنی بکھیری ہے۔ یہاں رات بھیگ چکی ہے دنیا سو رہی ہے، تارے جھلملا رہے ہیں اور شاعر خیالات کی دنیا میں ڈوب کر جا رہا ہے۔ وہ قاری کی آنکھیں اپنے گہرے معنوں کے ساتھ معنی کائنات اور راز صفات ذات کی شکل میں دریچے کھول رہی ہیں۔ اس کی ردیف مجھ میں آ جا بھی خوب ہے

اے معنی کائنات مجھ میں آ جا

اے راز صفات ذات مجھ میں آ جا

سونا سنسار جھلملاتے تارے
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آیا

تقریباً اسی موضوع پر ایک اور رباعی میں ہندی کے رسیلے اور عام فہم الفاظ کے ساتھ فارسی کے الفاظ کی تراکیب عمدہ نگارش خیال کی جھلک پیش کرتی ہے

ہنگامہ روزگار دم لیتے ہیں
سنسار کا ہم بھید بھرم لیتے ہیں
یہ لمحے وہ ہیں جب دل شاعر میں فراق
کچھ رمز و کنایات جنم لیتے ہیں

یہ سچ ہے کہ برصغیر دنیا کی وہ بستی ہے جس میں حیات و ممات کے فلسفے کے عظیم لوگ گزرے ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں فلک قمر پر غار کے سامنے ایک ہندی سادھو وشوامتر (جہان دوست) کو رکھا اور اس کے نو نکات رموز کو عارف ہندی کے نام سے تعبیر کیا۔ فراق اپنے شعری مجموعے گلبانگ کی رباعیات میں ایک غیر مردف رباعی میں ہندی تلمیح رشیوں کے ساتھ فارسی کی تراکیب اور گراں بار الفاظ روح، روان، تہذیب اور راز دوام سے ہندوستان کی اہمیت کو جو قدیم ترین قوم ہے سلام کرتے ہیں

اے سب سے پرانی قوم دنیا کی، سلام
رشیوں نے بتائے تجھے وہ راز دوام
کہتے ہیں جنھیں روح و روانِ تہذیب
مضمر جن میں ہیں زندگی کے پیغام

فراق نے بھگتی کو فلسفے سے جوڑا ہے۔ فراق نے مادرِ ہند کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہاں کے پجاریوں کے رموز جو وجود و موجود، وحدت اور کثرت وجدان اور شعور، دنیا و عقبیٰ اور مصنوع و مرام پر ہیں ان کی رباعیوں میں ظاہر کیا ہے

افلاک حضوری میں تری سر بہ سجود
جس کو سمجھے بغیر جینا بے سود
تم ہی نے بتایا ہمیں معلوم نہ تھا
وہ نازک رشتہ وجود و موجود

اے کاش کہ راز ہائے فطرت سمجھیں
اے کاش کہ رمز ہائے کثرت سمجھیں
اے کاش کہ ہر مذہب و ملت والے
گونا گوں زندگی کی وحدت سمجھیں

فراق مصرعوں میں تکرار اور ردیف رکھ کر اس کی غنائیت کو ابھار دیتے ہیں۔ وہ ہر گوشہ شعری حسن اور سہولت سے استفادہ کرتے ہیں جو ان کی قادر الکلامی ہے۔

ذیل کی رباعی معنی خیز تو ہے ہی لیکن مصرعوں میں دو قافیوں نے مصرعوں کے تاروں میں نغمے بھر دیے ہیں۔ یہاں بھی شاعرانہ رموز کے دفاتر کی غمازی کر رہا ہے جو بکھرے پڑے ہیں۔ شبنم کی کھنک، نغموں کی لچک، کیفیت حال کی بھرپور شاعری ہے

شبنم کی کھنک لیے ادائیں تیری
نغموں کی لچک لیے ہوائیں تیری
کھولے وجدانیات کے راز اس طرح
ہیں حال میں آج تک فضائیں تیری

اک راز ہے کہہ رہا ہوں تجھ کو آگاہ
ممنوع و حرام کچھ نہیں ہے واللہ
جس کام میں محویت کامل نہ رہے
اے دوست سمجھ لے کہ ہے وہ کام گناہ

فراق وطن دوست وطن پرست ہیں وہ مادر ہند سے خطاب میں بتاتے ہیں کہ یہاں ہر فرقہ، ہر ملت، ہر مذہب کے افراد نے زندگی بسر کی ہے یہ سب اس سرزمین کی اولاد ہیں گے

ہر فرقہ و ہر ملت و ہر مذہب و دیں
سب نے جائے پناہ پائی ہے یہیں
اولاد میں ماتا جھلکتی ہے تری
دنیا کی مادر وطن ہے یہ زمیں

گہرا ہر قوم سے ترا ناتا ہے
ہم پہ ہی نہیں ماں تجھے پیار آتا ہے
اردو کا بھی حق ہے ماننا پہ تیری
سنتے ہیں ترا نام جگت ماتا ہے

فراق اسی سرزمین کے سپوت شہید سرمد کو بطور حق گفتار، شجاع قومی یک جہتی کا حامل قلندر سمجھ کر اس کی شہنشاہ وقت سے رنجش اور شہادت کو اپنی رباعیات میں کئی کیفیتوں جیسے رقص سرمدی، چراغ سرمدی، ساز سرمدی اور نوائے سرمدی کے ذیل میں نظم کرتے ہیں۔ شاعر نے یہاں سرمدی بطور صنعت ایہام استعمال کیا ہے جس کے قریبی معنی دائمی، جاودانی اور ابدی کے ہیں اور اس کے بعید معنی روایت اور واقعات سرمد سے وابستہ ہیں۔ ذیل کی رباعیات سنیے اور سر دھنیے۔ شاعر مادر ہند سے کہہ رہا ہے

وہ اندر دھنش وہ سات رنگوں کی پھوار
بہروپ دکھاتے موسموں کی رفتار
آجاتی ہے جھنکار تری پایل کی
اک رقص سرمدی ہے یا رت سنگھار

اس رباعی میں ہندی سنسکرت کے الفاظ کے ساتھ قدیم حکایات اور تلازمات مصرعوں میں اتار ہوئے ہیں

آکاش کے منڈل میں ترا درشن ہے
سینے میں چراغ سرمدی روشن ہے
رخساروں میں جھلی صبح کی نرم دمک
مکھڑے پہ ترے عجب سہانا پن ہے

فراق کے مصرعوں میں اردو، فارسی اور ہندی کے رسیلے الفاظ کا خوبصورت ملاپ ہے۔ چراغ کی نسبت سے ہر مصرعے میں روشنی اور دمک کا پھیلاؤ ہے۔ یہ عمدہ شاعری کا معمولی سا کرشمہ ہے

پیشانی ہے آئینہ اسرار دوام
ہاتھوں میں حیات کے چھلکتے ہوئے جام
لب ہیں کہ نوائے سرمدی کے کوندے
تیرا سنگیت زندگی کا پیغام

کوندے میں روشنی اور گرج دونوں شامل رہتی ہے۔ رباعی میں آئینے کے ساتھ لب، نوا اور نگہت کو بھی جوڑ دیا ہے تاکہ نوائے سرمدی رباعی کی فضا پہ کوک جائے۔

ذیل کی رباعی میں ساز سرمدی کے ساتھ طاؤس و رباب بول اور مضراب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ خواب اور آنکھوں کے رشتے کو دکھا کر اچھوتا مضمون یہاں نظر کی مضراب خاص کیفیت کا حامل ہے

شمشیر و کتاب اور طاؤس و رباب
تیری آنکھوں کے اتنے سنتے نہیں خواب
بول اٹھتے ہیں ساز سرمدی کے پردے
پڑتی ہے تری نظر کی جس دم مضراب

فراق ارضیت ہند کو وہ اونچا اور عالی مقام دے رہے ہیں جو ہماری دانست میں جنت کا ہے چنانچہ حور و غلماں کے حسن ہندی، یہاں کی ندیوں کے بہاؤ کو نہر کوثر، یہاں کے گلشن کو گلزار اور مٹی کو ارض جنت سے تقابل کرتے ہیں

حور و غلماں حسن ہندی کی صفت
گلزار جناں میں ترے رنگ و نکہت
ندیوں کا تری تموج نہر کوثر
مٹی میں ہے تری شان ارض جنت

فراق کی ان رباعیات میں بھارت کی تاریخ یہاں کی مذہبی روایات اور رواداری کے علاوہ ہندو دھرم اور مسلمانوں کی اہم شخصیات اور روایات شامل ہیں۔ نمونے کے طور پر تین چار رباعیات کے ماخوذات یہ ہیں

کنیائیں ازل کی ہے صباحت جن میں
رادھا کی اداؤں کی نزاکت جن میں
تو آج بھی جنتی ہے ایسے بچے
ہے کرشن کی شوخی شرارت جن میں

ساوتری و سیتا کی قسم کھائے ہوئے
ہے اب بھی زن ہند میں اک دیویت

شعلے سے جھنڈوں سے لپک جاتے ہیں
رخِ ہشیم و ارجن کے جھلک جاتے ہیں

اے فرزند بھرت کا کردار
وہ تخت و تاج چھوڑنے کا اختیار
رہتے ہوئے رام غریب الوطنی
ٹھوکر سے قدم کی وہ اٹھایا ادھار

وہ جین اور بدھ مت کی وارِ فطری
انکار کو کر دیا ہے رشکِ اقرار

فطرت نے دیا ہے تجھ کو درسِ یقیں
کیسے تھے جلوہ وہ ہر مذہب و دیں
حمد لائی ہوئی گنگاؤں میں ہے شانِ جبریل
کیا کریں مہر و مہ کی آیات نہیں

فراق کی جو رباعیات مادرِ ہند سے خطاب میں ہیں وہ سرزمین ہندوستان کی عظمت کے ساتھ اس کے باشندوں کو دو حتی قومی یک جہتی اور انسانی قدروں سے روشناس کرتی ہیں جو شاعری کی خوب صورتی ہے جہاں شاعر پیام بر بن جاتا ہے۔ اگر ہم فراق کی رباعیات اور رباعیوں کے مصرعوں کو جوڑ دیں تو وہ یک جہتی اخوت بھائی چارگی اور اتحاد کا منشور بن جاتی ہے

تہذیب کی پہلی صبح کی پاک دعائیں
دیتی ہیں سنائی تم میں ویدوں کی رچائیں

دنیا کے کتب خانوں سے جو پنہاں تھے
وہ راز کھلے ہیں جنگلوں میں تیرے

انسان کو انسان بنایا تو نے
وجدان کو وجدان بنایا تو نے
ہر فن کو آئینہ حقیقت کا کیا
ہر علم کو عرفان بنایا تو نے

قوموں کے تضاد کو مٹانا ہے تجھے
قوموں کی بنیاد کو مٹانا ہے تجھے
ناقابل تقسیم ہے دنیا کی فلاح
تقسیم مفاد کو مٹانا ہے تجھے

دنیا کو جنگ سے بچانا ہے تجھے
اقوام کی دشمنی مٹانا ہے تجھے
جو جاگ کے بھی ہیں کابوس زدہ
ان جاگے ہوؤں ہی کو جگانا ہے تجھے

اس دور نفاق کو مٹانا ہے تجھے
اک مرکز پہ بشر کو لانا ہے تجھے
متضاد جتھوں میں بٹ گئی ہیں اقوام
بچھڑوں کو کھینچ کے ملانا ہے تجھے

پھیلے گا ترا فیض ابھی عالم عالم
انسان کے سر پہ ہو ترا دست کرم
اقوام کے قالب میں تجھے حل ہو کر
دنیا کو بنا دیا ہے جسد اعظم

فراق عشقیہ شاعری کے امام ہیں وہ عاشق ہیں اور ٹوٹ کر ذات اور کائنات سے عاشقی کرتے ہیں اسی
لیے ان کی آماج گاہ دل قرار پائی اور ان کی شاعری میں دل کا سودا اور دل سے برتاؤ انوکھا ہے یہ عشق یوں مجازی
اور جسمانی ہے لیکن بعض مقامات پر حقیقت کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے۔ ایک مقام پر عشق کی بابت تعلّی سنیے

جبینِ عشق ہوں سمجھ میرا مقام
صدیوں میں پھر سنائی دے گا یہ پیام
وہ دیکھ کر آفتاب سجدے میں گرے
وہ دیکھ اٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

شاعر انسانیت کے ارتقا میں دردِ دل کی اہمیت اور ضرورت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتا ہے۔
انسان اس ترقی کی منازل کو بتدریج طے کرتا ہے اور جانور صفت سے خدا صفات بن جاتا ہے

آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
جانور آدمی فرشتہ خدا

فراق کہتے ہیں

ہر عیب سے مانا کہ جدا ہو جائے
کیا ہے اگر انسان خدا ہو جائے
شاعر کا تو بس کام یہ ہے ہر دل میں
کچھ دردِ حیات اور سوا ہو جائے

حسن اور عشق کی داستان میں دکھے دل کی تاثیر رنگینیِ فکر کا باعث ہوتی ہے۔ ذیل کی رباعی میں قفس
اور محمل، دشت اور منزل، بہشت اور منزل کی گفتگو ہے یہاں یہ تلاش جاری ہے

پروانے کو ہے چراغِ محفل کی تلاش
جاں باز کو ہے جلوۂ قاتل کی تلاش
گم کردہ رہ وطن کو منزل کی تلاش
اس حسن کو ہے دکھتے ہوئے دل کی تلاش

وہ رنگ اڑا وہ رنگ آخر لایا
درد و غم و سوز و ساز کیا کیا پایا

جینے کا مزا ملا کسی پہ مرکے
صد شکر فراق دل کو دکھنا آیا

اس عشقیہ رباعی میں محاورے سے رنگ اڑنا، رنگ لانا، کسی پہ مرنا، دل دکھنا کے علاوہ صنعت تکرار میں رنگ، کیا کیا اور صنعت تضاد میں جینا مرنا، صنعت مراعات النظیر میں درد و غم سوز اور صنعت ایہام میں فراق بمعنی تخلص شاعر یا لفظ بطور معنی فراق استعمال ہوا ہے۔ ایک اور رباعی جس کی ردیف دل ہے۔ جس میں دکھتا دل اور دوسرے مصرعوں میں عشقیہ کیفیات جیسے کھویا ہوا دل بھولا ہوا دل وغیرہ کو صنعت تکرار سے مزین کیا ہے اور دل کے ساتھ سب محاوروں میں گفتگو ہے

کچھ اور بھی بھولے کوئی بھولا ہوا دل
کچھ اور بھی گم ہو کوئی کھویا ہوا دل
یہ کیسی صدا غیب سے آتی ہے فراق
کچھ اور بھی دکھتا کوئی دکھتا ہوا دل

دیکھنے میں یہ عشقیہ رباعی سیدھی سادی ہے لیکن اس میں کچھ اور بھی کوئی کی تکرار ہوا دل ردیف سے جڑی ہے۔ ذیل کی دو رباعیوں میں دل دکھانے کے مضمون کی بوقلمونی دیکھیے۔ یہاں شاعر نے رونے اور ہنسنے کے مضمون کو دونوں طرح سے باندھا ہے

اے دکھتے ہوئے دل کو دکھانے والے
روتے ہوئے کو اور رلانے والے
اتنی بھی نہیں چھیڑ کسی سے اچھی
ہنستے ہوئے منہ پھیر کے جانے والے

بہر حال عاشق کو کسی حال چین میسر نہیں ہر حال میں وہ شکوہ کر رہا ہے

اللہ رے ستم کہ دل دکھاتے بھی نہیں
اپنے سے جو دل دکھے رلاتے بھی نہیں
مایوس دلوں کو چھیڑتے جاتے بھی نہیں
روتا ہو کوئی تو مسکراتے بھی نہیں

کبھی شاعر یوں بھی دل کو تسلی دیتا ہے اور عشق کے فرض کو پورا کر لیتا ہے۔ ہم یہاں رباعی کی محدود حدوں میں دکھے دل کے مختلف رخ پیش کر کے یہ بتا رہے ہیں کہ ایک توانا کہنہ مشق فطری شاعر کے لیے

مضامین کی فصل ایک ہی زمین میں اگانا بڑی بات نہیں

ممکن ہو تو فرض عشق پورا کریں
ممکن ہو تو دل میں درد پیدا کریں
اپنا کرلیں تجھے یہ قسمت میں کہاں
دیکھتے دل سے تری تمنا کریں

گل نغمہ جو فراق کا مجموعہ کلام ہے اس میں الہام تھا کے عنوان سے اکی فکری رباعیات یکجا ہیں۔
جنھیں ہم یہاں کسی تشریح کے بغیر پیش کرتے ہیں

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیاں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

ہر ساز سے ہوتی نہیں یہ دھن پیدا
ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گن پیدا
میزان نشاط و غم میں صدیاں تل کر
ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

ہر چیز یہاں اپنی صدف توڑتی ہے
ہر لمحہ پہ صد عکس اپنا چھوڑتی ہے
اک سبزۂ پامال کی پتی بھی
ہمدم قلب ابد میں جو چھوڑتی ہے

اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں
اک نقطۂ تصویر تو تصویر نہیں
تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے
اک شخص کی قسمت کوئی تقدیر نہیں

فراق نے روپ کا عنوان دے کر اس کے بیچ سنگھار رس کی رباعیاں لکھ کر الٰہ آباد سے 1946 میں
تین سو اکیاون رباعیات کا انتساب شاعرِ اعظم جوش ملیح آبادی کے نام کیا۔ اس روپ کی شہرت اس کی جنسی سراپا
نگاری، جسمانیت اور معاملہ بندی کے مضامین سے ہے جسے خود فراق اور ان کے چند ناقدوں نے کہا ہے کہ یہ
اردو قدیم و جدید شاعری میں بالکل نئی چیز ہے حالانکہ سچ یہ ہے کہ قدیم اردو اور دکھنی شاعری میں جو محمد قلی قطب شاہ،
ملا وجہی، ملا نصرتی، غواصی کے علاوہ دوسرے بہت سے سراپا نگار شاعروں کے کلام میں یہ مضامین نظر آتے ہیں جن کی طرف
زیادہ توجہ نہ ہوئی۔ فراق نے اگرچہ ان رباعیوں کو سنگھار رس کا نام دیا ہے لیکن اس میں ایک بڑی تعداد ان
رباعیوں کی ہے جن میں صنفِ نازک کے اس حسن کو دکھایا گیا ہے جو اس کی فکر کا علاج اخلاق اور مزاج میں ہر
زاویے سے دمکتا رہتا ہے۔ فراق نے بچے کی معصوم مسکراہٹ سے کھیتوں میں دوڑتی اچھلتی لڑکیوں، تنوروں پر
گگروں کو اٹھائے ہوئے تہواروں، دوشیزاؤں، ساجن کے گیتوں کو گاتی ہوئی دلہن کے ہمراہ سہیلیوں اور خاندانی
عورتوں کے علاوہ بیٹی، پریم، گھر بار کی دیکھ بھال کرنے والی اور ممتا کی کیفیتیں وغیرہ کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ مرقع کشی کی
ہے جس میں برصغیر ارضیت کے ساتھ یہاں کی تہذیب بخصوص گھریلو دیہاتی ہندو سماج کی تصویر کشی ہے جو ان
سے پہلے اس طریقہ پر بھرپور نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اگر فراق کی رباعیوں سے مصرعوں کو چن کر تسلسل سے جمع
کر دیا جائے تو تہذیب نسواں کی ایک مکمل تصویر بن سکتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فراق صرف تصورات کے شاعر
نہیں بلکہ محسوسات کے فن کار بھی ہیں چنانچہ ان کی محسوس کی ہوئی جذبات سے لبریز حقیقتیں ان کے جمالیاتی
احساس کے خوب صورت پر تاثیر ٹکڑوں میں ڈھلتی نظر آتی ہیں جن کے نمونے ہم آگے پیش کریں گے۔

ہم نے جیسا ابھی ذکر کیا فراق نے روپ میں عورت کی مختلف حیثیتوں اور رشتوں کا الگ الگ اور
ایک ساتھ بھی ذکر کیا ہے وہ سکے کے دونوں رخ ایک جگہ دکھاتے ہیں جس سے بعض افراد معترض ہیں لیکن یہ
فراق کا طریقۂ فن ہے۔

ذیل کی رباعی میں عورت کی شخصیت کے مختلف روپ ماں، بہن، بیٹی، جیون ساتھی جو گھر کی رانی یا
دیوی ہے وہ کامنی رس کی پتلی اور کبھی بگڑ جائے تو ہرجائی بھی ہے

ماں اور بہن بھی اور چھیتی بیٹی
گھر کی رانی بھی اور جیون ساتھی
پھر بھی وہ کامنی سراسر دیوی
اور سیج پہ بیسوا وہ رس کی پتلی

رسیلے ہندی شبدوں نے رباعی کو یہاں کی بھومی سے جوڑ دیا ہے۔ پوری رباعی میں ایک لفظ بھی عربی یا

قاری کا نہیں۔ سنسکرت کی تلمیحات کا نہیں، دیوی اور اس کے ساتھ نامانوس خوب صورت الفاظ کے گچھے جیسے گھر کی رانی، جیون ساتھی، بھیتی بیلی، اور رس کی پتلی وغیرہ استعمال کر کے مصرعوں کو رنگینی کے ساتھ اثر بھی بخش دیتے ہیں۔

فراق کی شاعری میں بھرتی کے الفاظ بہت ہی کم نظر آتے ہیں چونکہ وہ غزل کے شاعر ہیں اس لیے جذبات نگاری اور پیکر سازی میں اختصار سے دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔

شاعر جب کسی لفظ کی تکرار کرتا ہے تو نغمگی کے ساتھ اس لفظ کا اثر چند برابر ہو جاتا ہے

نکھری نکھری نئی جوان دم صبح
آنکھیں میں سکون کی کہانی دم صبح
آنگن میں سہاگنی اٹھائے ہوئے ہاتھ
تلسی پہ چڑھا رہی ہے پانی دم صبح

اس رباعی میں سہ بعدی منظر کشی دیکھیے۔ اگرچہ ہر مصرعہ ایک پورا منظر نامہ ہے پھر بھی مصرعوں میں مضمون کا ارتقا رباعی کا حاصل ہے یعنی چوتھا مصرعہ زوردار ہو یا پھر معنی آفرینی سے لبریز ہو۔ یہاں چمکتے صفحات صنعت ایہام میں ہیں یعنی ایک تو دھوپ کی وجہ سے دوسرے رامائن کے صفحات تابناک اور روشنی کے مصدر ہیں

آنگن میں سہاگنی نہا کے بیٹھی
رامائن زانوؤں پہ رکھی ہے کھلی
جاڑے کی سہانی دھوپ کھلے گیسو کی
پرچھائیں چمکتے صفحے پہ پڑتی ہوئی

عمدہ شاعر ایک معمولی روز مرہ مضمون کو بھی فلک پر دھنک کی طرح بکھیر دیتا ہے۔ ایک جوان دیہات کی عورت کے نہا کر ساڑی کے سکھانے کے عمل کو وہ خوب صورت ہندی اردو الفاظ میں رنگین بنا دیتے ہیں۔ یہاں چاروں مصرعے اگرچہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن مضمون میں ارتقا نہیں بلکہ حسن ہے

نرمل جل سے نہا کے رس کی پتلی
بالوں سے ارگجے کی خوشبو پھیلی
ست رنگ دھنش کی طرح بانہوں کو اٹھائے
پھیلاتی ہے الگنی پہ گیلی ساڑی

ہم یہاں طوالت سے بچنے کی خاطر چند رباعیوں کو بغیر تشریح اور تبصرے کے صرف جوڑ دیتے ہیں تاکہ دلہن کے روپ، ماتا اور پاکیزہ عورت کے روپ سے روشن صفحات پر بکھر جائے

منڈپ کے تلے کھڑی ہے رس کی پتلی
جیون ساتھی سے پریم کی گانٹھ بندھی
جلتے شعلوں کے گرد بھانور کے سے
مکھڑے پہ نرم چھوٹ سی پڑتی ہوئی

آنکھوں میں سرشک جگ مگاتا مکھڑا
وہ جشن رخصتی سہانا کتنا
جھرمٹ میں سکھیوں کے اٹھتے ہیں قدم
وہ گھر کی عورتوں کا پاہل کتنا

رنگت تری کچھ اور نکل آتی ہے
یہ آن تو حوروں کو بھی شرماتی ہے
کٹتے ہی شب وصال ہر صبح کچھ اور
دوشیزگی جمال بڑھ جاتی ہے

چوکے کی سہانی آنچ مکھڑا روشن
ہے گھر کی لکشمی پکاتی بھوجن
دیتے ہیں مرچلی کے چلنے کا پتہ
سیتا کی رسوئی کے کھنکتے برتن

پی جی کے ساتھ کھانے کا وہ عالم
جھکنے پہ وہ ہاتھ جسم نازک میں وہ خم
لقمے کے اٹھانے میں کلائی کی لچک
دلکش کتنا ہے منہ کا چلنا تھم تھم

(شاعر نے منظر کشی میں دقیق اور چھوٹے چھوٹے لمحات کو شعری لباس پہنا دیا ہے)

بچی کو بخار اٹھ نہیں سکتی ہے پلک
بیٹھی ہے سرہانے ماتا مکھڑے کی دمک
جلتی ہوئی پیشانی پہ رکھ دیتی ہے ہاتھ
پڑ جاتی ہے بیمار کے دل میں ٹھنڈک

(ہجر کی رات کی فراق نے منظر کشی کر کے بالکل نیا مضمون ایک انوکھی تشبیہ سے باندھا ہے)

آنسو سے بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

فراق کا کمال یہ بھی ہے کہ عام گھریلو کام کاج میں بھی حسن کے نکتے کو تلاش کر لیتے ہیں اور اس کو رنگ و آب دے کر پیش کر دیتے ہیں

متھتی ہے جگے دہی کو رس کی پتلی
انگوں کی تھیں کچوں پہ لٹکی لچکی
وہ چلتی ہوئی سڈول باہوں کی لچک
کومل مکھڑے پہ اک سہانی سرخی

ممتا اور بالک کے رشتے کو ان رباعیوں میں دیکھیں۔ نیاز فتح پوری نے کہا تھا یہ مضامین تو صرف فراق ہی لکھ سکتے ہیں۔

گل ہیں کہ رخ گرم کے ہیں انگارے
بالک کے نینن سے ٹوٹتے ہیں تارے
رحمت کا فرشتہ بن کے دیتی ہے سزا
ماں ہی کو پکارے اور ماں ہی مارے

نہلا کے چھلکے چھلکے نرمل جل سے
الجھے ہوئے گیسوؤں میں کنگھی کر کے
کس پیار سے دیکھتا ہے بچہ منھ کو
جب گھٹنوں میں لے کے ہے پہناتی کپڑے

ذیل میں ہم صرف ہر رباعی ایک دو مصرعے لکھ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تشبیہ دیتے ہوئے فراق ندرتِ خیال کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے
بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے
انگڑائی سی شفق کو آئے جیسے
غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے
مندر میں چراغ جھلملائے جیسے
کامنی کو ہلکی نیند آئے جیسے
دوشیزہ بہار مسکرائے جیسے

آخر میں ہم دو تین رباعیات پہ اس مضمون کو تمام کریں گے۔ یہ رباعیات خود لب کشا ہیں۔

رکشا بندھن کی صبح رس کی پتلی
چھائی ہے گھٹا گگن پہ ہلکی ہلکی
بجلی کی طرح لچک رہے ہیں لچھے
بھائی کے ہے باندھتی چمکتی راکھی

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے
دکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں
سکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

ہم اس مضمون کو فراق کی رباعی پہ ختم کرتے ہیں۔

کہ میرے یہ رنگ حسن اچھالے کس نے
سانچے میں یہ خط و خال ڈھالے کس نے
ساز بے نغمہ تھا یہ جسم رنگیں
اس ساز سے یہ بول نکالے کس نے

☆☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار (استنبول، ترکیہ)

ترکی زبان میں بچوں کا ادب

اس میں کوئی شک نہیں کہ والدین کے لیے ان کے بچے ان کی اپنی جان سے بھی عزیز ہیں اور ان کا دکھ سکھ والدین کی نظر میں اپنے آرام و سکون اور اپنی پریشانیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اگر ممکن ہو تو وہ اپنی اولاد کو دھوپ بھی لگنے نہیں دیں گے اور ان کو اپنے پیار کے دامن میں سمیٹے رکھیں گے۔ لیکن دنیا کی کڑوی حقیقتیں کچھ ایسی ہیں کہ جن کے تحت ہمیں اپنے بچوں کو اس طرح تیار کرنا پڑتا ہے کہ آگے چل کر وہ ان حقیقتوں کا سامنا کر سکیں۔ یعنی ہم انہیں دنیا کی مشکلات اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنا سکھاتے ہیں، جس طرح ہمارے والدین نے ہمیں سکھایا تھا۔

دنیا کے کسی بھی ملک میں رہ رہے ہوں ہم والدین کے دلوں میں یہی تمنا ہوتی ہے کہ ہمارے بچے جدید ٹیکنالوجی اور سائنس کی تعلیم سے مزین ہوں، ہم ان کو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے دیکھ کر فخر محسوس کریں اور ان کو زندگی کی وہ تمام سہولیات فراہم کریں جن سے وہ تن آسانی سے عیش و آرام کے دن گزارتے رہیں۔ یہ میری بھی خواہش ہے، آپ کی بھی خواہش ہے اور بہت سے ماں باپ کی بھی خواہش ہے۔ لیکن یہ بچوں کی تعلیم و پرورش کا مادی پہلو ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی پرورش مادی اغراض اور خواہشات کے مطابق کریں گے اور معنوی یا روحانی پہلو کو نظر انداز کریں گے تو ہمارے سامنے ایسی نسلیں آئیں گی جن میں اخلاقی اقدار کا فقدان ہوگا اور یہ فقدان نہ صرف ان بچوں کے بذات خود اپنے لیے بلکہ ان کے والدین کے لیے حتیٰ کہ ان کی قوم اور ملک کے لیے بھی نقصان کا باعث ہوگا۔

یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے بچے ہمارا مستقبل ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت اور بہتر انسان یا بہ الفاظ دیگر "اشرف المخلوقات" بننے کے سلسلے میں ہم لوگ جو آج کر سکیں گے وہ ہماری قوم اور ہمارے ملک کے روشن مستقبل کے لیے سب سے اہم سرمایہ کاری ہوگی اور اس سرمایہ کاری کی ذمہ داری نہ صرف ہماری حکومتوں اور سرکاری اور نجی اداروں پر عائد ہوتی ہے بلکہ ان سے کہیں زیادہ والدین پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جن سے کوئی بھی فرد پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ ماں کی پیار بھری گود ایک تعلیم گاہ ہے، والد کی شخصیت، طور طریقہ اور اس کے اپنے گھر والوں کے ساتھ سلوک اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کے باہمی روابط بچوں کے لیے رہنما ہیں۔ الغرض اگر ملک اور قوم کے لیے روشن مستقبل چاہتے ہیں تو ہمیں بچوں کے سامنے مثبت کردار ادا کر دکھانا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بالخصوص عصر حاضر کی تگ و دو میں پھنسا ہوا انسان بسا اوقات دہ چاہتے ہوئے بھی اس ذمہ داری سے اکمل طریقے سے عہدہ برآ نہیں ہو پاتا۔ یہ بھی اظہر من الشمس امر ہے کہ بچوں کی پرورش میں اسکول کی جدید سائنسی تعلیم اور دینی علوم کی تعلیم و تدریس بے شک اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں اور ان کی اہمیت سے انکار ہو ہی نہیں سکتا لیکن ان کے ساتھ ساتھ بچوں کے کردار کی تعمیر میں ایک اور مددگار طاقت جو ہمارے پاس ہے وہ ادب ہے۔ آپ اسے ادب، ادبیات یا لٹریچر جس نام سے بھی دل چاہے پکاریں یہ ایک ایسی بڑی طاقت ہے کہ دماغ کو زور دیے بغیر، جد و جہد کیے بغیر اور گھٹنوں رگڑے لگائے بغیر بچوں کے تحت الشعور میں نفوذ کرتی ہے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں تک اثر کرتی ہے۔ ادب کا یہ اہم کردار سب کے لیے سماری کام کرتا ہے لیکن چونکہ یہاں ہمارا موضوع بچوں کا ادب ہے لہٰذا ہم اپنی توجہ بچوں کے ادب اور بالخصوص ترکی زبان میں بچوں کے ادب پہ مرکوز رکھیں گے۔

عام طور پہ ادب اطفال سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بچوں کو اپنی زندگی کے پہلے مرحلوں سے لے کر ایام نوجوانی تک ایسی تہذیبی و ثقافتی تعلیم فراہم کرے جس کے ذریعے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہو اور وہ دوسرے انسانوں سے، جانوروں سے اور ماحول زیست سے محبت اور ان کا احترام سیکھیں۔ وہ سماج کے اندر کس طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں، اس سماج میں ان کا کیا مقام ہے اور کردار کیا ہونا چاہیے یہ سب بچوں کے مثبت ادب کی لازمی خصوصیات ہیں۔ مزید برآں مثبت ادب اطفال کا یہ بھی طرۂ امتیاز ہے وہ بچوں کو اپنے مذہب کے قریب لائے اور اپنی قوم اور وطن سے پیار کا سبق دے اور انہیں اچھا اور برا، غلط اور درست، حق اور باطل کی تفریق کرنے کا طریقہ سکھا دے اور قدم بہ قدم بچوں کی ذہانت اور صلاحیت کو تقویت اور وسعت دے۔ البتہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں جو ادب مثبت کردار ادا کرتا ہے وہ بچوں کی ذہنی سطح اور وسعتوں، ان کی عمر اور ان کی دلچسپیوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر تخلیق کیا ہوا ہوتا ہے۔

جب سے اس کرۂ زمین پہ بنی نوع آدم موجود ہے تب سے ادب کے نمونے کسی نہ کسی شکل میں ظہور پذیر ہوتے آ رہے ہیں۔ قبائلی زندگی میں وقت گزارنے کے لیے سنائی گئی شکار یا لڑائی کی کہانیاں، یا خوشی کے موقعوں پہ گائے جانے والے گیتوں کے بول اور معبودوں کے سامنے پجاریوں کی مترنم دعائیں، یہ سب ادب کی ابتدائی شکلیں تھیں جو آگے چل کر تہذیب و ثقافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادب کی مختلف اصناف کی بنیاد بن گئیں اور پھر جو ادب تشکیل پذیر ہوا وہ خود ہی تہذیب و ثقافت کی ترقی، استحکام اور نسل در نسل انتقال کا ضامن بن گیا لیکن اٹھارویں صدی عیسوی تک باقاعدہ ادبیات اطفال کی تلاش محال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پہیلیاں، حکایات و قصص، داستانوں اور نظموں میں کچھ ایسی خصوصیات تھیں جو

بچوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں اور بچے ان کو شوق سے سنیں اور ان سے لطف اندوز ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے وہ قاری کی حیثیت سے بچوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہوں۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ترکی زبان میں بھی صورتحال یہی تھی اور خانہ بدوش ترک قبائل میں قومی رزمیہ داستانیں، جن میں ترکوں کی تاریخ، جنگیں، جیت اور ہار، نیست و نابود ہونے سے بال بال بچ کر پھر سے قوم کی نشاۃ الثانیہ کی کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ داستان گوؤں کی زبانی ساز کے ساتھ سنائی جاتی تھیں اور بچے بھی بڑوں کے ہمراہ ان کو سن سن کر بڑے ہوتے تھے، یعنی بہادری، جرات و ہمت اور طاقتور سے طاقتور دشمن کے سامنے ہار نہ ماننے اس کا مقابلہ کرنے اور اپنی قوم کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کا درس دے کر ترک بچوں کو ایک جنگجو قوم کا فرد ہونے کا شعور دیا جاتا تھا۔

اس لیے ترکوں کے قبول اسلام سے پہلے بھی بعد میں بھی مختلف ترک قبائل میں کئی رزمیہ داستانیں موجود تھیں جن میں "داستان ایلے خان"، "داستان پیدائش"، "داستان الپ ار تونگا"، "داستان تو"، "داستان اوغوز قاغان"، "داستان انتقا"، "داستان سرمئی بھیڑیا"، "داستان ار گنے کون"، "داستان گوک ترک قوم" اور "داستان ہجرت" سرفہرست ہیں۔ ان داستانوں کے علاوہ بالخصوص ترکی، آذربائیجان اور ترکمانستان کے ترک اوغوز قاغان کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ہم سب اوغوز قبائل کا مشترکہ نثری داستان" دده قورقود کی کتاب" ہے جس میں دده قورقود نامی ایک شخص کی زبانی اوغوز قوم کی بہادری اور جرات کے ساتھ ساتھ ان کی غلطیوں سے دور رہنے اور انسانی تعلقات کی نوعیت اور اوغوز قوم کے رہن سہن کا طور طریقہ سکھانے والی مختلف کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور ہر کہانی کے اپنے اپنے کردار ہیں۔ صدیوں سے اوغوز قبائل میں زبانی نقل ہونے والی ان کہانیوں کو چودھویں اور پندرہویں صدی میں مختلف گمنام افراد کی جانب سے قلمبند کیا گیا اور ہر چند "دده قورقود کی کتاب" بچوں کے لیے نہیں لکھی گئی تھی اس کے باوجود بچے اس میں موجود کہانیوں کو شوق سے پڑھتے اور اپنے بزرگوں سے سنتے تھے۔

اسی طرح ترکی کے معروف مزاحیہ کردار "نصرالدین خوجہ" یعنی ملا نصرالدین ہیں۔ ہر چند ملا نصرالدین کے پر لطف اور ہنسی مزاق کے لطیفوں کے اصل مخاطب بچے نہیں لیکن ان لطیفوں کا پرکشش انداز بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ لطیفہ دیکھیے:

کسی آدمی کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا ملا نصرالدین کے پاس جا کر کہنے لگا:

میرے والد صاحب جمعے کے دن وفات پا گئے۔ اس جہان میں ان کا استقبال کس طرح ہوگا؟

ملا نے پوچھا:

کیا وہ نماز پڑھتے تھے؟

میت کے بیٹے نے جواب دیا:

جی نہیں، مگر میرے والد تو جمعے کے دن انتقال کر گئے۔

ملا نے پوچھا:

کیا وہ عیاشی کرتے تھے؟

میت کے بیٹے نے جواب دیا:

جی ضرور، عیاشی بھی کرتے تھے مگر وہ تو جمعے کے دن وفات پا گئے۔

ملا نے پوچھا:

آیا وہ چوری چکاری بھی کرتے تھے؟

میت کے بیٹے نے کہا:

جی جناب مگر وہ تو جمعے کے دن انتقال کر گئے۔

اس پر ملا نصر الدین کو سخت غصہ آیا اور وہ کہنے لگے:

ٹھیک ہے بیٹے ٹھیک ہے، جمعے کو تو انھیں کچھ نہیں کہیں گے مگر جب ہفتے کا دن آئے گا ناں، اس دن ان کا تمام حساب بخوبی لیں گے۔

اور ملا نصر الدین کا ایک اور مختصر لطیفہ جو مجھے بہت پسند ہے حاضر خدمت کرتا ہوں، وہ کچھ یوں ہے:

ملا نصر الدین کی بیوی کا انتقال ہوا۔ ملا نصر الدین کی بیوی جس کا انتقال ہوا، اس کے بطن سے پانچ بچے پیدا ہوئے تھے۔ ملا نے ایک بیوہ خاتون سے نکاح کر لیا جس کے پہلے والے شوہر سے پانچ بچے تھے۔ پھر ملا کی اس نئی بیوی کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اچانک ملا کی نئی بیوی چیخ پکار کرنے لگی:

ملا صاحب، ملا صاحب، جلدی آیئے۔ آپ کے بچے اور میرے بچے مل کر ہمارے بچوں کی پٹائی کر رہے ہیں۔

ہنسی مذاق میں اخلاقیات کا سبق دینے والے ان لطیفوں کے کاطب بچے لوگ نہ ہونے کے باوجود ترکی زبان میں بچوں کے ادب کا ایک حصہ بن گئے۔

گو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جدید عہد تک بچوں کو ملحوظ خیال رکھنے والی کوئی ادبی صنف نہیں، مگر میرے خیال میں ایک ایسی ادبی صنف انسانیت کے اولین دنوں سے لے کر آج تک موجود ہے۔ وہ صنف ہے

"لوریاں" جن کے مخاطب براہ راست بچے ہیں۔ خواہ بچوں کو سلانے کے لیے ہوں خواہ بچوں کو دلاسا دینے کے لیے ہوں ہماری ماؤں کی گنگنائی ہوئی منظوم لوریاں جدید عہد سے قبل ادبیات اطفال کا واحد بامقصد نمونہ ہیں۔

دوسری زبانوں کی طرح ترکی زبان میں بھی قبل از اسلام سے لے کر آج تک بے شمار لوریاں گنگنائی گئیں اور بعد میں لوریوں سے متعلق کتابیں تیار کی گئیں۔ یہ لوریاں بسا اوقات بچوں کو سلانے کے لیے ان کی ماؤں کی زبانی مترنم آواز میں گنگنائی جاتی تھیں ان کو بے معنی اور الفاظ کے ساتھ کھیل کی صورت میں نہیں لینا چاہیے۔ بچوں کو دلی سکون دے کر سلانے کے علاوہ اکثر و بیشتر لوریوں کا ایک تعلیمی مقصد بھی موجود ہوتا تھا جس کے تحت ان کی صنف بندی کی جا سکتی ہے۔ اگر میں ترکی زبان کو مد نظر رکھوں تو ترکی زبان کی لوریوں میں مذہبی اور اخلاقی موضوعات، بچوں کی صحت و سلامتی اور ان کے روشن مستقبل کی دعائیں اور نیک تمنائیں، ماں سے والدہ کا پیار، کبھی کبھار بچے کو سلانے کے لیے پیار سے دھمکی والی باتیں، زندگی کی مشکلات سے شکایتیں اور بچوں کو ان مشکلوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ میاں سے التجائیں، والد کی جدائی یا غریب الوطنی سے شکایت یہ سب ایسے موضوعات ہیں جن کا ذکر ترکی زبان کی لوریوں میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر ان دو لوریوں کو لیجیے:

اولیا اللہ کی تلوار کی نوک عرش عظیم تک پہنچی
سب دکھ درد کی بس ہے یہ دوا لا الہ الا اللہ........اور
لوری سنا کر سلاتی ہوں اللہ کہہ کر تجھے پالتی ہوں
تو حید سے چلنا سکھاتی ہوں سو جا میرے بچے سو جا
سیکھ لے ننھے قدموں سے چلنا خوش خوش اللہ

جدید ترکی ادب تک پہنچتے پہنچتے لوریوں کے علاوہ پہیلیاں، کہاوتیں، افسانے، قصص، مختلف منظومات اور داستانیں یعنی ادب کی مختلف اصناف میں بچوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر بچوں کے لیے ادب کی بنیادیں تشکیل دی تھیں۔

اب جب ہم ترکی ادب میں صحیح معنوں میں ادبیات اطفال کی بات کریں گے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ترکی زبان میں جدید ادب کی اصناف کی طرح بچوں کے لیے ادب کا شعور بھی مغربی زبانوں کے اور بالخصوص فرانسیسی ادب کے زیر تاثیر ظہور پذیر ہوا۔ ترکی جدید ادب میں ادبیات اطفال کو دو اہم ادوار میں منقسم کرتے ہیں۔

1۔ ترکی جمہوریت کے قیام سے پہلے
2۔ ترکی جمہوریت کے قیام کے بعد

جمہوریت سے پہلے کے دور کا آغاز سلطنت عثمانیہ میں بادشاہ کے حکم سے اعلان ہونے والے

"فرمان تنظیمات" سے ہوتا ہے۔

3 نومبر 1839 کو سلطان عبدالمجید کے عہد میں تنظیمات کے عنوان سے موسوم قرارداد کا اعلان ہوا یہ بھی عثمانی بادشاہوں کی ملک کو زوال سے بچانے کی غرض سے کی گئی اصلاحات میں سے ایک تھا لیکن اس کے اثرات عثمانی نظام حکومت سے لے کر فوج اور سماج یہاں تک کہ اس عہد کے ادب پر بھی بہت گہرے مرتب ہوئے اور ملک کے تمام طبقات جدیدیت کے طوفان کی زد میں آ گئے۔

ان اصلاحات کے زیر اثر روزمرہ زندگی کے رہن سہن سے لے کر زبان، ادب اور تہذیب کے میدانوں میں بھی عظیم تبدیلیاں رونما ہونے لگیں بالخصوص شعر و ادب جو پہلے محل اور آس پاس میں پروان چڑھنے والے "دیوان ادبیاتی" یعنی "دیوان خاص کا ادب یا درباری ادب" بھی ان اصلاحات کے ساتھ بدلنے لگا اور محل اور امرا کے ادبی ذوق کے مطابق تشکیل پذیر ہونے والے اس دبستان کو اب یورپ سے آنے والے نئے سیاسی اور سماجی خیالات و تصورات کے ساتھ محل سے باہر کے لوگوں کو بھی اپنے قارئین کی حیثیت سے مدنظر رکھنا تھا اور مغرب میں موجود ادبی اصناف اور تحریکوں کی اس پر گہری چھاپ پڑنے لگی۔

اس دور میں فرانسیسی زبان سے تراجم کے ذریعے یورپی ملکوں بالخصوص فرانس میں نشوونما پانے والے ادب کی تقلید میں ترکی ادب نئی اصناف سے روشناس ہونے لگا۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں ترکی ادب میں کلاسیکی مشرقی اصناف کے ساتھ مغرب کی جدید اصناف و اسالیب سے اثر پذیر ہوتے ہوئے ایک نئی ادبی آمیزش جنم لے رہی تھی اور شعری/نثری ادب میں نئے تجربات کیے جا رہے تھے۔ اس زمانے کے معروف ادیب اور شاعر "شناسی" جن کا شمار ترکی جدید ادب کے بانیوں میں ہوتا ہے، نے "تصویر افکار" کے نام سے ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔

تنظیمات کے ساتھ مغرب کے زیر اثر ترکی ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور جدید ادب کی طرف رجحان کے ساتھ ساتھ بچوں کی نفسیات اور ان کی ضروریات کو مدنظر رکھنے والے ادبیات اطفال پر بھی بحث و مباحثہ شروع ہوا۔ پہلے پہل فرانسیسی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی معروف کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ ہونے لگا۔ اس سلسلے کی تصانیف تراجم کے ذریعے تنظیمات کے اعلان کے 20 بیس سال بعد 1859 میں معرض وجود میں آنے لگے۔ اس دور میں ہمارا سامنا تین تراجم سے ہوتا ہے۔ یہ پہلے تراجم حکایت یعنی نظم یا نثر میں مختصر قصہ یا پیرایہ جس میں بھی اخلاقی نکتہ کو نمایاں کیا گیا ہو اور بہت سی حکایات میں جانوروں یا پرندوں کو انسانوں کی طرح بولتے ہوئے اور انسانوں جیسی حرکتیں کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

اول۔ ترک شاعر اور ادیب شناسی نے معروف شاعر اور ادیب لافونتین (Jean de La Fontaine) کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی نظموں کا ترجمہ ترکی زبان میں "ترجمہ منظومہ" کے عنوان سے کیا۔

دوم۔ قیصری والے ڈاکٹر رشدی نے بچوں کے لیے تحریر کردہ اپنی تصنیف "تحفۃ الاطفال" کے آخر میں فرانسیسی چرندوں پرندوں یا جانوروں اور پرندوں کی کہانیوں کے تراجم کو شامل کیا تھا۔

سوم۔ یوسف کامل پاشا کا فرانسیسی مصنف فرانچس فینیلون (François de Salignac de La Mothe Fenelon) کے ناول (The Adventures of Telemachus) کا ترجمہ "تیلے ماک" کے عنوان سے ترکی میں کیا۔

1859 کے ان تین اولین تراجم کے بعد مغربی ادب بالخصوص فرانسیسی ادب سے تراجم کا سلسلہ سرعت پکڑنے لگا۔ 1871 میں رجائی زادہ محمود اکرم کا ترجمہ "ناپیز"، احمد مدحت آفندی کے چرندو پرندکی کہانیوں کا ترجمہ اور ضیاء پاشا کا روسو J. J. Rousseau کا ناول "ایمیل" (Emille) کا ترجمہ بھی موجود ہیں۔ ان کے بعد انگریزی ادب کے معروف مصنف Daniel Defeo ڈینیل ڈیفو کے ناول "روبنسون کروزو" (Robinson Crusoe) کا ترکی ترجمہ "حکایاتِ کروزو"، جولس ورن کی تصانیف "بالن میں پانچ ہفتے" اور "گرد دنیا اسی دن" اور "کیپٹن ہیرس کی سرگزشت" جیسے کئی کتابوں کے مختلف تراجم سامنے آئے۔ پھر ان کے بعد احمد احسان نے 1889 سے لے کر 1904 تک جولس ورن کی 16 سولہ تصانیف کا ترکی ترجمہ کیا تھا۔

پھر مغربی ادبیات اطفال کے تراجم کے ساتھ ساتھ ترک مصنفین بھی بچوں کے لیے طبع زاد تصانیف قلمبند کرنے لگے۔ مثال کے طور پر احمد مدحت آفندی نے 1870 میں "خواجہ اول" اور 1871 میں "قصہ دان حصہ"، 1886 میں رجائی زادہ محمود اکرم نے "تفکر" اور 1890 میں معلم ناجی کی تصنیف "عمران چوجوقلوغو" (عمر کا بچپن) اہم تھی۔

تنظیمات کے بعد شروع ہونے والا دورِ اعلانِ مشروطیت یعنی آئینی بادشاہت کے عہد میں بھی بچوں کے ادب میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ محمد امین یورداکول، فوادقوپرلو، عمر سیف الدین، ضیا گوک الپ، جلال ساحر ایروزان، یوسف ضیا اورتاچ، اورخان سیفی اورحان، خالد فخری اوزانسوئے، فاروق ناقذ چاملی بیل، انیس تیچ کوریورک جیسے ترکی ادب کے ملی ادبیات یعنی قومی ادب کے دبستان سے تعلق رکھنے والے شعراء و ادباء نے بچوں کو قومی اور اخلاقی اقدار سے متعارف کرانے کے لیے مختلف تصانیف قلمبند کیں۔

تنظیمات سے لے کر ترکی جمہوریت کے قیام تک بچوں کے لیے مختلف رسالے بھی نکلنے لگے جن میں سے اولین ہونے کا شرف 1869 میں نکلنے والے "ممیز" کو حاصل تھا۔ پھر ممیز کے بعد ترکی میں رسم الخط کی تبدیلی تک پچاس کے لگ بھگ بچوں کے رسالے سامنے آئے جن کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

رسالے کا عنوان	تاریخ اشاعت	رسالے کا عنوان	تاریخ اشاعت
ممیز	1869	ثروتِ اطفال	1873
صداقت	1875	اطفال	1875
آئینہ	1875	ترجمۂ حقیقت	1880
آکہ	1880	باغچہ	1880
مجموعۂ نورسیدگان	1881	چوجوگر و آرتاداش	1881
چوجوگر و قراءت	1881	واسطۂ ترقی	1887
دبستانِ خرد	1887	چوجوگر و تعلیم	1887
چوجوگر و مخصوص خزینہ	1896	چوجوگر و دبیر	1897
چوجوق باغچہ سی	1905	مصور چوپک عشائی	1909
مکتبلی ار و آرتاداش	1910	چوجوق دنیاسی	1913
یوزی قرہ گوز	1913	چوجوق یوردو	1913
مکتبلی	1913	طلبہ دفتری	1913
چوجوق دو یگو سو	1913	ترک یاوروسو	1913
چوجوق عالمی	1913	قرہ گنج	1913
چوجوق باغچہ سی	1914	چوجوق دوستو	1914
مینی مینی	1914	کوچکلر خزانہ سی	1918
رچوجوق	1918	ہفتہ لق چوجوق خزانہ سی	1919
لالہ	1919	حاجی یاتماز	1920
بزم مجموعہ	1920	قلتی یول	1923
مصور چوجوق پوتاسی	1923	چیچی تیتی	1923
ہفتہ لک رسملی خزانہ سو	1924	رسملی دنیا	1925
ہیو کلی مجموعہ	1925	مکتبلی ار عالمی	1925
ترک چوجوقو	1926	چوجوق دنیاسی	1926
چوجوق بلدرچی	1927		

ترکی میں جمہوریت کے اعلان کے بعد بھی مغربی ادب سے تراجم کا سلسلہ جاری رہا اور ارخان ولی قانیق، صباح الدین ایوب اوغلو اور ناظم حکمت جیسے شعرا اور ادبا نے لاطینی سے تراجم کیے۔ اسی طرح کمال الدین شکری، ہجرت رشدی اپیٹے، یاشار نابی نایر نے روبنسون کروزو کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔

1949 کی دہائی میں ترکی کے سرکاری ادارہ بچوں کے تحفظ کے ادارے نے مغربی زبان کے بچوں کے ادب کی ایک سو اہم کتابوں کا ترکی ترجمہ کروا کر بچوں میں مفت تقسیم کرایا اور وزیر قومی تعلیم حسن علی یوجیل نے مغرب کے کلاسکی ادب کے ترکی تراجم کے سلسلے میں بچوں کے لیے لکھی گئی تصانیف کو بھی شامل کرایا۔ ان دو اہم اقدام نے ترکی زبان میں بچوں کے ادب میں خوبصورت اضافہ کیا۔

1930 کی دہائی سے لے کر تراجم کے علاوہ ترکی زبان میں بچوں کے لیے طبع زاد تصانیف کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔

اس ضمن میں ترکی کے کئی ادیبوں نے بچوں کے لیے پریوں کی کہانیاں، افسانے اور ناول جیسی مختلف ادبی اصناف میں خوبصورت اور دلچسپ کتابیں لکھیں ان ادبا میں نائی تیزیل، افلاطون جم گونے، طاہر آلانگو، جاہد ظریف اوغلو، اوغوز تانسیل، مولانا ادریس گوکین، حسن لطیف سارپ یوجے، مصطفیٰ روحی شیرین، ابراہیم ذکی بوردورلو، احمد قمر امان، ینار کمال، جیلان یوریتاش، رشمت توری گوکتیکین، گل تین داتی اوغلو، طالب آپ آئیدین، ابراہیم ادریس، رفعت الگاز، کمال الدین طوغچو، جعفر ازگو، طارق دورسون قاقیچ، آیلا قوتلو، جاہد اوچوک اور کمال الدین طوغچو جیسے کئی ادیبوں کے نام شمار کیے جا سکتے ہیں۔

جمہوریت کے بعد بچوں کے نثری ادب کی طرح محض بچوں کے لیے لکھی گئی شاعری کا چرچا بھی زوروں پر رہا ہے اور بچوں کے لیے نظموں کے مجموعے شائع ہوتے رہے۔ اس میدان میں فاضل حسنی داغلر جا کا نام سر فہرست ہے جنھوں نے اپنی تیس سالہ ادبی زندگی میں بچوں کے لیے شاعری کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے اور بچوں کے لیے ان کے تیس سے زائد مجموعے شائع ہوئے جن میں "چوجوق دا اللہ" {بچہ اور اللہ}۔ 1957 "بیر یوزدہ بیر چوجوق" {زمین کے بچے}۔ 1974 "یاراماز سوز چوجوق" {شرارتی الفاظ۔ 1979 "جن اوغلان" {جن بچہ۔ 1981} اور "اویون اوقولو" {کھیل کا اسکول۔ 1998} قابل ذکر ہیں۔

فاضل حسنی داغلر جا کے علاوہ بھی کئی ترک شاعروں نے خاص طور پر بچوں کی اخلاقی تعلیم و تربیت اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نظمیں لکھیں جن کی بہت طویل فہرست ہے۔

مندرجہ ذیل فہرست میں ان میں سے کچھ سر برآوردہ شعراء کے نام اور ان کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی نظموں کی کتابوں کے نام پیش ہیں:

شاعر کا نام	مجموعہ کا ترکی نام	نام اردو ترجمہ	تاریخ اشاعت
اورخان ولی	نصر الدین خوجہ	ملا نصر الدین	1949
یوسف ضیا اورتاچ	کوش جیوشی لاری	پرندوں کی چہک	1938
یوسف ضیا اورتاچ	سزن ایچون	آپ کے لیے	1928
فاروق نافذ چاملی بیل	آچیق ترکو لیری	چاہیوں کے گیت	1938
ایم نجاتی ساغتقین	چوجوقلار یمیز در سیلی شعرلار	ہمارے بچوں کے لیے مصور نظمیں	1958
مصطفیٰ روحی شیرین	کوک یوزو چیچک لری	آسمان کے پھول	1983
مصطفیٰ روحی شیرین	چوجوق قلبمدہ کی آتش	میرے بچے جیسے دل میں موجود پرندہ	1990
جاہد ظریف اوغلو	گولوجوک	مسکراہٹ	1988
مولانا ادریس رنگین	قوش رنگی چوجوقلوغوم	میرا پرندے کا رنگ لیا بچپن	1990
یالواچ اورال	موزیک ساتان چوجوقلر	موسیقی بیچنے والے بچے	1979
یالواچ اورال	کولاقمدہ کی کوچک پان	میرے کان کے اندر موجود چھوٹی کشتی	1979
علی آقباش	قوش سفروسی	پرندے کا دسترخوان	1991
حسن دیمیر	قوشلرلہ بریلیک	پرندوں کے ساتھ پروان چڑھنا	1999
گوک نان آق چیچک	بولوطلر اورتسین گونیشی	بادل سورج کو ڈھانپیں	1992
گوک نان آق چیچک	بلبل دروسی شعرلاری	دریائے بلبل کی نظمیں	2001
گوک نان آق چیچک	چوجوقلرا اولوم یاقشماز	بچوں کو موت زیب نہیں دیتی	2001

ترکی میں حروف تہجی کی تبدیلی کے بعد بھی بچوں کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کئی رسالے شائع ہوئے جن میں:

رسالے کا نام	سن اشاعت	رسالے کا نام	سن اشاعت
آتش	1930	چوجوق سسی	1932
آقا بابا	1934	یاوروترک	1836
گیلینجیک	1936	چوجوق غزتہ سی	1938
بن برو سان	1939	چوجوق روماطری	1941
چوجوق گوزو	1945	شین چوجوق	1945

دوغان قارداش	1945	قار یغا	1952
چوجوق ہفتہ سی ٹیلیبتی	1959		

ان کے علاوہ مختلف روزنامے، بینک اور اداروں کی جانب سے بھی کثیر تعداد میں بچوں کے رسالے شائع ہوتے رہے ہیں جن میں "میلیت قارداش"، "ترجمان چوجوق"، "ترکیہ چوجوق"، "حریت چوجوق"، "دیانت چوجوق" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

آج کل ترکی میں ادبیات اطفال باقاعدہ طور پر ترقی کر رہا ہے اور بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کے شائع ہونے سے پہلے وزارت تہذیب وثقافت اور وزارت قومی تعلیم وتدریس کے زیر نگرانی جانچ پڑتال ہوتی ہے تاکہ ترکی کی آنے والی نسلیں نامناسب، غیر اخلاقی اور شدت پسندی کی تحریک پیدا کرنے والے اور بچوں کی نفسیات پر منفی اثرات چھوڑنے والے خیالات وتصورات سے محفوظ رہ سکیں۔ دراصل ترکی میں بچوں کے تحفظ کے لیے ان کے لیے تحریر شدہ مواد بہت باریک بینی سے پرکھا جاتا ہے بلکہ ترکی میں ہم لوگ ہر سال 23 اپریل کو بچوں اور 19 مئی کو نوجوانوں کے دن کے طور پر مناتے ہیں۔ یہ بھی ترکی میں ہماری قوم کے مستقبل بچوں اور نوجوانوں کی اہمیت کا ظہر من الشمس ثبوت ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر جلال صوئیدان (استنبول، ترکیہ)

ناظم حکمت کی شاعری میں سامراج مخالفت

ناظم حکمت کی پیدائش کی صد سالہ برسی کے سال 2002 میں یونیسکو کی طرف سے سال ناظم حکمت کا اعلان کیا گیا تو دنیا بھر کے ارادیت پسندوں (activists) نے ترکوں کے بین الاقوامی سطح کے اہم شاعر کی یاد کو تازہ کیا۔ اس عالمی شہرت کے حامل شاعر کی مقبولیت یقیناً اس کی انسان دوستی اور عالمی سوچ کے سبب ہے۔

اس کے سیاسی افکار کی وجہ سے خود اس کی اپنی حکومت کی طرف سے اسے غدارِ وطن قرار دے کر دیس بدر کر دیا گیا۔ حالانکہ اس نے عالمی افکار و واقعات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم یا استحصال ہوا یا آزادی کی جنگ لڑی گئی وہ اپنے قلم کے ساتھ اس جہاد میں شامل رہا۔ اپنے ملک میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ جاسوس اداروں نے اس کی زندگی اجیرن بنا دی اور وہ اپنے ملک سے جدا ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ ملک سے نکالنے کے لیے اسے وطن کا باغی اور معتوب قرار دیا گیا۔ ناظم کے ایک متخصص ندیم گرسل کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ ناظم کے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی کی گئی: "ناظم کے چاہنے والے ہوں یا اس پر تنقید کرنے والے حتیٰ کہ اس کو بے خطا قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالنے والے بھی اس کو ترکی زبان کے عظیم ترین شعرا میں شمار کرنے میں ہم خیال ہیں۔"

ناظم حکمت نے دورِ شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ابتدائی کلام میں عثمانی سلطنت کے عمومی تنزل، جنگوں میں پسپائی اور وطن پر قبضہ جمانے والوں کے سبب سے ابھرنے والے قومی جذبات نے اہم جگہ پائی۔ ناظم کی ابتدائی نظموں میں قومی جذبات نے وقت کے ساتھ ساتھ مغربی توسیع پسندی کی مخالفت کی شکل اختیار کر لی اور 1922-1924 کے دوران میں روس میں اقتصادیات اور سماجیات کے شعبے میں تعلیم پانے کے سبب روسی انقلاب کو زیادہ قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ ناظم حکمت کی شاعری اور دیگر کتابوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی بنیادی خصوصیت حب الوطنی کا جذبہ اور مغربی استعمار پسندی کے خلاف بغاوت دکھائی دیتی ہے۔ ناظم حکمت کی جوانی کے ماہ و سال اناطولیہ پر مغربیوں کی یلغار کا زمانہ ہے۔ ایک طرف تو اناطولیہ پر اہلِ مغرب کے حملے اور دوسری طرف بیشتر ایشیائی اور افریقی اقوام کو استعماریت کے تحت لانے کے سبب مغربیوں کے خلاف ناظم کی نظموں میں شدید غم و غصہ کا اظہار ملتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اہلِ مغرب کی طرف سے وطن پر حملے اور نتیجتاً اس کی قومی شکست کی تذلیل

کرنے کے موضوع کو ناظم حکمت کی شاعری میں اہم جگہ ملی۔ اسی سے منسلک پورے ملک کے عوام نے جس طرح اپنی آزادی اور مادرِ وطن کے تحفظ کے لیے مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد کی۔ اس کو بھی اکثر نظموں میں پیش کیا۔ ملکی سرزمین کے تحفظ اور اس کی ناموس اور وقار کو برقرار رکھنے کے لیے قوم کے جذبات کو ابھارا۔ مگر اس کے دماغ میں محض قومی شرف اور وقار کا خیال ہی ناگزیر نہ تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے پیش نظر انسانی وقار کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا، خواہ یہ انسانی وقار دنیا کے کسی کونے میں پاؤں تلے کچلا جا رہا ہو۔ ناظم حکمت ایسی ہر حرکت کے خلاف اپنے شعروں میں آواز بلند کرتا ہے۔ وہ انسانوں کے لیے آزادی اور برابری کے تحت زندگی گزارنے کا آرزومند ہے۔ "23 سینٹ کی فوج کے متعلق" کے عنوان سے نظم میں یہ بتاتے ہیں کہ ترک فوج اس زمانے سے ظلم کے خلاف حریت کے لیے جنگ کرتی رہی کہ:

...آپ کی زبان پر ابھی کچھ واضح نہ تھے مفہوم
ظلم جیسے، حریت جیسے، بھائی چارے جیسے الفاظ کے
اس نے ظلم کے خلاف جنگ کی...

پھر اسی نظم میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام اقوام کے شرف اور وقار کو یکساں خیال کرنا ضروری ہے اور اقوام کی تذلیل استعمار پسندوں کو بہت مہنگی پڑتی ہے:

مگر حیران نہ ہو
کل یہ سودا آپ کو بہت مہنگا پڑے گا
یہ 23 سینٹ کی فوج
یعنی میری مفلس دلیر محنتی ملت
ہر ملت کی طرح عظیم ترک ملت۔

ناظم حکمت کی ابتدائی شاعری میں نظر آنے والی یہ خصوصیت وقت کے ساتھ افزوں ہو کر محض اناطولیہ کی سرزمین میں نہیں بلکہ ساری دنیا کی سرزمینوں میں امپیریلزم کے خلاف احتجاج کی آواز بن گئی۔ جس طرح ان م راشد نے "ایران میں اجنبی" اور اپنے دوسرے مجموعوں میں مشرقی اقوام کو مغربی استعماریت کے خلاف خبردار کیا اسی طرح ناظم نے بھی ترک قوم پر حملے اور قومی جنگ آزادی سے حاصل کردہ تجربات کو اسیری کے شکنجے میں گرفتار اقوام تک پہنچانے کو اپنا فرض جانا۔ یہ صورت حال اس کی شاعری کو قومی یا مقامی حدود سے نکال کر بین الاقوامی سطح کی بلند تر شاعری کے زمرے میں لا کھڑا کرتی ہے۔ ناظم حکمت کی مغربی نفوذ کے خلاف لکھی گئی نظموں میں دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی خطرے کا احساس ہوا، ان کا موضوع بن گیا۔ جب اٹلی نے مصر پر قبضہ کیا تو ناظم نے

اپنی نظم "استقلال" میں مصری بھائیوں کو جگایا اور اپنی قومی جنگ کو مثال کے طور پر پیش کیا۔ "ہم نے ان کو سمندر میں دھکیل دیا" کہتے ہوئے انھیں جوش دلاتے ہیں کہ وہ بھی ایسا کر سکتے ہیں:

یہ زرہ پوش جنگی جہاز یہ لنگر، میں خوب جانتا ہوں
میرے بھی دریاؤں میں داخل ہوئے تھے
میری بھی سرزمین میں گھس آئے تھے رات کے وقت
میرے بھی خون کے پیاسے تھے۔
چرانا چاہتے تھے میری آنکھوں کی روشنی،
میرے ہاتھوں کے ہنر۔
ہم نے ان کو دریاؤں میں دفن کر دیا
1922 کے برسوں میں۔۔۔
میرے مصری بھائی!
ہمارے گیت بھائی ہیں،
ہمارے نام بھائی ہیں،
ہماری ناداریوں کے بھائی ہیں،
ہماری تحریکوں کے بھائی ہیں۔
ہمارے شہروں میں حسین، عظیم، جاندار جو کچھ ہیں
انسان، شاہراہیں، چنار
سب تیرے ساتھ ہیں تیری جنگ میں۔
میری بستیوں میں کلام قدیم پڑھا جاتا ہے تیری زبان میں
تیری فتح کے لیے۔۔۔
مصری بھائی، میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں
استقلال کوئی بس نہیں کہ ایک سے رہ گئے تو دوسری پر چڑھ گئے!
استقلال ہماری عمر ہی کی طرح ہے
ایک دفعہ دھوکا کھایا تو لوٹ کر پھر نہیں آئی۔
مصری بھائی! تیری لہر میں ملا ہے تیرا لہو۔

انسان کا دشمن دو گنا اپنا ہو جاتا ہے
جب اپنی گلی میں، اپنے پانیوں میں اس کا لہو ملتا ہے۔
اس ملت کو بچا نہیں سمجھنا چاہیے
جو اپنے وطن کے لیے مر نہ جاتی ہو......(نومبر 1956)

ناظم حکمت مغربی استعماریت پر تنقیدی نظموں میں مختلف کہانیاں بھی بیان کرتے ہیں۔ چین اور ہندوستان کی کہانی میں دنیا کو اپنے شکنجے میں لینے کی کوشش کرتی استعماریت کی پیرس سے چین تک اپنی لمبی بانہیں پھیلا کر اور منظم طریقے سے اپنا بازو ڈالتی دکھائی دیتی ہے۔ 1930 میں "1+1=ایک" کے عنوان سے شائع ہونے والے مجموعے کی پہلی نظم کا عنوان ناظم کے استعماریت پر اظہار خیال کا خلاصہ ہے:

ازمیر سے بحیرۂ روم غرق شدہ اور بہت جلد
بمبئی سے بحر ہند میں غرق کی جانے والی امپیریلزم کی مشرق تک پھیلی ہوئی
دیوار کے بارے میں لکھی جا چکی ہے
...اس دیوار کی بنیاد کا پہلا پتھر
امپیریلزم کے پہلے قدم سے آ رہا ہے
اس دیوار کی بنیاد میں
ہمارے لوگوں کی انگلی جیسی ہڈیاں اور بھی ہو رہی ہیں
اس دیوار کا ایک سرا انگریزی کے ٹل والے زرد چین میں
دوسرا سرا فولادی بجلی والے نیویارک میں ہے
...اس دیوار کے پتھروں کو چاٹتے ہوئے
کالی قمیض والا مسولینی اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے
اٹلی کا مسیا بوٹ خون میں تیر رہا ہے
وہ دیوار دوسرے پاکستان کی مانند بلند ہو رہی ہے پاکستان میں
وہ دیوار، وہ دیوار، وہ دیوار
اس دیوار کے سائے میں ہمارے لوگوں پر گولیاں چل رہی ہیں

1932 میں چھپنے والی "بیترجی نے خود کو کیوں مارا؟" نامی مجموعے میں استعماری قوتوں کی مکاریوں اور مشرقی اقوام پر ڈھائے گئے ظلم، پولیس اور مقامی لوگوں میں سے بعض سازشیوں کی طرف سے عوام کو پھنسنے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ منظوم کہانی کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والے گروہ کے ایک ممبر بیترجی پر جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ انگریزوں کا جاسوس ہے۔ دوستوں نے بھی اس افترا پر یقین کر لیا۔ بیترجی اس کو برداشت نہ کر سکے اور اپنے آپ کو مارنے کا ارادہ کر لیا۔ شاعر اس کو باز رکھنے کے لیے کوشش تک گیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"ایک ہندوستانی کی زبان سے" کے عنوان سے نظم میں یہ بتایا ہے کہ انگریزی استعمار سے نکلنے کے لیے نبرد آزما ایک ہندوستانی اسی طرح کے تجربے سے گزرے ہوئے دوستوں سے مدد کا طلب گار ہے۔

مشرق سے آ رہا ہوں
مشرق کی صدائے بغاوت بلند کرتے ہوئے آ رہا ہوں
شمالی ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے طے کی ہیں
ایشیا کی راہیں۔ پہنچا ہوں تیرے پاس!
بڑھا دو بازو، بغل گیر ہو جاؤ مجھ سے
مشرق سے آ رہا ہوں
مشرق کی صدائے بغاوت بلند کرتے ہوئے آ رہا ہوں
مشرق کا ہوں؛ بغاوت کا حق رکھتا ہوں۔

"داستانِ قوائے ملّی" میں ترکوں کی جنگ آزادی کی ایک طویل داستان بیان کی گئی ہے۔ اس داستان میں یہ بتایا گیا ہے کہ حملہ آور قوتوں کے مقابل قومی دفاع کے لیے کتنی عظیم قربانیاں دی گئیں۔ اس کے علاوہ ملکی اور عالمی سطح پر اپنے مفادات کے لیے ضمیر فروشی کرنے والے غداروں سے بحث کی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس قسم کے غدار ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں لیکن بہر حال ان سے یقیناً حساب لیا جائے گا۔

ہم نے آگ اور غداری دیکھی
اور خونی ٹکڑوں کے بازار میں ملک کو دشمنوں کے ہاتھوں بیچنے والے
آرام سے مردوں کے اوپر سونے والے
اپنی جانیں اور اپنے سروں کو عوام کے غضب سے بچانے کے لیے

رات کی تاریکیوں میں بھاگ گئے۔
زخمی، خستہ اور بدحال تھی ملت
خونخوار زین ڈول سے نبرد آزما تھی مگر
نبرد آزما تھی بلوم ہٹنے کی خاطر دوگنہ
دوگونہ لٹنے کی خاطر
۔۔۔ اور زمیندار دشمنوں سے جا ملے
اور گائیں، بھیڑیں، بکریاں کو ہانکتے لے جاتے ہوئے
دلہنوں کی عزت سے کھیلتے ہوئے
بچوں کو قتل کرتے، استقبال کو تباہ کرتے ہوئے دشمن کو دیکھا تو لوگوں نے
ہاتھ میں تلوار، تفنگ اور بندوق پکڑ کر پہاڑ کی طرف نکل گئے
اور برف باری کی مانند بھر گئے لڑاکو گروہ
اور ہمارے ساتھ آملے حبش اور ہند کے غلام

اصل میں "داستانِ قوائے ملی" محض جنگ حریت کو بیان کرنے والی کوئی داستان نہیں بلکہ بیک وقت حقیقتوں کا تاریخی احوال بھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ استعماری قوتوں نے کس طرح کہیں توڑ مار مچا کر اور کہیں ظلم و جبر ڈھا کر اقوامِ عالم کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ پھر یہ ان کی زیادتیوں اور ظلم و جبر اور قوموں کو غلام بنانے کے رویوں کی کہانی بھی ہے۔

ناظم حکمت نے نہ صرف ایشیا میں مغربی استعماری کو موضوع بنایا بلکہ افریقہ کی صورت حال کا بھی قریب سے مطالعہ کیا۔ 1935 میں چھپنے والی کتاب "طرانتا بابو کے نام خطوط" میں مسولینی کے دور میں فنون کی تعلیم پانے کے لیے حبشستان سے روم میں آنے والے ایک نوجوان کے اپنی بیوی طرانتا بابو کے نام لکھے گئے خطوط ہیں۔ ان خطوط میں مغربی استعماریت کے علاوہ اس دور میں پھیلنے والی فاشزم کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس مجموعے میں ناظم حکمت کے سیاسی اور نظریاتی پہلو دوسرے مجموعوں کی نسبت زیادہ واضح اور نمایاں انداز میں سامنے آتے ہیں۔

افریقہ، نیوزی لینڈ کی نوآبادی:
صبح کے چار بجے ساحل کے بت نے دروازہ پیٹا
اور یہ ہے فوٹوگراف:

میرے سیاہ فام بھائی ایک زیر جامہ اور بیڑیوں سے ننگے
گلابی ہتھیلیوں والے ہاتھ گھنگھریالے بالوں والے سروں کے اوپر
دیوار کے پیچھے قطار باندھے
بالکل ہماری طرح؛
ہمارے دروازوں پر بھی رائفل کے بٹ مارے گئے
ہمارے بھی ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے پاؤں ہمارے ننگے
مگر ہمیں پر منحصر ہے
دیواروں کے پیچھے اسیر ان کر رہنا یا نہ رہنا

ناظم کی حب الوطنی اور مغرب سے مخالفت اپنے ملک تک محدود نہیں بلکہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ جہاں کہیں مغربی استعماریت اور نوآبادیاتی نظام ہے اس کی مخالفت کے لیے وہاں ناظم حکمت موجود نظر آتا ہے۔ روایتی شاعری اور عمل کے ذریعے اپنے عہد کی درندہ استعماری قوتوں کو بے نقاب کرتے رہے اور قسطائیت کی عالم گیر سازشوں کا پردہ چاک کرتے رہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر مجاہد مرزا (ماسکو، روس)

مرزا غالب اور عصر حاضر

شاعر تو علم نجوم میں درک رکھتا ہے اور نہ ہی پیش بینی کا دعویدار ہوتا ہے۔ اردو کے بھی مرزا اسداللہ خان غالب کے سے شاعر جن کے جب تک قویٰ مضمحل نہیں ہوئے تھے اور عناصر میں اعتدال باقی تھا تو انگریز حاکم نے اگر دفتر سے باہر آ کر ان کے قدم نہ لیے، وہ چلے بنا اس کی چوکھٹ سے لوٹ گئے تھے۔

البتہ جب بوڑھے ہو گئے تو رام پور کے نواب یوسف علی خان کو لکھتے ہیں کہ رمضان میں روزہ خیرات دیا کرتے ہیں اگر اس اپاہج لنگڑے کو بھی کچھ مل جائے تو چنانچہ یہ کہنا کہ مرزا غالب کو قریباً ڈیڑھ سو برس پیشتر اس بارے علم رہا ہوگا کہ اکیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے عشرے میں دنیا کس نوع کی ہوگی، سراسر جھوٹ ہوگا اور یہ کہنا مبالغہ آرائی کہ ان کے اشعار آج کے حالات پر صادق آتے ہیں۔ یقین کیجیے آپ غالب کے دو ڈھائی ہزار اردو اشعار میں سے اس عہد کی بنیاد پرستی کے خلاف جسے بنیاد پرستی کہنا شاید ویسے ہی غلط ہو کیونکہ معاملہ محض ناچ تک محدود تھا، پچاس سے زائد اشعار نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غالب روایت پرستی کے خلاف نہیں تھے، جو بنیاد پرستی کی اصل اساس ہوتی ہے۔ شاہد بازی کرنا ہو یا رندی اختیار کرنا، جوا کھیلنا ہو کہ زندیقیت اپنانا، در حقیقت روایت و رواج کے خلاف بغاوت کا اظہار ہوتے ہیں۔

بالکل نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ کسی مذہب اور خاص طور پر اردو بولنے والے مسلمانوں کے مذہب سے متعلق اپنی شاعری میں کوئی متنازعہ مضمون باندھ لیتے مگر غالب نے وحدانیت پر مبنی دو مقبول مذاہب یعنی عیسائیت اور اسلام کی فکر سے متعلق نہ صرف یک شعر کہے بلکہ انہیں مشاعروں میں پڑھا بھی جیسے:

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

یعنی موصوف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مرے ہوؤں کو زندہ کرنے والے معجزے سے استفادہ کرنے کی بجائے ان کے لب ہلتے ہی جان دے دی اور الزام اپنی ناتوانی کو یہ کہہ کر دے ڈالا کہ وہ عیسیٰ کے دم کرنے کی حریف نہ بنے۔ یا پھر جیسے

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

ان دو اشعار کے معانی وہ نکالے جسے خود پر ملحد ہونے کا فتویٰ لگوانا درکار ہو اور تشریح وہ کرے جو "دولت اسلامیہ" والوں کی ہٹ لسٹ میں درج ہونے کا متمنی ہو۔

ناصح ہر دور میں ہوا کرتے ہیں۔ وہ دوست احباب بھی ہوتے ہیں۔ اپنے تئیں خود کو کسی کا خیر خواہ خیال کرنے والے آشنا و اقربا بھی۔ ناصح تکنیکی طور پر اس شخص کو نہیں کہا جاتا جو صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی شراب نوش کو اس سے اجتناب کی نصیحت کرتا ہو بلکہ اسے کہا جاتا ہے جو شراب نوشی سے اجتناب کا الہامی حوالہ دیتے ہوئے، مے نوش کو دوزخ کی آگ سے ڈراتا ہو اور اس بناء پر ترک شراب سے متعلق پند و نصائح کرتا ہو لیکن مرزا غالب جو کہ خود زیرک اور باعلم شخص تھے اور کسی بھی متمدن و مہذب شخص کی طرح حسب مراتب کے پاسدار بھی۔ پھر انھوں نے سوچ سمجھ کر مے خواری سے ناطہ جوڑا ہوا تھا، چنانچہ فرماتے ہیں

حضرت ناصح جو آویں، دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟

غالب کو گمان تک نہیں ہو سکتا تھا کہ آج کے ناصح زبان سے نہیں بلکہ مثال دے کر نصیحت کرنے والے ہوں گے جیسے عراق کے اس خطے میں جہاں کچھ سال پیشتر بنیاد پرستوں کی عملداری رہی تھی، انیس بیس سال کے دو نوجوانوں کو سر عام روزہ توڑنے کی پاداش میں دار پر چڑھا دیا گیا تھا۔ یوں باقیوں کو نصیحت ہو گئی کہ اللہ سے ڈرو چاہے نہ ڈرو مگر ان سے ضرور ڈرو جو سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ان کے ہاتھ میں لوگوں کا سمجھانا لکھا ہے۔ سمجھانے کے لیے وہ طریقہ کونسا اختیار کرتے ہیں یہ ان کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔

ذات باری تعالیٰ سے شکوہ تو مرزا غالب بھی ہم سب کی طرح کرتے تھے مگر وہ مشیت ایزدی میں مخفی مصلحت پر جس طرح طنز فرماتے تھے یہ ان کا ہی خاصہ تھا۔ مثال کے طور پہ

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

یا پھر

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ترک رسوم سے متعلق تو انھوں نے اپنے ایک شعر میں کمال کر دیا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

جبکہ ان کے دور کی نسبت آج ڈیڑھ سو برس بعد صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ ایک جانب ترکِ رسوم فیشن بن چکا ہے۔ دوسری جانب ترکِ رسوم کے ردِ عمل میں عبادات تک رسوم کی محتاج محض بنا دی گئی ہیں۔ مساجد میں جس طرح لوگ صف باندھنے کے بعد ایک کے بعد ایک پیچھے مڑ کر ایڑیوں کے برابر ہونے اور ہونے کو دیکھتے ہیں، لیکن ایک عمومی اخلاقیات یعنی عبادتی لحظہ میں خاموشی اختیار کرنے سے کس طرح اغماض برتتے ہیں؟ اس کے تو میں اور میری طرح اکثر مسلمان گواہ ہیں۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں میں اس قسم کی حرکات یقیناً دیکھنے میں آتی ہوں گی۔ خاص طور پر قدیم مذاہب سے وابستہ عبادت گاہوں میں۔

گناہ اور ثواب کا تصور جزا و سزا کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جزا و سزا کا تصور اپنے زمانے میں بادشاہوں اور حکام سے وابستہ تھا۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ تمام مذاہب میں اعلیٰ ترین ماورائی ہستی کو بادشاہ کے خصائص سے ہی اجاگر کیا گیا ہے کہ وہ رحم کر سکتا ہے، مہربانی کر سکتا ہے، جابر ہو سکتا ہے، قہر توڑ سکتا ہے، خرید سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کی وجہ ایک بار پھر شاید یہی رہی ہو کہ تب جمہوریت اور اجتماعی قانون سازی کا تصور اجاگر نہیں ہوا تھا۔

بہر طور عالم اعلیٰ کے احکامات پر نہ چلنے کو گناہ یا جرم قرار دیا گیا اور اس کے لیے کا پابند رہنے کو ثواب یا نیک کام سمجھا گیا اسی لیے غالب گناہ، جو بذات خود بغاوت اور زنجیر شکنی ہے، کی لذت کے محدود کیے جانے پر شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

پھر فوراً ہی شاید ڈر کر یا عقل بچہ ہونے کی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

اور لجاجت کے ساتھ مگر اپنی بات پر ڈٹے ہوئے فرماتے ہیں

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بلکہ

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

دوسری جانب غالب بنیاد پرستوں کے ساتھ جنگ پر آمادہ رہنے کا شریفانہ اظہار بھی کرتے تھے

نہ لڑ ناصح سے غالب، کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

یعنی وہ اس زمانے میں بھی جب مغل بادشاہت تمام ہو چکی تھی۔ 1857 کی جنگ آزادی یا غدر جو چاہے کہہ لو کہ اس سے اب کوئی فرق پڑنے والا نہیں، اپنی تمام تر بیرو دستیوں کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ چالاک اور زیرک بظاہر مکار مغربی طاقت کا غلبہ ہو چکا تھا، انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اور ان جیسے بہت سے اس بدی کی اساس سے الجھ سکتے ہیں، چنانچہ ان کو بھی تسلی تھی کہ ہمارا بھی زور بس گریبان تک ہی محدود ہے اگرچہ ان کا دعویٰ تھا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ بات نہیں کہ غالب مادہ پرست تھے یا خدا نخواستہ ان کی رسائی کسی مذہب مخالف تحریک تک ہو گئی تھی جو وہ آج کے الحاد پرستوں کی طرح مذہب کے خلاف لڑائی یا مذہب سے وابستہ اعمال و افعال کی ہرزہ سرائی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے۔ وہ دراصل مذہب کے بارے میں اس فہم کے خلاف تھے جو کم علم مذہبی اہلکاروں نے عوام میں عام کی تھی اور عام کی ہوئی ہے۔ بیشتر علما بھی عام موجود جبر کو چیلنج نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنی دکان داری کرتے ہوئے اسی دھرم کو قبول کر لیا کرتے جو رائج تھی۔ جو ایک دو اہل نظر مذہبیات شناس تھے بھی ان کی کہی بات اول تو آج ہی کی طرح کسی کے پلے نہ پڑا کرتی تھی اگر کسی نے کسی حد تک کچھ بھی لیا تو وہ سارے ماحول کے ڈر کے نعوذ باللہ پڑھ کر خود کو دوزخ کی آگ سے محفوظ بنانے میں عافیت سمجھتا تھا چنانچہ غالب کہنے پر مجبور ہو گئے تھے

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پھر مرزا اسد اللہ خان غالب کو یقین تھا کہ ان کے کلام کا جو معیار ہے وہ اس قدر بلند ہے کہ اس کی تعریف ما فوق الانسان کی جانب سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں

پاتا ہوں اس سے داد میں اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں ہے

یا پھر

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

انھیں بھی مابعد الطبیعات کے اسرار یا جنھیں مصلحت خداوندی کا نام دیا جاتا ہے، ہم تمام انسانوں کی طرح سمجھ نہیں آتی تھیں۔ جیسے کہ ایک وقت میں اللہ کے حکم پر تمام فرشتوں نے پہلے تخلیق کردہ انسان آدم کو سجدہ تک کیا، صرف ایک ابلیس تھا جس نے انکار کیا۔ اس کے انکار سے متعلق کلام الٰہی میں جواز پیش کیا گیا ہے کہ وہ جن تھا اس لیے منکر ہو گیا یعنی وہ عبادات کی بنا پر جن سے ترقی پا کر فرشتوں کی صف میں شامل ہوا تھا مطلب یہ کہ اس کے پاس فرشتوں کی نسبت جو حکم ماننے کے علاوہ کوئی اور کام اپنی مرضی سے نہیں کرتے، شعور تھا جیسے ایک اور مخلوق انسان کو دیا جانا مقصود تھا۔ مگر دوسری جانب غالب دنیا میں انسان کو مجبور و مقہور دیکھتے تھے چنانچہ چیخ ہو کر کہتے تھے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

یہاں غالب سے غلطی ہو گئی کہ وہ یہ نہ جان پائے کہ انجیل اور زبور کے برخلاف قرآن پاک میں ابلیس کو اپ گریڈ بنایا گیا ہے وہ اپنی اساس میں فرشتہ نہیں تھا۔ بہرحال انھوں نے خدا سے جو گلہ کرنا تھا وہ کر دیا۔
ان کے مندرجہ اشعار پڑھ کر آج فرقوں میں جدال ہو جائے

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پس ثابت ہوتا ہے کہ غالب ایک ایسے شاعر اور انسان تھے جن کی سوچ سیکولر تھی اور جو چاہتے تھے کہ انسان انسانوں کی طرح زندگی بسر کرے۔ انسان باشعور اشرف المخلوقات کا نام ہے جو تضاد کو دلیل سے ثابت کرتا ہے اور تضاد سے پیدا ہونے والے جھگڑے کو بات چیت اور منطق سے حل کرتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ مخالفین کو مار دینے سے کدورتیں کم نہیں ہو سکتیں۔ سارے مخالف مار بھی دیے جائیں تب بھی اختلاف کرنے والے پیدا ہو جائیں گے اور غلامی سے نجات کے لیے علم بغاوت بلند کریں گے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ابرار رحمانی (نئی دہلی؛ بھارت)

باقی اور جہانِ باقی

جہانِ باقی دراصل باقی احمد پوری کے اب تک کے گیارہ مجموعہ ہائے کلام کا انتخاب ہے جسے ڈاکٹر افروز عالم نے بڑی ہی محنت اور دیدہ ریزی سے انجام دیا ہے لیکن آج میرا دل چاہتا ہے کہ یہاں غزل سے متعلق کچھ تلخ و شیریں احساسات کا اظہار کروں۔ غزل دنیا کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ اب غزلوں کو صرف اردو والے یا پاکستان ہی نہیں سنتے ہیں یا پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں بلکہ اب اس کا دائرہ مختلف ممالک کی مختلف زبانوں تک پھیل چکا ہے۔ حالانکہ غزل جتنی مقبول رہی ہے اتنی ہی معتوب اور مطعون رہی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ غزل کی مخالفت کرنے والے بھی پہلے اسے شوق سے سنتے ہیں، محظوظ ہوتے ہیں اور پھر اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ غزلیں زیادہ تر مشاعروں کے ذریعے سامعین تک پہنچتی ہیں اور مشاعروں میں غزل کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کی وجہ سے دن بدن غزل سوقیانہ ہوتی جارہی ہے۔

آج اکثر شاعر مشاعرے میں ٹکے رہنے کے لیے ترنم کا سہارا لیتے ہیں اور جو ترنم سے نہیں پڑھ سکتے وہ ایکٹنگ کا سہارا لیتے ہیں۔ اس سے بھی اگر بات نہیں بنتی تو گداگری کرتے ہیں۔ یہ صرف چھوٹے موٹے شاعر ہی نہیں بڑے اور مشاعرہ باز شاعر بھی کھلے عام داد کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں اور سامعین تالیاں بجاکر انھیں داد سے نوازتے رہتے ہیں۔ مشاعرے کی تہذیب ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ہمارے بزرگوں نے مشاعرے کا جو ماحول بنایا تھا اس میں تعریف کی جگہ سبحان اللہ اور ماشاءاللہ ہوا کرتا تھا یا پھر مکرر ارشاد کافی ہوتا تھا۔ تالی بجانے جیسی عامیانہ حرکت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسے انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ برصغیر ہندو پاک میں اس طرح کے ترنم باز، ایکٹر اور گداگر قسم کے شاعر بہت پائے جاتے ہیں۔

آج غزل کو عالمی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اب غزل صرف اردو غزل یا ہندی غزل (معاف کریں گے ہندی والے ایسے ہی بولتے ہیں) تک محدود نہیں بلکہ اس کا ترجمہ کرکے دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں بھی اسے پڑھا اور سمجھا جارہا ہے۔ اور پھر کوئی اچھا غزل گو اسے اپنے رنگ و آہنگ سے آراستہ و پیراستہ کرکے دو آتشہ بنادیتا ہے۔ چنانچہ شائقین اب بھی کانوں پر اچھی غزلوں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ باقی احمد پوری کا جہانِ باقی اس وقت میرے سامنے ہے۔ ضخیم ہے۔ اسے بڑے ہی اہتمام کے ساتھ

شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اسلاً دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں 8 مضامین ہیں جو ظاہر ہے نثر میں ہیں۔ اور جو باب تحسین و تعریف کا حکم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایک شریف انسان دوسرے شریف انسان کی تعریف و تحسین ہی کرے گا سو یہاں بھی ہمیں بدرجہ اتم یہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

444 صفحات پر مشتمل اس ضخیم اور دیدہ زیب شعری مجموعے میں 222 منتخب غزلیں ہیں۔ واضح ہو کہ اس انتخاب سے پہلے باقی احمد پوری کے بارہ شعری مجموعے چھپ کر شائقین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان بارہ شعری مجموعوں کو شاید خاطر خواہ پذیرائی ملی ہے تبھی تو شاعر نے کچھ بعد دیگر بارہ مجموعے شائع کیے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شاعر کا تعلق پاکستان سے ہے جہاں اردو سرکاری زبان ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکاری زبان کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوگی ہی۔ اس کے باوجود ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بیشتر شعری مجموعے فروخت نہیں ہوتے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان میں کوئی تفریق نہیں۔ آج بھی ہند و پاک کے اردو بازار میں میر، غالب اور اقبال کا ہی سکہ چلتا ہے۔ بہت ہوا تو فیض، ناصر کاظمی، احمد فراز اور پروین شاکر پر نظر ڈال لی جاتی ہے۔

باقی احمد پوری نے ایک صحرائی عرب ملک کویت میں غم روزگار کا بار اٹھانے کے لیے آج سے چوبیس سال پہلے وہ پاکستان سے کویت پہنچے۔ ایسا لگتا ہے گویا اب وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کا رزق جہاں کا لکھا ہوتا ہے وہیں اسے ملتا ہے۔ فطرت کا اشارہ پہچاننا کامیابی کی ضمانت ہے۔

خیر! میں نے پہلے ہی آپ کو بتایا کہ زیر نظر کتاب جو باقی احمد پوری کے بارہ شعری مجموعوں کا جامع انتخاب ہے۔ حالانکہ اسے ہم کوئی کارنامہ سے تعبیر نہیں کر سکتے لیکن بہرحال ایک کام تو ہے ہی۔ اس کتاب کے مرتب نے شروع میں ہی گذارشات کے تحت کتاب کی اشاعت کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ افروز عالم بھی پچھلے بیس برسوں سے اس صحرا کو گلزار بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اب ان کو جتنا کویت کے بارے میں معلومات ہے اتنا اپنے وطن مالوف کے بارے میں بھی شاید پتہ نہ ہو۔ ان کا صرف ایک جملہ ملاحظہ کریں، فرماتے ہیں کہ کویت کی قومی زبان عربی ہے۔ دفاتر میں انگریزی کا بول بالا ہے جب کہ بازاروں میں اردو کی دھوم ہے۔ یہ بات اب جگ ظاہر ہو چکی ہے۔

خیر اب یہ دیکھیے کہ ذکر ہو رہا تھا جہان باقی کا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ گویا ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا، بات پہنچی تیری جوانی تک۔ تو معزز قارئین! اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں اور اس سے پہلے کہ میں پھر سے بھٹک جاؤں آیئے، ہم جلدی سے جہان باقی کے اشعار پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔

زیر نظر انتخاب میں 222 غزلیں ہیں اور ان میں سے بیشتر غزلیں دو صفحات پر بسیط ہیں۔ اور ان میں

ہے ہر غزل میں ایک آدھ شعر تو ایسے ضرور ہیں جنھیں ہم اچھا کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کم از کم 222 اشعار تو چھانٹ ہی سکتے ہیں۔ جن پر اپنی رائے دے سکیں لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ چند اشعار دیکھیں

ساری بستی میں فقط میرا ہی گھر ہے بے چراغ
تیرگی سے آپ کو میرا پتہ مل جائے گا

☆☆☆

تم نے محلوں کے علاوہ نہیں دیکھا کچھ بھی
ہم تو فٹ پاتھ پہ سولیں گے ہمارا کیا ہے

☆☆☆

تو نے بھی موسموں کی پذیرائی چھوڑ دی
اب شوق ماہ و سال مجھے بھی نہیں رہا

☆☆☆

مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی پریشان تھا بہت
جس کی نظر میں کام یہ آسان تھا بہت

بنیادی طور پر ہر غزل گو شاعر عشق و عاشقی کا شاعر ہوتا ہے۔ اور غزل کی شاعری میں عشق و محبت، زلف و رخسار کی باتیں ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن آج کی غزل میں چند ایسے جیالے بھی ہیں جو غزل کی عشقیہ شاعری کو بھی جدت و ندرت سے آراستہ و پیراستہ کرتے رہتے ہیں۔ بے شک باقی صاحب نے بھی غزل کی اس خوبی کو بخوبی نبھایا ہے

ترے جمال کی جب بات کرنے لگتے ہیں
خیال و فکر میں سو رنگ بھرنے لگتے ہیں
ترے بغیر کہاں زندگی میں جوش و خروش
جو تو نہ ہو تو سمندر اترنے لگتے ہیں

لیکن جدید غزل میں غزل سے متعلق شعرا کے انداز بدلے ہیں اب شعرا زندگی کے سرد و گرم پر نظر رکھتے ہیں۔ باقی احمد پوری بھی اس صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں اور اس کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتے ہیں

باقی ہمیں تو فرصت امروز بھی نہیں
کل کیا کریں گے اس کا ارادہ نہیں کیا

حق بات پہ کیا زہر کا وہ جام پئیں گے
اک ساغر سے بھی جنھیں پینا نہیں آیا

باقی احمد پوری غزل میں عشق و محبت، زلف و رخسار کی باتوں کے والہانہ اظہار پہ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

پی لی ہے غم عشق سے گھبرا کے ذرا سی
اب گردش حالات کو آواز دے دینا

☆☆☆

یہی تو عشق میں ہوتا ہے جو ہوا باقی
شکست دل کا سبب چشم تر سے کیا پوچھیں

☆☆☆

عشق میں جاں سے جاں ملاتے ہیں
عشق میں اس و آں نہیں ہوتی

☆☆☆

تم ترک محبت کی قسم کھا تو رہے ہو
دیکھیں گے کہ ہم دل سے اتر جاتے ہیں کیسے

☆☆☆

جہاں بھی گیا ہوں زمانے میں باقی
مرا خیر مقدم ہوا والہانہ

☆☆☆

محبت ہے مسلک، غزل ہے بہانہ
ہے رنگ سخن بھی ذرا عاشقانہ

غزل سے متعلق اپنے نظریے کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ جن سے ان کے رنگ سخن کا پتہ چلتا ہے۔ جو والہانہ باقی صاحب کے خیر مقدم کا بہانہ بن جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ والہانہ کا لفظ شاعری میں میرے موقف کی بہتر ترجمانی کرتا ہے۔ شاعری کو بالخصوص غزل کو شاعرانہ عاشقانہ اور والہانہ ہی ہونا چاہیے۔ اکثر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ جہاں شاعر اپنی علمیت کا رعب و دبدبہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے وہاں شاعری کا عنصر

یکسر مفقود ہو جاتا ہے۔ شاعری کا ظاہر جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاعری کو فنونِ لطیفہ میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو عطائے ربی ہے جسے مل جائے اسے مل جائے۔

غزل گوئی اور سخن فہمی یہ ایک شاعر کے لیے گویا مرصع سازی اور سامع کے لیے پارکھی کا کام ہے اور جو اس راز کو پاجاتا ہے وہ اس میدان میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ بلاشبہ اس میدان میں انھیں دسترس حاصل ہے۔ تشبیہات و استعارات کے جگنو رات کے اندھیرے میں ستاروں کے مانند ہمارے قریب ٹمٹماتے ہیں تو ہمیں ایک گونہ اطمینان بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی

ساری بستی میں فقط میرا ہی گھر ہے بے چراغ
تیرگی سے آپ کو میرا پتہ مل جائے گا

☆☆☆

خوفِ تاریکی حیات نہیں
اشک روشن ہیں قمقموں کی طرح
اب بھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم میں بیتے ہوئے دنوں کی طرح

☆☆☆

میں اک شاعر ہوں دوانہ ہوں باقی
مری باتوں میں کیا رکھا ہوا ہے

☆☆☆

رہنے دو مجھے اپنے تصور ہی میں باقی
میں لفظ بنوں گا تو سنائی نہیں دوں گا

غرض باقی احمد پوری کے شعری ذخیرے پہ ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کے کلام میں جابجا ایسے خوب صورت اور معنی خیز اشعار مل جاتے ہیں جو غزل کے روایتی حسن کو برقرار رکھتے ہیں اور جن سے انھیں آفاقیت حاصل ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

محمد معروف شاہ (گاندربل: جموں وکشمیر)

غنی کا استغنا: مفتی مدثر کے ترجمے آتش طور کے حوالے سے

استغنا کی اسلامی صوفیانہ و اخلاقی روایت میں اہمیت مسلم ہے۔ اس کے اعلیٰ معیار پر خاص الخاص لوگ ہی اترتے ہیں۔ شعرا میں بالخصوص اور کم۔ ایسے علاقے اور اقوام جو غلام ہوتے ہیں وہاں اور بھی کم۔ اہل کشمیر کو اس سلسلے میں امتیاز حاصل ہے کہ اس نے بڑے شعرا میں سے ایسے اہم نام پیدا کیے جو استغنا کے پہاڑ تھے۔ ان میں ملا طاہر غنی کا نام سرفہرست ذہن میں آتا ہے۔

لگتا ہے کہ غنی نے استغنا کی وضع اس دنیا میں بھی قائم رکھی۔ اتنا بڑا شاعر اور آج تک اس کا دیوان اردو میں ترجمہ نہ ہو سکا تھا اور عام کشمیری کی سیرابی کریں۔ اہل علم بھی ان سے سرسری واقفیت ہی رکھتے ہیں۔ وجہ فارسی زبان سے عدم واقفیت اور تراجم کا فقدان۔

مفتی مدثر فاروقی کی بدولت اب عام کشمیری اور اردو دان طبقہ کی پچھلی سات صدیوں کے سب سے بڑے کشمیری الاصل شاعر کے کلام تک رسائی ممکن بن گئی ہے۔ آج ہم غنی کے اس ترجمہ آتش طور سے استغنا کے موضوع پر چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم میں سے کون کہاں کھڑا ہے اور کتنے ناکام۔ اگر فقر و استغنا، ذہنی و روحانی آزادی، من و تو پالوگی کی اسیری سے رہائی، علو ہمتی، دو عالم سے ماورائیت، سادگی، اخلاقی و روحانی عظمت کی دلیل ہیں تو غنی کی عظمت کا کون نہیں معترف ہوگا۔ آج ان کی فنی عظمت کا کون معترف نہیں لیکن ان کی اخلاقی و روحانی عظمت کو یاد کرنا اس وقت جب قوم کے سامنے مثالی کردار کمیاب ہیں، ضروری ہے۔

غنی اگرچہ فقیر است ہمتی دارد
فشاندہ است بکونین دست خالی را

غنی اگرچہ فقیر ہے مگر ہمت والا ہے اس لیے اس نے اپنے خالی ہاتھوں کو دو جہاں سے جھاڑ دیا ہے۔

در فقر بے چنیں نبود آشنای
نشست غیر گرد کسی در سرای ما

فقیری میں میرا دوست کوئی نہ رہا۔ سوائے گرد و غبار کے میرے گھر کوئی نہ بیٹھا۔

غنی چرا صلهٔ شعر از کسی گیرد
همین بس است که شعرش گرفت عالم را

غنی کیوں اپنے شعروں کا صلہ کسی سے لے؟ یہ کافی ہے کہ اس کے شعروں نے دنیا کو تھام لیا ہے۔

آزاده ام ز قید زمین چون نهالِ شمع
بردم فرو بآب و گل خویش ریشه را

میں شمع کے پودے کی طرح زمین کی قید سے آزاد ہوں۔ میں اپنی ہی مٹی سے اپنا سامان عیش پیدا کر لیتا ہوں۔

ز شرم انگشت دارد در دهان طفل
سر پستان گرفتن هم گدائی است

بچہ شرمندہ ہو کر انگوٹھا چوستا ہے۔ پستان منہ میں لینا بھی گدائی ہے۔

غنی از ننگ نام زر نگیرد
که نام زر گرفتن هم گدائی است

غنی۔ میں شرم سے دولت کا نام بھی نہ لوں۔ دولت کا نام لینا بھی گدائی ہے۔

آسوده ام از گرمی خورشید قیامت
کز لطف تو بر نامه سیه سایه نشین است

میں قیامت کے آفتاب کی گرمی سے بے فکر ہوں کیونکہ تمھارے لطف سے میرے عمل کا ہر دفتر سایہ نشین ہے۔

روشن بقناعت شود آئینهٔ باطن
ماهی که دل افروز بود نان جوین است

باطن کا آئینہ قناعت سے روشن رہتا ہے۔ جو کی روٹی ہی دل کو منور کرنے والا چاند بن جاتی ہے۔

بر نداریم ز اشعار کسی مضمون را
طبع نازک نتواند سخن کس برداشت

میں کسی کے اشعار سے مضمون نہیں اٹھاتا۔ نازک طبع انسان اوروں کی باتیں برداشت نہیں کرتا۔

زجا کی میبرد آشوب گیتی خاکساران را
کجا در اضطراب از باد موج بوریا افتد

زمانے کے اتار چڑھاؤ خاکساروں کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ آندھی موج بوریا کو اضطراب میں نہیں لا سکتی۔

تا چشم دوختم ز جہان بیشتر فزود
سوزن برای دیدۂ من میل سرمہ بود

جب سے میں نے دنیا سے آنکھیں بند کر لیں میری بینائی تیز ہو گئی۔ سوئی میری آنکھوں کے لیے سرمے کی سلائی ثابت ہوئی۔

علو ہمتم کی آتش از ہمسایہ میخواہد
بنان خویش سازد گرم چون گردون گہ خود

میری ہمت عالی پڑوسی سے آگ کیسے مانگ سکتی ہے؟ آسمان کی طرح وہ اپنا تنور اپنی ہی روٹی سے گرماتی ہے۔

گسست بند دنیا و آخرت کارم
گذشتہ ام ز میان دو خانہ راست چو تیر

میرا کام دنیا اور آخرت کی بندشوں سے آزاد ہے۔ میں دونوں خانوں سے تیر کی طرح سیدھا نکل گیا ہوں۔

از نم احسان کس دست طلب را تر مکن
آبرو خواہی بنان خشک چون آئینہ ساز

کسی کے احسان کی نمی سے اپنا ہاتھ بھیگا مت کرو۔ آبرو چاہتے ہو تو آئینے کی خشک روٹی کی عادت ڈال دو۔

دنیا بزرگ باشد در دیدۂ غلط بین
اندک بچشم احول بسیار می نماید

غلط دیکھنے والے کو دنیا بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ بھینگی آنکھ کو تھوڑا بھی زیادہ نظر آتا ہے۔

در بیابان توکل توشہ درکار نیست
زاد این رہ دانۂ دل بس بود ہمچون جرس

توکل کے بیابان میں توشے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گھنٹی کی طرح دانۂ دل ہی اس سفر کا زاد راہ ہے۔

آزار جان حیات دہد بیشتر ز مرگ
ثابت ز زندگی بکشم شکوہ سر ز مرگ

زندگی موت سے زیادہ آزار دیتی ہے۔ جیتے جی میں نے کبھی موت کا شکوہ نہیں کیا۔

خاکساران از بلای آسمانی ایمن اند
ماہی زیر زمین را کس نمی آرد بدام

خاکسار آسمانی ہواؤں سے بچے رہتے ہیں۔ کوئی بھی زیر زمین مچھلی کو جال میں نہیں پکڑ سکتا۔

باشد تماشا دیگر در عالم تجرد
هرکس که گشت عریان در پیرهن نگنجد

تجرد میں ایک الگ ہی سرور حاصل ہوتا ہے۔ جو برہنہ ہو جائے پیرہن میں نہیں سماتا۔

ای دل آگاه شبها پاسبان خویش باش
یک نفس غافل مشو خود که خوابت میبرد

اے دلِ آگاہ، راتوں کو اپنی پاسبانی کرتا رہ۔ دم بھر کے لیے بھی غافل نہ ہو کہ نیند تمہیں اچک نہ لے۔

ندارند از توکل آگهی چون آسیا مردم
اگر یک گرد خود گردند زاد راه میخواهند

چکی کی مانند لوگ توکل کے نکتے سے محروم ہیں۔ وہ اپنے گرد گھومنے کے لیے بھی زادِ راہ ڈھونڈتے ہیں۔

بسکه چون آسیا می نالم از بیداد خویش
می کشم در گوش خود انگشت از فریاد خویش

چکی کی طرح میں اپنے ہی ظلم وستم سے آہ و فغاں کر رہا ہوں اور اپنی فریاد سے بچنے کے لیے کان
میں انگلی ڈالے ہوئے ہوں۔

هر کس کشیده آرزوی خویش در کنار
من دست خویش در بغل خود کشیده ام

ہر شخص اپنی آرزو سے چمٹا بیٹھا ہے مگر میں نے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں کھینچ لیا ہے۔

میکشان گر زنده میدارند شبها دور نیست
کم ز آب زندگی نبود شراب خوشگوار

شراب خوشگوار آبِ حیات سے کم نہیں۔ عجب نہیں اگر شراب میں مست لوگ راتوں کو بیدار رہیں۔

گر روی آب رفتن آرزو داری غنی
زیر پای اهل دل افتاده چون سجاده باش

غنی! اگر پانی پر چلنے کی آرزو رکھتے ہو تو مصلّے کی طرح اہلِ دل کے قدموں تلے بچھ جاؤ۔

نه دار آخرت نی دار دنیا در نظر دارم
ز غفلت کار چون منصور با دار دگر دارم

خدایا آخرت اور دنیا دار دنیا پا جاتا ہوں۔ منصور کی طرح میں ایک الگ ہی دار پا جاتا ہوں۔

سر بچو تار سجہ بصد در کشیدہ ام
آخر رسیدہ ام بخود و آرمیدہ ام

(تسبیح کے دھاگے کی طرح میں سو دروازوں سے گزرا۔ آخر خود تک پہنچا اور سکون حاصل کرلیا۔)

یہ سب اشعار حکمت انسانی کا وہ تصور پیش کرتے ہیں جو ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے لیے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ شعرا ہی نہیں سب داد کے بھکاری اور سوداگر ہیں۔ انعامات کے لیے lobbying گھروں میں ہزار برس کے لیے سامان اکٹھا کرنے کی دوڑ۔ مساجد میں جنت اور دوزخ کے جغرافیہ اور اس تعلق سے ثواب و گناہ کے calculus کا تذکرہ زیادہ اور خود آگاہی و عرفان و محبت و لطف و رحمت ایزدی کا برائے نام ہی ذکر۔ سادگی و کفایت شعاری ("جو کی روٹی") پر مشتمل معاشی اور معاشرتی سماج کی تعلیمات سے بے اعتنائی۔ خوشامد اور سفارش کا گھر۔ روز گاڑیاں بدلنے کی لت۔ سماجی رابطے کی sites کا عزت نفس کی پامالی (ذاتی تشہیر) کے لیے مضحکہ خیز استعمال۔ یہ بیجا ٹھاٹ باٹ۔ غنی اگر آج زندہ ہوتے تو اپنی جھونپڑی ہی میں قید ہونا پسند کرتے۔

استغنا تصوف کا جوہر ہے اور وہ اخلاقی کرامت جس پر سارے سری فلسفے ناز کرتے ہیں یہ انسانی حریت کی بڑی سند ہے۔ غنی ان معنوں میں غنی تھے جو اولیا سے مطلوب ہے اور آج کے امرا اس امیروں کے میر اور شاہوں کے شاہ کے مقابلے میں کس قطار کے۔ اقبال اسی فقر کے داعی تھے۔ اگر یہ فقر آج پیدا ہو تو 1980 سے پہلے کا اندراج جہاں جیسے بڑے لوگ تصور کے بھی نہ تھے ہمارے لیے نمونہ ہوگا۔ ساری معاشرہ میں روح کی تونگری کہاں اور غنی جیسے لوگ کہاں۔

غنی میں استغنا جیسے اور کتنے لولوئے لالا ہیں جن کی غواصی اس ترجمہ اور مختصر شرح کی بدولت اردو سے واقف طبقہ کرسکتا ہے۔ اس شرح سے عام قاری کے غنی کے کلام اور ان کی زندگی کے متعلق تقریباً تمام سوالات و شبہات کا ازالہ ممکن ہے۔ اس مکمل ترجمہ اور شرح کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کا اہتمام جتنا جلد ہوسکے بہتر ہے۔ کشمیری گھر ہو اور اس میں دیوان غنی نہ ہو محرومی اور کور ذوقی ہے۔ غنی کے کچھ اشعار ہر باذوق گھر میں تبرکاً فریم کرکے رکھے جاتے تو نئی نسل کو اسلاف اور اپنی شاعری کی پہچان میں مدد ملتی۔ دیوان حافظ، مثنوی معنوی، گلستان اور بوستان کی طرح ہر باذوق گھر میں کشمیری صوفی شاعری کا انتخاب اور دیوان غنی سے کتب خانے مزین ہوتے تو دل و دماغ کی تربیت اور بہتر ہوتی۔ ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے اور عام قاری کے لیے مشکل الفاظ کے معنی اور اشعار کی مختصر و دلنشین شرح اردو ادب اور نقد غنی کے خزانے میں اہم اضافہ ہے۔

☆☆☆☆

عرفان ستار (کینیڈا)

مراسم کی ضرورت خندہ پیشانی کہاں تک ہے؟
رویوں کی اذیت ناک یکسانی کہاں تک ہے؟

ذرا آنسو رکیں تو میں بھی دیکھوں اس کی آنکھوں میں
ندامت کس قدر ہے، اور پشیمانی کہاں تک ہے؟

نجانے انکشافِ ذات سے خود مجھ پہ کیا گزرے؟
کسے معلوم تابِ چشمِ حیرانی کہاں تک ہے؟

کہیں تو جا کے رکنے گا ترا کارِ جہاں بانی؟
کبھی تُو بھی تو دیکھے گا کہ ویرانی کہاں تک ہے؟

کبھی تو چند لمحے خود سے باہر بھی بسر کرلوں
ذرا دیکھوں تو وحشت کی فراوانی کہاں تک ہے؟

کسے معلوم بعد از باریابی کیا تماشا ہو؟
خبر کیا نارسائی کی یہ آسانی کہاں تک ہے؟

کبھی وہ بے محابا ملے تو پھر کھلے مجھ پہ
کہ میرے بس میں آخر دل کی جولانی کہاں تک ہے؟

تلاطم خیزی، خواہش نہ تھی اس کے تخاطب میں
مگر آنکھیں بتاتی تھیں کہ طغیانی کہاں تک ہے؟

کہاں تک دل کو میں اس یاد پہ مامور رکھوں گا؟
مرے ذمے ترے غم کی نگہبانی کہاں تک ہے؟

رفوگر، میں تو شہرِ عشق سے باہر نہیں جاتا
میں کیا جانوں کہ رسمِ چاک دامانی کہاں تک ہے؟

خالد خواجہ (امریکہ)

زمانے بعد کوئی زخم ڈر نہیں لایا
میں آج ایک بھی غم ساتھ گھر نہیں لایا

سنا ہے اس نے لکھا ہے نیا سفرنامہ
جو اپنا جسم سر رہگزر نہیں لایا

میں ڈاکوؤں کی امارت کا ذمہ دار نہیں
یہ سوچ کر ہی میں زادِ سفر نہیں لایا

وہ روشنی کا تہیہ کیا ، پہ اب کی بار
چلو میں اپنے ساتھ کوئی سحر نہیں لایا

وہ طمطراق سے پندار لے کے آیا تھا
مگر یہ جنس وہ بارِ دگر نہیں لایا

سو جشن کیسے مناؤں حصولِ منزل کا
میں اپنے ساتھ کوئی ہمسفر نہیں لایا

پلٹ کے آئے ہیں احباب کتنے خالد جی
وطن سے ایک بھی اچھی خبر نہیں لایا

ڈاکٹر افروز عالم (سعودی عرب)

شمس معدوم ہے، تاروں میں ضیا ہے تو سہی
چاندنی رات میں مدمست ہوا ہے تو سہی
لوٹ آئی ہوئی لہروں سے گفتگو کرتے
کوئی امید کے ساحل پہ کھڑا ہے تو سہی
خواہش عشق کی تکمیل کہاں ہوتی ہے
گرچہ وہ شوخ نہیں شوخ نما ہے تو سہی
آنچیں جاگ کے تاریخ کو دستک دیں گی
اس کے سینے میں ایک زخم ہرا ہے تو سہی
صبح کی راہ میں ظلمات کے سنگ آتے ہیں
میں نے ہر سنگ کو ٹھوکر پہ رکھا ہے تو سہی
ہاں اسی عقدے سے الجھا ہے تخیل کا شعور
"ایک الجھا ہوا ہاتھوں میں سرا ہے تو سہی"
جنبش لب سے مرے دار پہ سر آتے ہیں
پھر بھی کچھ راز فضاؤں میں کھلا ہے تو سہی
گرچہ میں ہادی و رہبر نہیں ہوں عالم کا
پھر بھی ہاتھوں میں مرے ایک عصا ہے تو سہی

☆☆☆☆

نجمہ عثمان (برطانیہ)

کبھی صندل ، کبھی کاجل رہی ہوں
میں ہر موسم کا گہرا پل رہی ہوں

گھڑی کی سوئی تھک کر رک گئی ہے
میں جذبوں کے سہارے چل رہی ہوں

جسے پہچان کر انجان سی ہوں اب
کبھی اس کے لیے پاگل رہی ہوں

نمو کی ایک ہی صورت ہے مجھ میں
پرانے موسموں میں ڈھل رہی ہوں

ابھی نکلی ہوں خوابوں کے فسوں سے
ابھی جاگی ہوں، آنکھیں مل رہی ہوں

کسی دن گوہر نایاب ہوں گی
ابھی اشکوں کی صورت ڈھل رہی ہوں

محبت کے ہیں کتنے روپ مجھ میں
میں اک ست رنگیا آنچل رہی ہوں

رفیع رضا (کینیڈا)

سمجھ رہی ہے جو دُنیا، نہیں سمجھتا مَیں
مگر کسی کو بھی جھوٹا نہیں سمجھتا مَیں

جہاد کرتا ہُوں اپنے قلم کے ساتھ مگر
کسی دلیل کو جھگڑا نہیں سمجھتا مَیں

یہ درمیان کا پردہ ہے جب اُٹھے سو اُٹھے
اسے بس آنکھ کا پردہ نہیں سمجھتا مَیں

بس ایک بات تُمھاری مجھے پسند نہیں
تُمھارے ہجر کو اچھا نہیں سمجھتا مَیں

تُمھارے جانے سے کچھ اور تو نہیں ہوتا
بس اپنے آپ کو پُورا نہیں سمجھتا مَیں

دُعائے وصل کو پڑھ کر پھُونکتا ہُوں آنکھوں پہ
کہاں ہے کونسا موقع، نہیں سمجھتا مَیں

جلا ہُوں آپ تو پھر یہ زبان سیکھی ہے
کسی چراغ کو گونگا نہیں سمجھتا مَیں

شہباز خواجہ (برطانیہ)

خواب اور خواہشات بہم ہو نہیں رہے
دنیا! ہم ایک دوجے میں ضم ہو نہیں رہے

ہونا تو چاہتے ہیں سرِ بزمِ ہست و بُود
اے مالکِ وجود و عدم! ہو نہیں رہے

اپنا مکالمہ بھی کسی غیر سے نہیں
اور خود سے ہم کلام بھی ہم ہو نہیں رہے

سینہ بہ سینہ ہوتے رہیں گے بیان ہم
وہ سانحات ہیں کہ رقم ہو نہیں رہے

آنکھیں ہماری دیکھیے روشن ازل سے ہیں
شانے ہمارے دیکھیے خم ہو نہیں رہے

اک آگ میں ہیں آگ بھی یعنی فنا کی آگ
اس آگ میں بھی سوختہ دم ہو نہیں رہے

ہم کون نقش ہیں؟ یہ ہوا پوچھتی پھرے
ہم کس دیے کی لو ہیں جو کم ہو نہیں رہے؟

جمیل قمر (کینیڈا)

نہیں ایسا تو نہیں میں نے محبت نہیں کی
قیس کی طرح کبھی وحشت میں وحشت نہیں کی

اپنی عزت مجھے پیاری تھی سو خاموش رہا
میں نے ہمسائے کے بچے کو نصیحت نہیں کی

اس نے بتلایا نہیں ترکِ تعلق کا سبب
اور ہم نے بھی طلب کوئی وضاحت نہیں کی

ہجر تیرا ہے تو پھر تیرے نگر میں گزرے
اس لیے ہم نے ترے شہر سے ہجرت نہیں کی

لوگ یاروں سے نظر پھیر لیا کرتے ہیں
خاصیت یہ مجھے قدرت نے ودیعت نہیں کی

یہ گواہی مرے کردار کا حصہ ہے قمر
زندگی بھر کسی ظالم کی حمایت نہیں کی

☆☆☆☆

عابد رشید (شکاگو، امریکہ)

بات کوئی ہو ملاقات سے ڈر لگتا ہے
منہ سے نکلی ہوئی ہر بات سے ڈر لگتا ہے

پھینک ہی دے نہ اٹھا کر وہ انھیں ردی میں
اپنے سجدوں سے، عبادات سے ڈر لگتا ہے

اپنے محور سے بھٹک جائیں نہ اک روز کہیں
مجھ کو ان ارض و سماوات سے ڈر لگتا ہے

کہتے کہتے وہ کوئی بات ٹھہر جاتا ہے
مجھ کو ہونٹوں میں دبی بات سے ڈر لگتا ہے

روز دہراتا ہوں میں اپنے گزشتہ کل کو
مجھ کو تبدیلی حالات سے ڈر لگتا ہے

میرے اخلاص کو پہنا دے نہ معنی کوئی
اب کسی پہلی ملاقات سے ڈر لگتا ہے

وہ جو احسان کرے اور جتائے اس کو
مجھ کو ایسے کسی کم ذات سے ڈر لگتا ہے

ان غزالوں کے پس پردہ کہیں میں تو نہیں
مجھ کو اس شہر کے حالات سے ڈر لگتا ہے

مسکرا دوں تو لگتے ہیں دعا دیتے ہیں
مجھ کو افسردہ نباتات سے ڈر لگتا ہے

ہوں جلا دودھ کا سو چھاچھ سے ڈرتا ہوں میں
شہر تو شہر مضافات سے ڈر لگتا ہے

وہ جو کہتا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں
مجھ کو اس شخص کی ہر بات سے ڈر لگتا ہے

بھول سے چوک نہ ہو جائے مراتب میں کہیں
سیدی، عزتِ سادات سے ڈر لگتا ہے

جانے کس سمت لیے جاتی ہیں مجھ کو ماجد
جو نہ بدلیں گی ان عادات سے ڈر لگتا ہے

☆☆☆☆

فرخندہ رضوی (لندن)

بند آنکھوں میں یہ خواب سجائے تو نہیں تھے
آنسو میری پلکوں میں سمائے تو نہیں تھے

پہلو میں میرے پلتے رہے ڈستے رہے جو
اپنے تھے وہ سب سانپ پرائے تو نہیں تھے

خود رو کسی پودے کی طرح روح میں اترے
آداب محبت بھی سکھائے تو نہیں تھے

وعدے جو شب و روز مجھے یاد دلائے
وعدے وہ کبھی تم نے نبھائے تو نہیں تھے

پھر بھی وہ مرے ذہن میں خندہ رہے کیسے
اس نے مجھے جو شعر سنائے تو نہیں تھے

☆☆☆☆

سیما نقوی (کینیڈا)

حوصلے غم سے لڑ گئے میرے
اشک مشکل میں پڑ گئے میرے

میں نے ہجرت کا بیج کیا بویا
پاؤں جڑ سے اکھڑ گئے میرے

ٹھن گئی یوں مری مقدر سے
کام بنتے بگڑ گئے میرے

اک گھروندا ٹوٹ کیا گیا میرا
لوگ افسانے گھڑ گئے میرے

نیند ٹوٹی خزاں کی دستک پہ
خواب پلکوں سے جھڑ گئے میرے

ہجر صدیوں پہ پھیل جاتا مگر
کم شب و روز پڑ گئے میرے

سب رفو گر کدھر گئے سیما
زخم پھر سے ادھڑ گئے میرے

شعیب افضال (لندن)

جو روشنی کے بدن نیستی سے نکلے ہیں
ابد کنار بڑی تیرگی سے نکلے ہیں

تماشا روز نیا کھینچتی ہے تنہائی
یہ قہقہے مری افسردگی سے نکلے ہیں

جنوں نے مجھ میں ہویدا رکھا ہے وحشت کو
بلا کے شعر اسی خستگی سے نکلے ہیں

نہیں نہیں تری وحدت تو مجھ پہ بار نہیں
یہ سجدے تو مری بندگی سے نکلے ہیں

یہی تو حسن ہیں جنت کے مرغزاروں کا
گل ملال جو بے رہروی سے نکلے ہیں

ہوائے یاس اڑا لے گئی ہے ظلمت کو
کڑکتے دن اسی تیرہ شبی سے نکلے ہیں

کس انہماک سے بیٹھے ہیں آستاں پہ ترے
وہ زندگاں جو ابھی زندگی سے نکلے ہیں

اشفاق کاشف (امریکہ)

میری تنہائی بے گا کب تک
دور یوں مجھ سے رہے گا کب تک

لے لے اب کمرہ کسی ہوٹل میں
شہر میں یونہی پھرے گا کب تک

دل جو کہتا ہے تجھے وہ کر لے
دنیا والوں سے ڈرے گا کب تک

کتنی مدت کی رفاقت ہے یہ
تو مرے ساتھ رہے گا کب تک

کچھ تو کہہ مجھ سے کھلے گا کب تک
تو مرا دوست بنے گا کب تک

کتنی دیر اور سیاہی رہے گی
یہ دیا اور جلے گا کب تک

مر کے اک بار امر ہو جا اب
زندگی میں یوں مرے گا کب تک

خود سے لڑ سکتا نہیں جو کاشف
دوسروں سے وہ لڑے گا کب تک

☆☆☆☆

صابر امانی (سعودی عرب)

آغوشِ طلب ، یار کی جھولی میں گرا مست
کھلتا ہے بڑے مان سے اک بندِ قبا مست

کھلتی ہے کوئی زلفِ گرہ گیر ذرا دیر
پھرتی ہے چمن زارِ معطر میں ہوا مست

خوشحال کو ڈستی ہے زیادہ کی طلب کثر
ہر حال میں رہتا ہے ترے در کا گدا مست

انجامِ تماشہ محو دیکھ رہا ہوں
ساقی بھی نیا ، جام نیا اور نیا مست

صیاد مروت میں قفس کھول رہا ہے
ہوتا ہے تسلی سے تسلط سے رہا مست

اک صحن طرب ناک میں رقصاں ہے کوئی جسم
لیکن حد آسیب سے آگے نہ گیا مست

یوں کرتے ہیں ہم وصل ملائم کا ادب یار
آتے ہی تری یاد کے سینے سے لگا مست

ہم نے دو پل بھی کبھی ساتھ گزارے کب تھے
اک گماں سا تھا فقط آپ ہمارے کب تھے

ایک تو یہ تھا کہ ہمیں تیرا بھرم رکھنا پڑا
ورنہ ہم لوگ کسی اور سے ہارے کب تھے

یہ بجا ہے کہ ادھر آ کے نا کچھ ہاتھ آیا
اس طرف بھی میری قسمت میں ستارے کب تھے

یہ نصیبہ تو مرے گاؤں کے لوگوں کا ہی تھا
شہر میں تیرے بھلا ہجر کے مارے کب تھے

کتنے لوگوں سے تھا دن رات تعلق اپنا
ساتھ رہتے تھے مگر یار وہ سارے کب تھے

یہ تو چھلنی ہے میرا سینہ تیری باتوں سے
تیر دشمن نے میرے دل میں اتارے کب تھے

چارہ گر جس کو سمجھتے تھے ہمیں چھوڑ گیا
ساحل اس دل کو زمانے کے سہارے کب تھے

محمد فرقان فیضی (بریلی، بھارت)

خطائے عشق کبھی عاشقی نہیں ہوتی
نہ ہوتے آپ تو دیوانگی نہیں ہوتی

نزول غم کی وہ یلغار ہے نہ پوچھ اے دوست
اگر خوشی بھی ملے تو خوشی نہیں ہوتی

جو میرے اپنے ہیں کیوں مجھ سے استفادہ کریں
میاں چراغ تلے روشنی نہیں ہوتی

وصال یار کے موسم میں ہجر یار کا غم
اذیت کوئی بھی اس سے بڑی نہیں ہوتی

آ جانے والے ذرا اور وقت ساتھ گزار
بغیر تیرے بسر زندگی نہیں ہوتی

مکر گیا ہے وہ وعدے سے اس کا عرف ہے یہ
پہ میں ہوں جس سے کبھی بے رخی نہیں ہوتی

اب اس کے حسن میں بھی پہلے جیسی بات نہیں
اے فیضی مجھ سے بھی اب شاعری نہیں ہوتی

ناصر معروف (مسقط، عمان)

ہوا ہے مختصر قصہ ہمارا
کسی نے ہاتھ جب تھاما ہمارا

یہ کس کا غم اٹھا کر گھومتے ہیں
ہے کس سے پڑ گیا پالا ہمارا

ہمیں رشتوں کے دھوکے میں ہمہ تن
کہاں پہ سو گیا کنبہ ہمارا

امانت دار ہیں ہم عاشقی کے
رموز عشق پہ پہرہ ہمارا

ہمارے شہر میں باتیں کسی کی
کسی کے شہر میں چرچا ہمارا

فقیری کا لبادہ جب سے اوڑھا
کسی سے بھی نہیں جھگڑا ہمارا

ہمارے دل پہ کیا گزرے گی ناصر
کسی نے بھی نہیں سوچا ہمارا

نیلم بھٹی (مشی گن، امریکہ)

پیر سائن میں دشت چلتا ہے
ہجر دیوانگی میں ڈھلتا ہے

شور کتنا بھی ہو ہواؤں کا
خامشی سے چراغ جلتا ہے

روشنی آگہی تخیل میں
کون احساس میں پگھلتا ہے

گھر بنایا ہے اس نے شیشے کا
بات کرتے ہوئے سنبھلتا ہے

پھر کسی شہر کا نہیں ہوتا
جو ترے شہر سے نکلتا ہے

تھک گئی رات بھی جدائی کی
عمر بھر کون ساتھ چلتا ہے

بات کرنا محال ہے نیلم
حرف چپ میں سوال جلتا ہے

راشد شاذ (علی گڑھ، بھارت)

اندر باہر جنگ

(خودنوشت لائحہ سے چند صفحات)

ریاض واپسی پر شہر کا منظر خاصا بدلا ہوا پایا۔ میری رہائش گاہ ریاض کے فوجی ہوائی اڈے سے کسی قدر متصل تھی۔ بالائی منزل پر بنی بالکونی سے جنگی جہازوں کی آمد و رفت کا منظر خوف و ہراسیگی میں اضافہ کرتا۔ اب یہ عمارت حفاظتی اقدام کے طور پر خالی کرائی جا چکی تھی۔ چند دن علاقائی ہوٹل کے وی آئی پی سوئیٹ میں قیام پذیر رہا پھر تنہائی سے تنگ آ کر ندوۃ الشباب کے دارالضیافہ میں منتقل ہوگیا۔ شہر پر خوف کا سایہ گہرا ہوتا جاتا تھا۔ لوگ اپنے گھر کی کھڑکیوں اور دروازوں کو سیل کر رہے تھے۔ دفاع المدنی کی ہدایت تھی کہ زہریلی گیس سے بچنے کے لیے غسل خانے میں پانی بھری بالٹیاں اور گیلے تولیے ہر وقت تیار رکھے جائیں۔ ہمارے ایک دوست تھے واصف الراعی۔ ان کی مختلف حلقوں میں چلت پھرت رہتی۔ ایک دن فوجیوں کے جنگی ساز و سامان سے کچھ تحائف لے آئے جن میں ان کیڑے مکوڑوں اور سانپوں کا تفصیلی ذکر تھا جو صحراؤں میں پائے جاتے ہیں اور جنھیں ہنگامی حالات میں جان بچانے کے لیے کھایا جا سکتا تھا۔ ٹیلی ویژن پر اکثر گیس ماسک کے استعمال کی ترکیب نشر ہوتی رہتی۔ اخبارات میں ایسی تصویریں شائع ہوتیں جس میں سعودی فوجی ان گیس ماسک میں نماز ادا کرتے ہوئے دکھائے جاتے۔

جنگ کی تاریخ جیسے جیسے قریب آتی جاتی تھی لوگوں میں حفاظتی ترکیبوں کے لیے ہیجان بڑھتا جاتا۔ ایک دن ایک عراقی شاعر کے ہاں عشائیے کی تقریب نکل آئی۔ موصوف بالائی منزل پر ایک پرانے طرز کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کے گھر میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں اور سب کی سب کھلی۔ ان صاحب پر بھی جنگ کے پروپگنڈے کا کوئی اثر نہ تھا۔ کہنے لگے جب تک زندگی لکھی ہے بے خوف جیو۔ اور یہ زہریلی گیس کا قصہ بھی کسی لطیفے سے کم نہیں۔ کہتے ہیں کہ Lewisite gas ہلکی ہونے کے سبب ہوا میں معلق ہو جاتی ہے جبکہ Mustard gas بھاری ہونے کے سبب زیریں منزل اور خاص طور پر تہہ خانوں میں جم جاتی ہے۔ اب بتائیے جب اسکڈ میزائیل گریں گے، زہریلی گیسوں کا حملہ ہوگا تو ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ یہ کون سی گیس ہے۔ اوپر جانا ہے یا نچلی منزل میں پناہ لینا ہے۔ حکومت نے آٹھ ملین ڈالر گیس ماسک پر خرچ کر دیے جس کی اثر انگیزی کا تناسب آٹھ فیصد سے زیادہ نہیں۔ یہ سب خوف کا کاروبار ہے۔ زندگی کو آخری لمحے تک مکمل کر جیو۔

خوفِ موت سے بڑھ کر ہے۔ اسے قریب دیکھنے والے یہ جہنم کا اسفل ترین درجہ ہے۔

عراقی شاعری، باتیں سن کر کچھ ہمت بندھی۔ سوچا یہ شخص سچ ہی کہتا ہے جب تک مہلت حیات ملی ہے شعر کہتے رہیے گنگناتے رہیے۔ کھڑکیاں کھلی رکھیے گھروں کی بھی اور دل و دماغ کی بھی۔

ندوۃ الشباب کے مہمان خانے میں ان دنوں میرے علاوہ کوئی اور مہمان نہ تھا۔ یہاں آٹھ دس ملازمین اس کی زیریں منزل میں رہا کرتے تھے۔ بالائی منزل پر میرے قیام کا اہتمام تھا جہاں ایک بڑی میز کے گرد کچھ کرسیاں رکھی تھیں ساتھ ہی کتابوں کی ایک الماری جس میں مختلف قسم کی ڈکشنریاں، قرآن مجید کے دسیوں تراجم اور دوسری معاون کتابیں۔ ایک نئی مصروفیت قرآن مجید کے ایک جدید ترجمے کی تیاری تھی جس میں میرے علاوہ ڈاکٹر صالح الجمیلی اور داؤد پٹیل صاحبان شریک تھے۔ دیر رات گئے تک ترجمے پر کام جاری رہتا اور اسی اثنا اگر کبھی خوف ناک دھماکے کی آواز آتی یا دفاع المدنی کا سائرن بج اٹھتا تو بھاگ کر نیچے آتا جہاں لابی میں ٹیلی ویژن پر خبریں آرہی ہوتیں اور لوگ خبروں پر تبصرے میں مصروف ہوتے۔ ایک دن خیال آیا کیا یہ جنگ کی ان غیر معمولی کیفیات کو یوں نہ قلم بند کرلیا جائے۔ اس سے پہلے حجاز مقدس کی ایک ڈائری لکھنی شروع کی تھی مگر بات چند صفحات سے آگے نہ بڑھ پائی تھی۔ پھر بھی ہمت نہ ہاری:

ریاض، 17 جنوری 1991

آج کی رات ندوۃ الشباب کے مکینوں پر بہت بھاری ہے۔ زہریلی گیسوں کا خوف رگوں میں سرایت کرتا جارہا ہے۔ ہمارے پاس گیس ماسک بھی نہیں۔ اب تک ہم جنگ کو کھیل سمجھ رہے تھے۔ لیکن آج پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ ہم واقعی ام المعارک میں پھنس گئے ہیں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ آواز میں ایسی شدت کہ صرف دل ہی نہیں بلکہ دروازے اور کھڑکیاں بھی دہل کر رہ گئے۔ نچلی منزل سے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نیچے آیا۔ لابی میں ٹیلی ویژن پر الدفاع المدنی کا اعلان اب بھی جاری تھا:

الرجاء، الانتباہ!

لقد انطلق الدفاع المدني صافرة انذار وقوع الخطر في الرياض

عليك اتباع ما يلي

التجئ الى مكان آمن، التزم الهدوء، واصل مشاهدة تلفزيون وسماع الاذاعة۔

(شہری تحفظ کے محکمے نے ریاض میں خطرے کا الارم بجا دیا ہے۔ درج ذیل امور کا خیال رکھیں: محفوظ جگہ پر رہیں، گھبرائیں نہیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر دی جانے والی ہدایات سے باخبر رہیں۔)

کچھ دیر اسی افراتفری میں گذرے۔ خدا خدا کر کے خطرے کا الارم بند ہوا۔ دھماکے کی شدت سے تو

یہی لگتا تھا کہ اسکڈ میزائل یہاں سے قریب ہی کہیں گرا ہے۔ اسی دوران ٹیلی وژن پر یہ خبر آئی کہ حملہ ناکام بنا دیا گیا ہے۔ امریکی پیٹریاٹ میزائل نے اسے فضا میں ہی ناکارہ بنا دیا۔ ایک صاحب کہنے لگے۔ یہ سب امریکی پروپیگنڈا ہے۔ پیٹریاٹ بھلا کیا کام کرے گا یہاں تو سارا عمل کام ایکس پیٹریاٹ کرتے ہیں۔

ٹیلی وژن کی خبروں میں صدر بش کی تقریر کے بعض حصے دکھائے جا رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ ہم نے صدام حسین کی نیوکلیائی صلاحیتوں کو فنا کر دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ہم ان کے کیمیائی ہتھیاروں کو بھی ختم کر کے دم لیں گے۔ صدام کے جنگی ساز و سامان اور ٹینکوں کا ایک بڑا حصہ تباہ کر دیا جائے گا۔ بغداد سے سی این این کے نامہ نگار جون ہیلیمن بتا رہے ہیں کہ یہاں آسمان سے بموں کی بارش کے سبب آتش بازی کا سماں ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا ۴ جولائی کو واشنگٹن میں کیپیٹل پر ہوتا ہے۔ پس منظر میں آپ بمباری کی آواز سن سکتے ہیں۔ مجھے اب بغداد کا ٹیلی کمیونیکیشن مرکز حملوں کی زد میں ہے۔ جنگی جہازوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔

ابوسعید مصری جو اس مہمان خانے کے انچارج ہیں، بغداد ریڈیو سننے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ صورت حال کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے مگر یہاں کوئی خبر نہیں آ رہی ہے۔ صرف قرآن مجید کی تلاوت کا سلسلہ جاری ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کویت اور عراق پر اس بے تحاشا اور بے رحم بمباری سے جس میں B-52 بمبار جہاز بھی استعمال کیے گئے ہیں، اہل زمین پر کیا گذر رہی ہے۔ ابوسعید بڑے ہی باہمت آدمی ہیں اپنی بذلہ سنجی سے خطرے کے ماحول میں بھی زندگی کا رس گھولتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ کسی نے صدام سے پوچھا کہ کویت پر قبضہ کرنے میں آپ کو چار گھنٹے لگے۔ سعودی عرب پر قبضے میں کتنا وقت لگے گا؟ بولے، آٹھ گھنٹے۔ اور بحرین پر؟ بولے، ارے اس کے لیے تو ایک فیکس بھیجنا کافی ہے۔

کہتے ہیں کہ صدر بش کو کہیں سے سوٹ کا ایک کپڑا ہاتھ لگ گیا۔ یہ کپڑا بش کو بہت پسند تھا مگر مشکل یہ تھی کہ یہ ان کے سوٹ کے لیے کافی نہ تھا۔ وہ مختلف ملکوں میں نامی گرامی درزیوں کے پاس اسے لے کر گئے مگر کامیابی نہ ملی۔ کسی نے بتایا کہ عراق میں ایک درزی ہے مہارت میں جس کا کوئی ثانی نہیں۔ صدر بش اس کے پاس جا پہنچے۔ درزی نے ایک نظر کپڑے پر ڈالی۔ طول و عرض کا معائنہ کیا پھر بولا کہ آپ کے ایک سوٹ کے علاوہ ایک اور ویسٹ بھی بن جائے گی اور کچھ کپڑا بچ رہے گا۔ بش یہ سن کر بہت حیران ہوئے۔ پوچھا آخر کیسے؟ کچھ بتاؤ تو سہی! درزی بولا: دیکھو بات دراصل یہ ہے کہ ساری دنیا تمہیں بہت بڑا آدمی سمجھتی ہے جبکہ ہم عراقی لوگ تمہارے اصل قد سے واقف ہیں۔

ابوسعید کہتے ہیں کہ امریکی اپنے بموں کو اسمارٹ بم کہتے ہیں جو بقول ان کے ٹھیک اپنے ہدف پر لگتا ہے، ارد گرد کی عمارتوں کو نقصان نہیں پہنچاتا اور نہ کسی بے گناہ کی جان لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسکڈ

میزائیل کہاں گر جائے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب ان امریکیوں کو کون بتائے کہ تمہارے اسی پروپیگنڈے کے سبب تو لوگ اسکڈ میزائیل سے خوف کھاتے ہیں۔

ابوسعید کے پاس مصری حکایات و لطائف کا ایک بڑا خزانہ ہے جسے وہ وقتاً فوقتاً اپنے بیان و آورد میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک صاحب کی ناک پر پھنسی نکل آئی تھی۔ اس خیال سے کہ معاملہ طول نہ پکڑے انھوں نے مرہم پٹی کا سہارا لیا۔ کسی نے پوچھا ارے یہ کیا ہوا؟ اس سے پہلے کہ صاحب معاملہ کچھ کہتا، بولے ارے میں کچھ کیا اس نے اپنا دانت نکلوایا ہے۔ مگر پٹی تو ناک پر لگی ہے، میں نے مداخلت کی۔ بولے ارے تمہیں نہیں معلوم! ہمارے ہاں مصر میں اگر دانت نکالنا ہو تو ناک سے سوراخ کرتے ہیں، وہاں کسی کو منھ کھولنے کی اجازت نہیں۔

ایک دن کمیونزم ازم اور سوشل ازم کا فرق بتاتے ہوئے کچھ اس طرح گویا ہوئے صدر ناصر جب جہنم پہنچے تو شیطان نے ان سے خصوصی اکرام کا معاملہ کیا۔ انھیں یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے لیے سوشلسٹ اور کمیونسٹ طرز تعذیب میں سے جسے چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟ انھوں نے پوچھا۔ جواب ملا کمیونسٹ تعذیب میں آپ کو پانچ دن آگ میں جلایا جائے گا اور دو دن چھٹی رہے گی۔ سوشلسٹ تعذیب گاہ میں ہفتے کے ساتوں دن گرم تیل میں پکایا جائے گا۔ ناصر نے اپنے پسندیدہ سوشلزم کو وہیں خیرباد کہا اور کمیونسٹ تعذیب گاہ کے حق میں اپنا عندیہ دے دیا۔ چھٹی کے دن انھیں خیال آیا کہ ذرا دیکھا تو جائے عمار (ان کے فوجی کمانڈر) پر سوشلسٹ تعذیب گاہ میں کیسی گذر رہی ہے۔ وہ درد سے کراہتے ہوئے بڑی مشکل سے ان کے کمرے میں پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ عمار کرسی پر بیٹھے شان سے حقہ گڑگڑا رہے ہیں، ہر طرف حشیش کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ ناصر کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا معاملہ کیا ہے؟ عمار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، یہاں سے ایک آدمی ہر روز جہنم کی کوآپریٹیو سوسائٹی میں تیل لینے کے لیے بھیجا جاتا ہے جہاں اسے جواب ملتا ہے کہ ابھی دستیاب نہیں ہے۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ بڑے کھلے مصری عام طور پر اپنی گفتگو میں ایسے لطائف کا استعمال کرتے ہیں جس سے ان کے ہاں سیاسی حبس کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔ ابوسعید بھی اپنی گفتگو میں لطائف کو مزہ دینے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ ایک دن خفیہ پولس کی زیادتیوں کا ذکر چل نکلا۔ انھوں نے یہاں بھی بڑی خوبصورتی سے ایک لطیفہ ٹانک دیا کہ ایک لومڑی بھاگ کر لیبیائی سرحد میں داخل ہوئی۔ اسے پریشان دیکھ کر مقامی لومڑی نے پوچھا بی بی خیر تو ہے۔ تم کچھ گھبرائی اور پریشان سی لگتی ہو۔ بولی کیا کروں بڑی مشکل سے جان بچا کر آئی ہوں، وہاں مصر میں اونٹوں پر مصیبت آئی ہوئی ہے، انھیں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ مگر تم تو لومڑی ہو اونٹ نہیں۔ بولی، مگر یہ بات مصری پولس کو کون سمجھائے۔

ریاض، 18 جنوری 1991

آدھی رات کا وقت ہے۔ آج ریاض میں نسبتاً خاموشی ہے۔ میزائل گرنے کی خبریں اسرائیل سے آرہی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر گیس ماسک پہنے ہوئے کچھ ہوئے نیم تاریک سڑک پر متحرک دکھائے گئے ہیں۔ پتہ نہیں یہ تل ابیب ہے یا کوئی اور شہر۔ ان رپورٹوں سے زمینی حقائق کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ٹیلی ویژن پر جنگی طیاروں میں بم باندھنے اور پھر بمباری کے بعد انہیں واپس اترتے ہوئے دکھایا جاتا ہے مگر جہاں بم گرا وہاں لوگوں پر کیا گذری یہ سب کیمرے کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ لہٰذا بمباری کے مناظر پر، جو ہمیں دکھائے جاتے ہیں، آتش بازی کا گمان ہوتا ہے۔ کیا جنگ اتنی ہی خوش نما، بے ضرر اور پرلطف ہوتی ہے جیسی سی این این والے دکھا رہے ہیں۔ کیا واقعی امریکی اسلحے خوش نما اور مہذب ہوتے ہیں جو تاریک آسمان پر دلفریب پھلجھڑی کا سماں باندھ دیتے ہیں، اس کے برعکس عراقی اسلحہ وحشت و بربریت میں اپنی مثال نہیں رکھتے؟ بغداد سے آنے والی مغربی نشریات میں نامہ نگار وہی کچھ بتا رہے ہیں جو انہیں ہوٹل کی کھڑکیوں سے نظر آتا ہے۔ یا پھر عراقی ریڈیو ہے جہاں ام المعارک کے برپا ہونے کی خبر ہے۔ بلند بانگ دعوے ہیں، فتح کی بشارت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان معنوں میں تو یقیناً یہ ام المعارک ہے کہ اس جنگ نے خلیج میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی رفتار تیز کر دی ہے۔ اس پر بند باندھنا اب ممکن نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں تو ایسی الٹ پلٹ ہوگئی ہیں کہ ان پر حیرت ہوتی ہے۔ سعودی عرب اور امریکہ کے دوسرے عرب اتحادی اس وقت یہ نہیں چاہتے کہ اسرائیل پر عراقی میزائل داغے جائیں۔ ایک اعتبار سے اسرائیل اور عرب اتحادی اس وقت خواہی نخواہی ایک ہی خیمے میں آگئے ہیں اور کچھ وہی منظر پیدا ہوگیا ہے کہ

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک

دوسری طرف فلسطینی اور اردن میں صدام حسین کی حمایت میں نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ کویتی اور سعودی حکمراں اس بات پر سخت نالاں ہیں کہ جن فلسطینیوں کی ہم نے ہر مشکل گھڑی میں دامے درمے مدد کی آج وہی لوگ ہمارے دشمن صدام کا علم تھامے ہوئے ہیں۔ آج قریب کی مسجد میں جہاں عربوں کی غالب اکثریت ہوتی ہے، جمعہ کا خطبہ اسی شکوہ و شکایت سے پر تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگ خلیج نے عرب معاشرے کی چولیں ہلا دی ہوں۔

19 جنوری 1991

آج شام قومی ہوائی اڈے کے قریب جہاں میری پرانی رہائش گاہ تھی، جانے کا اتفاق ہوا۔ فوجی لباس میں بہت سی امریکی خواتین کو ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ پرانے ایئر پورٹ روڈ پر

بعض عسکری اداروں کے دفاتر ہیں اور ذرا آگے چل کر ہوٹل حیات ریجنسی واقع ہے جہاں ہر شام پریس بریفنگ کے سبب غیر ملکی نامہ نگاروں اور اعلیٰ فوجی افسران کا ہجوم ہوتا ہے۔ان علاقوں میں فوجی خواتین کو گاڑی چلاتے ہوئے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن آج جس پیمانے پر ان کی شرکت دیکھی اس پر قدرے حیرت ہوئی۔ پتہ چلا کہ امریکی افواج میں کوئی دس فیصد عورتیں بھی آئی ہیں جنھوں نے جنگ شروع ہونے کے بعد پوری طرح اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔مقامی سعودی ان کی نقل و حرکت کو چشم حیرت سے دیکھتے ہیں مگر کچھ کہتے نہیں۔

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے،دو ماہ پہلے کی بات ہے،ریاض کی شاہراہوں پر 47 خواتین نے ڈرائیونگ کے حق میں ایک جلوس نکالا تھا۔وہ احتجاجاً اپنی اپنی گاڑیوں کو چلاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئی تھیں۔ان کا مطالبہ تھا کہ انھیں ڈرائیونگ کا قانونی حق دیا جائے۔ان کی دلیل ہے کہ اس ہنگامی صورت حال میں دوران جنگ اگر انھیں کسی محفوظ مقام کی تلاش میں نکلنا پڑا تو وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان کیسے بچا سکیں گی۔بات معقول ہے مگر مدینہ کے علما نے اسے خلاف اسلام جانا۔یہ خواتین گرفتار کرلی گئیں اور ان میں سے بعض کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔میں نے اپنے دوست مانع الجہنی سے سعودی معاشرے کی اس غیر معمولی حساسیت کا شکوہ کیا جس کے سبب سعودی خاتون کو خواہ مخواہ ایک غیر محرم ڈرائیور کی ہم نشینی اختیار کرنا پڑتی ہے۔میرا اعتراض سن کر وہ مسکرائے،خود کو درست کرتے ہوئے کرسی پر پیچھے کی طرف ٹیک لگائی،بولے تم انھیں ڈرائیونگ کا حق دلوانا چاہتے ہو۔ارے بھئی وہ تو پہلے سے ہی ہم مردوں کو ڈرائیو کر رہی ہیں۔دوسرے سعودی دانش وروں کی طرح مانع صاحب ان باتوں پر کسی چوڑی بحث نہیں کرتے۔انھیں توقع ہے کہ آنے والے دنوں میں معاشرہ ان امور کے لیے خود ہی گنجائش پیدا کرلے گا۔

20 جنوری 1991ء

رات ڈھلے اسکڈ میزائل کی وحشت عام ہو جاتی ہے۔البتہ ہم لوگ اب اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ گو کہ اب تک کسی بڑے جانی نقصان کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔در و دیوار محفوظ ہیں مگر فکر و خیال کی دنیا میں مسلسل اتھل پتھل کی صورت حال ہے۔ایرانی انقلاب کو کیسٹ ریوولوشن بھی کہا جاتا ہے جہاں خمینی کے اسمگل شدہ کیسٹ نے لاکھوں میں ایک نئے رومانوی مستقبل کی جوت جگادی تھی۔سعودی عرب میں سفر الحوالی اور سلمان العودہ نام کے دو علما کا ان دنوں بڑا شہرہ ہے۔ان کے کیسٹس بڑی توجہ سے سنے جاتے ہیں۔ان تقریروں میں حکومت پر سخت تنقید ہوتی ہے۔حکمرانوں کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ سیاسی اور سماجی اصلاحات سے اب مفر نہیں۔18 نومبر کو عمان کے قومی دن کے موقع پر سلطان قابوس کا یہ اعلان کہ وہ جلد ہی ملک میں ایک مجلس

شوریٰ بنائیں گے، اور اس کے چند ہی دن بعد 13 دسمبر کو بحرینی وزیر اعظم شیخ خلیفہ بن سلمان الخلیفہ کا یہ کہنا کہ ان کے ملک نے بھی جمہوریت کی طرف قدم بڑھانے کا تہیہ کرلیا ہے، اسی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں ریاض میں، کوئی دو ڈھائی ماہ پہلے 6 نومبر کو خواتین نے اپنے حق ڈرائیونگ کے لیے احتجاج کیا تھا۔ ملک میں سات لاکھ بیرونی افواج اور غیر ملکی پریس کی عام چلت پھرت کے اس ماحول میں حکمرانوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ عوام سے اصلاح احوال کا وعدہ کریں۔ 8 نومبر کے ایک اعلامیہ میں شاہ فہد نے عنقریب ایک نئی مجلس شوریٰ کے قیام کا مژدہ سنایا رہا ہے کہ 43 ممتاز شہریوں اور اصحاب فکر کی طرف سے شاہ فہد کی خدمت میں مجوزہ اصلاحات کے لیے ایک عریضہ بھی پیش کیا گیا ہے جس میں ایک ایسی مجلس شوریٰ کے قیام کی وکالت کی گئی ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ مملکت کے بنیادی قوانین جلد از جلد وضع کیے جائیں۔

کہنے کو ایک مجلس شوریٰ تو اس ملک میں پہلے سے چلی آتی ہے جو دراصل حجاز مقدس پر سعودی قبضے کے بعد تشکیل دی گئی تھی اور جسے اس وقت جمعیہ تاسیسیہ کا نام دیا گیا تھا اور اس کے 43 اراکین جو سب کے سب حجاز سے ہی لیے گئے تھے انھیں یہ طے کرنا تھا کہ مستقبل میں حجاز کن خطوط پر کام کرے گا۔ ان بزرگوں نے ایک نئی حجازی مملکت کے لیے بنیادی قوانین بھی مرتب کر دیے تھے جس کی تفصیلات ام القریٰ شمارہ 90 مورخہ 3 ستمبر 1926 کے شمارہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس دستاویز کے مطابق نئی مملکت کی حیثیت دراصل دولہ ملکیہ اسلامیہ شورائیہ کی تھی۔ مجلس شوریٰ کے اراکین میں حجاز کے سربرآوردہ لوگ مثلاً اہم تجار، علما اور اشراف مکہ شامل کیے گئے تھے۔ آگے چل کر ایک مجلس اہلی یعنی نیشنل کاؤنسل بھی بنائی گئی تھی جس کے 14 اراکین کا انتخاب سلطان عبدالعزیز کے کنٹرول میں ہوا تھا جو اس وقت تک نجد و حجاز کے بادشاہ نہیں کہلاتے تھے۔ حجاز کے سلسلے میں ایک نمائندہ اور نسبتاً شفاف شورائی نظام اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہاں حرمین شریفین کی خدمت کے حوالے سے مصر اور ہندوستانی مسلمانوں میں پہلے سے ہی مسابقت پائی جاتی تھی۔ سقوط خلافت کے بعد مصر کے شاہ فواد اور نظام حیدرآباد کسی نہ کسی درجے میں اس اعزاز کے متمنی تھے۔ حجاز کی اسی بین الاقوامی حیثیت کے سبب ابتدا سے ہی آل سعود نے اسے ایک شفاف شورائی نظام کے تحت رکھا۔ ایک مدت تک مجلس شوریٰ فعال رہی۔ بجٹ کی پیشی سے لے کر قومی ترقی کے منصوبوں میں اس کے رول کو محسوس کیا جاتا۔ البتہ 1933ء میں تیل کی آمدنی پیدا ہو جانے اور پھر اس میں مسلسل اضافے کے سبب حکومت روایتی محصول اور حج کی آمدنی سے بے نیاز ہوتی گئی۔ چونکہ گنتی کی بھلا اب کسے فرصت تھی۔ اسے نہ تو بجٹ پیش کرنے کی ضرورت رہی اور نہ ہی کسی ایسی مجلس شوریٰ کے مشورے کی۔ اب تو یہ خود تیل کی آمدنی سے عوامی بہبود کے منصوبے بنانے کی پوزیشن میں تھے۔

خلیجی بحران نے اس گمشدہ مجلس شوریٰ کی یاد ایک بار پھر تازہ کر دی ہے۔

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

21 جنوری 1991

آج مرکز شعلہ التجاری سے گذرتے ہوئے ایک نغمہ سماعت سے ٹکرایا۔ یسمعنی حین یراقصنی کلمات لیست کالکلمات۔ آواز ایک کیسٹ کی دوکان سے آرہی تھی:

یاخذنی من تحت ذراعی — یزرعنی فی احدی الغیمات
والمطر الاسود فی عینی — یتساقط زخات زخات
یحملنی معہ یحملنی — لمساء وردی الشرفات
وانا کالطفلۃ فی یدہ — کالریشۃ تحملہا النسمات
کلمات تقلب تاریخی — تجعلنی امراۃ فی لحظات

مغنیہ کے لحن میں بلا کا جادو تھا۔ اس صوت مطربہ پر دل کھنچا تو کھنچتا ہی چلا گیا۔ کیسٹ لے کر باہر نکلا تو برابر کی دوکان میں مطوع (مذہبی پولس) کا شور سنائی دیا جو کیسٹ کی ان دوکانوں کے خلاف سراپا احتجاج تھے اور اسے بند کروانا چاہتے تھے۔ اسی اثنا ایک سعودی نوجوان میرے پاس آیا۔ بولا شیخ آپ یہاں کہاں؟ میں نے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے شاید دہلی کے سعودی سفارت خانے میں جہاں میں ملازم تھا۔ اب آج کل ہیئۃ الامر بالمعروف سے وابستہ ہوں۔ وہ حیران تھا کہ شیخ کیسٹ کی دوکان سے نکلے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ماجدہ الرومی کا تازہ البم ہے۔

ادھر چند برسوں میں ریاض اور جدہ میں اسلامی کیسٹوں کے بڑے بڑے اسٹورس قائم ہو گئے ہیں جہاں تلاوت قرآنی کے علاوہ اسٹار علمائی تقریریں اور اناشید اسلامیہ کے نت نئے البم فروخت ہوتے ہیں۔ یہ ایک الگ دنیا ہے اس کے باسیوں کو دوسری دنیا سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ مسلم معاشرے میں اسلامیوں اور جدید دانش وروں کے بیچ حد فاصل کھنچ گئی ہے۔ دونوں ہی ہماری سماعت پر اپنا کنٹرول چاہتے ہیں؛ ایک فنون لطیفہ کے ذریعے اور دوسرا مذہب کے حوالے سے۔

جب سے خلیجی بحران شروع ہوا ہے، اسلامیوں کے جذبات بری طرح مشتعل ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا وہ کیا کریں۔ اسٹار علمائی تقریروں میں حدت تو بہت ہے مگر روشنی سے خالی۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ میں ماہ ستمبر میں رابطہ کی کانفرنس میں شرکت کے لیے یہاں آیا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے کوئی پانچ ماہ ہو چکے۔ تب سعودی خیمے کے علما کا اس بات پر اجماع تھا کہ صدام اس دور کا سب سے بڑا

فتنہ ہے جس کی سرکوبی کے لیے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا ہمیں ہر طرح ساتھ دینا چاہیے۔ ابھی 10 تا 12 جنوری 1991 کو اہل فکر مسلمانوں کا ایک بڑا اجلاس بغداد میں منعقد ہوا تھا جس میں مسلمانوں کو امریکیوں کے خلاف جہاد کی دعوت دی گئی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان کے قاضی حسین احمد، جمعیت علمائے اسلام کے مولانا فضل الرحمٰن اور جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی نے صدام کی حمایت میں اپیلیں شائع کی ہیں۔ مولانا نورانی، جو بغداد کانفرنس میں خود بھی شریک تھے، نے تو عراق کی حمایت میں 25 ہزار مجاہدین بھیجنے کا اعلان بھی کیا ہے۔ الجزائر، تیونس اور سوڈان پہلے ہی صدام کی حمایت کا اعلان کر چکے ہیں۔ کیا یہ نئے دور کا صفحہ نہیں ہے جس میں دونوں طرف حب اسلام کے آرزو مند اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کرنا لازم جانتے ہیں۔ یا ان قراردادوں اور اپیلوں کی حیثیت زور بیان اور حب کلام کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ کلمات لیست کا التماس۔

22 جنوری 1991

خبر ہے کہ مغرب اقصیٰ کے پانچ مسلم ممالک نے سلامتی کاؤنسل سے مطالبہ کیا ہے وہ عراق پر ہونے والی وحشیانہ بمباری پر فی الفور روک لگائے۔ مراکش، الجزائر، لیبیا، تیونس اور موریطانیہ میں جنگ مخالف مظاہروں میں شدت آتی جا رہی ہے۔ مراکش میں 28 اور 29 جنوری کو امریکی حملے کے خلاف احتجاج اور عراقی مسلمانوں کے حق میں دعاؤں کے اجتماع کا اعلان کیا گیا ہے۔ بغداد اور دوسرے شہروں پر جس بہیمانہ طریقے سے بمباری کی جا رہی ہے اس سے مسلمانوں میں اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔ کویت پر عراقی قبضے کی حمایت شاید ہی کسی نے کی ہوگی۔ ابتدا میں تو لوگوں نے صدام کو حذام اور ہدام قرار دیا لیکن جب سے امریکی بمباری شروع ہوئی ہے صدام کی حمایت میں عرب اسٹریٹ پر شور بڑھتا جا رہا ہے۔ عامۃ الناس کی نگاہوں میں اس کی حیثیت صدام کی ہو گئی ہے۔ خاص طور پر مغرب اقصیٰ کے ممالک میں مسلمانوں کو وہ دن یاد آ رہے ہیں جب مغربی استعمار ان کے ملکوں پر چڑھ آئے تھے۔ صرف الجزائر کو ان بدبختوں سے پیچھا چھڑانے میں ایک ملین جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تھا۔

کل لیبیائی ریڈیو کا ایک نشریہ سن رہا تھا۔ تجزیہ نگار کا کہنا تھا کہ امریکی اور یورپی ممالک سے ہمیں خیر کی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ ان کی مکاریوں اور منافقتوں کی ایک طویل داستان ہے۔ ان لوگوں نے ہم عربوں کو دکھ کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا۔ کویت کی آزادی کی آڑ میں وہ ہمارے فطری وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ عراق پر حملے کے لیے سلامتی کاؤنسل کی قراردادوں کا بار بار حوالہ دیا جاتا ہے۔ اسرائیل کے خلاف بھی تو سلامتی کاؤنسل کی قراردادیں موجود ہیں مگر اس کے خلاف تو عالمی برادری کوئی فوجی کارروائی نہیں کرتی۔ پھر عراق کے معاملے میں اتنی مستعدی کیوں دکھائی جا رہی ہے؟

23 جنوری 1991ء

الندوۃ الشباب کے دفتر میں بیٹھو ایسا لگتا ہے گویا آپ علم و معرفت کی شاہراہ پر بیٹھے ہوں۔ ساری دنیا سے مختلف قسم کے اخبارات و رسائل اور تازہ بہ تازہ کتابیں یہاں پہونچتی رہتی ہیں۔ مانع الجہنی خود بھی اپنے غیر ملکی اسفار سے کتابوں سے لدے پھندے آتے ہیں۔ آج ان کی میز پر فائلوں سے جھانکتے ہوئے امریکی جریدہ ماہنامہ اٹلانٹک پر نظر پڑی۔ سرورق پر ایک غصیلے مسلمان کی تصویر بنی ہے جس کی آنکھوں میں امریکی جھنڈے کا سرخ خونی رنگ اتر آیا ہے۔ برنارڈ لیوس کا ایک مضمون The Roots of Muslim Rage اس شمارے کا خاص مضمون ہے۔ 2 اگست کو کویت پر عراق نے قبضہ کیا اور 18 اگست کو امریکی فوجیں سعودی عرب میں اتر نے لگیں۔ اس سیاق میں ستمبر کے اس شمارے کی بڑی اہمیت ہے۔

مصنف کو اس بات پر حیرت ہے کہ اسلام جو کبھی امن و آشتی کا مذہب ہوا کرتا تھا اور جس کے ماننے والے ادیان دیگر کے لیے وسعت قلبی کا اظہار کرتے تھے آجکل دنیا نے کیوں نفرت اور تشدد کی نفسیات میں مبتلا ہیں اور ان کے جنون و غضب کا بڑا حصہ ہم امریکیوں کے لیے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ یقیناً کوئی یہ یا یا کوئی وجہ نام تو عالم اسلام میں نہیں مگر ایران، لیبیا اور لبنان جیسے ممالک تو ہیں۔ ایرانی علما و حکام ہمیں دشمن خدا گردانتے ہیں اور ہمارے خلاف نفرت روز افزوں عروج پر ہے۔ آخر کیوں؟

مصنف اس سوال کو مختلف زاویے سے ٹٹولتے ہیں۔ کہتے ہیں شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ کل تک یورپ کی عیسائی ریاستیں جنھیں مسلمان کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے، آج ان سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔ کبھی سسلی، اسپین، پرتگال اور فرانس تک مسلمانوں کی مہم جوئی کے علاقے ہوتے تھے، آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔ یورپ کی شتی امریکہ نے آج پوری دنیا، بشمول عالم اسلام پر اپنی سطوت کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ مسلمان ایک مدت سے زوال کی طرف گامزن ہیں۔ انھوں نے اشتراکی روس اور مغرب دونوں سے شکست کھائی ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ اب خود ان کے اپنے ممالک میں اجنبی افکار و نظریات کا بول بالا ہے۔ حتیٰ کہ اب ان کے گھر بھی ان کے قابو میں نہیں، ان کی عورتیں اور ان کے نوجوان روایتی اقدار سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ بقول مصنف اس چوطرفہ حملے میں جہاں مسلمان اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہوں، غصہ اور جھنجھلاہٹ فطری ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ امریکہ یا مغرب کی منفی شبیہ کی ایک وجہ وہ جرمن مفکرین بھی ہو سکتے ہیں جنھیں ایک زمانے میں عربوں اور مسلمانوں میں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، مثلاً Rainer Maria Rilke, Ernst Junger اور Martin Heidegger وغیرہ جن کی تحریروں کا لب لباب یہ ہے کہ امریکہ

ایک ایسی تہذیب ہے جس میں ثقافت نہیں، جہاں دولت ہے مگر سکون نہیں، مادی آسائشات ہیں مگر روح سے خالی گویا سب کچھ مصنوعی ہے، ادھر ادھر سے جوڑ توڑ کے ایک ڈھانچہ کھڑا ہو گیا ہے مگر اس میں فطری نمو کی کوئی بات نہیں۔ اس میکانکی معاشرے میں وہ بات کہاں جو جرمن اور دوسری مستند اور روایتی معاشروں کا خاصہ ہے۔ بقول مصنف اس طرح کی باتیں تھیں اور پچاس کی دہائی میں مسلمانوں میں خاصی مقبول رہی ہیں۔ نازی جرمنی کے زوال کے بعد رہی سہی کسر مارکسزم نے پوری کر دی جس نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو جس کی قیادت اب امریکہ کے ہاتھوں میں تھی، بدی کے طور پر پیش کیا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست مگر مسلمانوں کے غیظ و غضب کا صرف یہ سبب تو نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے بعض مغربی ممالک کی سابقہ پالیسیوں کا بھی رول ہو۔ مگر اب تو صورت حال یہ ہے کہ فرانسیسی الجزائر چھوڑ گئے، انگریزوں نے مصر سے رخت سفر باندھا، مغربی تیل کی کمپنیاں بھی تیل کے کنویں چھوڑ گئیں حتیٰ کہ مغربی طرز ثقافت کے گرویدہ شاہ ایران بھی ملک چھوڑ کر چلے گئے مگر مسلمانوں کا غصہ ہے کہ کم ہو کر نہیں دیتا۔

بعض کہتے ہیں کہ شاید اس کا سبب اسرائیل کی حمایت ہو مگر امریکہ نے تو اسرائیل کو بعد میں تسلیم کیا اس سے پہلے تو سوویت یونین یہ کام کر چکا تھا۔ روسی اثر والے چیکوسلواکیہ سے اگر اسرائیل کو بروقت اسلحہ نہ پہنچتا تو شاید اس کی بقا خطرے میں پڑ جاتی۔ لیکن اس کے باوجود روس کے لیے عربوں میں کبھی وہ نفرت نہیں رہی۔ مصر، شام اور عراق روسی اسلحوں کے خریدار بنے رہے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ امریکہ سے عالم اسلام کی اس غیر معمولی خفگی کا سبب کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور گہری بات ہو۔ کہیں اس کا سبب امریکی امپیریلزم تو نہیں؟ مگر اس الزام کے لیے بھی امریکہ کے مقابلے میں سوویت یونین کہیں زیادہ سزاوار ہے جس نے آج بھی 50 ملین سے زیادہ مسلمانوں کو اپنے تسلط میں لے رکھا ہے۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کو امریکہ پر اس قدر غصہ کیوں آتا ہے؟ نومبر 1997ء کی بات ہے، اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے پر ایک ہجوم نے حملہ کیا اور اسے آگ لگا دی۔ وجہ؟ بتایا گیا کہ حرم مکی پر مسلم باغیوں کے حملے کے سبب عوام کے جذبات مشتعل تھے حالانکہ اس واقعے سے امریکہ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ فروری 1989ء میں اسلام آباد میں واقع USIS کے مرکز پر ایک مشتعل ہجوم نے دھاوا بول دیا جن کے دل شیطانی آیات نامی کتاب کی اشاعت سے مجروح تھے۔ حالانکہ کتاب کا مصنف ایک برطانوی شہری تھا اور امریکہ میں اس کتاب کی اشاعت سے پانچ ماہ پہلے یہ کتاب برطانیہ میں شائع ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے اس غیر معمولی غیظ و غضب کا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھیں دراصل اس تہذیب سے ہی چڑ ہے جس کے سامنے آج یہ خود کو بونا محسوس کرتے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ہم اہل مغرب اس صورت حال کے مداوے کے لیے کچھ زیادہ

نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہماری طرف سے کوئی پہل صورت حال کو مزید پیچیدہ بنا سکتی ہے۔

اس مضمون کو پڑھتے ہوئے بار بار خیال آیا کہ حرف "خ" سے صرف مسلم علما و دانش وروں کو ہی پریشانی نہیں بلکہ اغیار بھی ہماری دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں مبادا انہیں اپنے اصل مرض کا پتہ نہ چل جائے۔ روس کی مسلم دشمنی اپنی جگہ لیکن جن لوگوں نے ہمارے بنیادی ڈھانچے پر ضرب لگائی ہے اور جو خلافت اسلامیہ کے سقوط کے ذمہ دار ہیں وہ دوری برطانوی استعمار ہے جس کا توسیعہ خود کو امریکہ سمجھتا ہے۔ مغرب کی سطوت دراصل ادارہ خلافت کے غیاب سے قائم ہے۔ مغرب سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن اسے یہ گوارا نہیں کہ خلافت کا مرکزی ادارہ پھر سے قائم ہو۔ عالم اسلام کی تنظیم نو میں مغرب کی موت کا سامان پنہاں ہے۔ معمولی عقل کا آدمی بھی اس نکتے سے واقف ہے کہ فطری اور افرادی وسائل سے مالا مال، تہذیب کے مرکز میں واقع عالم اسلام اگر صرف تیل اور گیس کی دولت پر بھی اپنا کنٹرول حاصل کر لے تو جدید دنیا مسلمانوں کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ پھر مسلمان اگر مغرب اور امریکہ کے مقابلے میں خود کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں اور انہیں اس صورت حال پر طیش آتا ہے تو یہ بات ہمارے امریکی دانش وروں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟

رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ فضا میں جنگی جہازوں کی گونج سنائی دے رہی۔ الدفاع المدنی کے سائرن ابھی خاموش ہیں۔ البتہ ایک انجانے خوف کی وحشت گہری ہوتی جاتی ہے۔ میں سوچ کر حیران ہوں کہ ایک اسکڈ کے خوف نے سارے شہر کا برا حال کر رکھا ہے۔ بغداد اور بصرہ کے مکینوں پر کیا گذر رہی ہوگی جہاں شب و روز مہلک بموں کی بارش جاری ہے۔

24 جنوری 1991ء

یہ جنگ نہیں بلکہ امت مسلمہ کی نسل کشی کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ محمد کا کہنا ہے کہ میں مصری ہوں مگر اس طرح عراق پر حملے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ پیچھے زمینی حقائق پر مبنی جستہ جستہ خبریں آنے لگی ہیں۔ کوئی ماجد محمد جن کا تعلق مصر سے ہے اور جو پیشے سے کار مکینک ہیں بڑی مشکل سے جان بچا کر اردن کی سرحد تک پہنچے ہیں انھوں نے عراقی شہر فلوجہ کی تباہی کا منظر کچھ اس طرح کھینچا ہے "میں نے وہاں شاہراہوں کو لاشوں سے پٹا دیکھا۔ ہم لوگوں نے زخمیوں کو اسپتال پہنچانے میں مدد کی۔ ان میں بہت سے معصوم بچے تھے جن کی عمریں پانچ چھ سال سے زیادہ نہ ہوں گی۔ کوئی مجھے بتائے کہ ان بچوں کا کیا گناہ تھا۔ تمھیں انتقام لینا ہے تو صدام سے لو عراقی عوام نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ یہ تو نرا پاگل پن ہے۔ عراق کے افق پر خون کی سرخی پھیل گئی ہے"۔

عصام مصطفیٰ جو بغداد میڈیکل سٹی ہاسپٹل میں طب کے طالب علم ہیں انھوں نے اخباری نمائندوں کو بتایا ہے کہ ان کی موجودگی میں ایک زخمی عورت لائی گئی جس کا بایاں ہاتھ غائب تھا۔ دو بچے پوری طرح کچلے

ہوئے تھے اور 14 سالہ لڑکا بری طرح زخمی تھا۔ ہر آدھ گھنٹے پر کوئی ایمبولینس اسی طرح زخمیوں سے لدی آتی۔

خبر ہے کہ بہت سی اپارٹمنٹ بلڈنگ اپنے مکینوں کے ساتھ زمیں بوس ہو گئیں۔ خشک دودھ کا کارخانہ بھی بمباری کی زد میں آیا ہے۔ مشی (ابو احمد) جو ایک ٹیکسی ڈرائیور ہیں اور جو اس خطرے کی گھڑی میں لوگوں کو بغداد سے اردن لانے میں جتے ہیں انھوں نے ایسے کئی واقعات بتائے جہاں بمباری نے مکینوں اور مکانوں کو چشم زدن میں ملبوں میں تبدیل کر دیا۔ بروس وولکوٹ ایک امریکی شہری ہیں جن کا تعلق ایک جنگ مخالف تنظیم سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے B-52 بمبار طیاروں کو متحرک دیکھا تو پھر سے ویتنام پر امریکی حملوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

اخباری رپورٹوں سے چھن کر آنے والی ان خبروں کے برعکس CNN اور دوسرے امریکی نیٹ ورک اس جنگ کو ایک تماشے کے طور پر پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ فوجی بریفنگ میں بھی سارا زور اس بات پر ہے کہ عراق کی جنگی صلاحیت اور اس کے ساز و سامان کو کس حد تک ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ انسانی جانوں کے اتلاف کو دوسرے سے موضوع بحث ہی نہیں بناتے۔ شاید یہ جنگ نئی ٹکنالوجی اور اسمارٹ بموں کے سبب انسانی جانوں کو سرے سے زک نہیں پہنچاتی۔ یا مشرق کے یہ انسان ان مغربیوں کی نظر میں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے پھر ان کی موت پر واویلا کیوں کیا جائے؟

25 جنوری 1991

ڈائری لکھتے ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے وہ سب کچھ لکھ ڈالوں جس کے بیان کی قلم میں تاب نہیں۔ کبھی غیر معمولی واقعے یا بحران کے لمحات میں جینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ رسام طبعی کہتے ہیں کہ ازمۂ خلیج ہماری ملی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ سقوط خلافت کے بعد اس سے بڑا المیہ اور بحران نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ڈائری مجھ سے سرگوشی کرنے لگی ہو: مقتل عثمان کے وقت تم موجود نہیں تھے، سقوط بغداد بھی تمہارے خیال میں پیش آیا۔ غرناطہ، دہلی اور حیدرآباد کے سقوط بھی تم سے دامن بچا گئے۔ مگر خلیج کے بحران کو تم قریب سے دیکھ رہے ہو پھر کچھ کرتے کیوں نہیں؟ عبداللہ نصیف کہتے ہیں کہ جب بڑے بڑوں کی نہیں چل رہی ہے تو بھلا میں کیا کر پاؤں گا۔ ہر رات جب عراقی شہروں پر بمباری ہوتی ہے ایسا لگتا ہے کہ بے بسی کی دھند میں مزید اضافہ ہو گیا ہو۔ سعودی جنگی پائلٹ بھی اس مہم میں شریک ہیں۔ اپنے ہی ہم ملی پر موت برساتے ہوئے وہ جانے کس کیفیت سے دوچار ہوتے ہوں گے۔ ایران عراق جنگ میں تو انھیں غیر سے فرقہ پرستی کی ڈھال میسر آگئی تھی، ایک طرف شیعہ تھے اور دوسری طرف سنی۔ مگر یہاں تو دونوں ہی طرف سنی ہیں اور دونوں ہی عربیت کے تعصب سے پوری طرح لیس۔

بات یہ ہے کہ جب فکری سرحدیں پامال ہو جائیں تو جغرافیائی اور سیاسی سرحدیں بھی محفوظ نہیں رہ پاتیں۔ سعودی، ایرانی، قطری، کویتی، عمانی، اور اس قبیل کی دوسری قومی شناختیں ہماری دینی اور ملی شناخت سے

راست متصادم ہیں۔ یہی حال شیعہ، سنی، اسماعیلی، اباضی، دروزی، علوی، بہائی، قادیانی اور دیگر غیر اسلامی گروہ بندیوں کا ہے جو امت واحدہ سے کھلی بغاوت کا اظہار ہے۔ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی اور جعفری، زیدی کے لاحقے بھی دین محمدی میں بعد والوں کی جسارتیں ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں ہم بنیان مرصوص کیسے بن سکتے ہیں؟ آج جو لوگ خلافت کا احیا چاہتے ہیں انھیں سب سے پہلے اس عصرِ محمدی کی فضائیں درست کرنی ہوں گی جو مدتِ مدید سے غیر آباد اور سونا ہے اور جس کے مقابل مزعومہ متبعین محمد کے چھوٹے چھوٹے خیمے قائم ہو گئے ہیں۔ میں نے ڈائری کے صفحات الٹے۔ پہلا صفحہ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء کی آیت سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے یہ باب مسجد نبوی کے قدیم حصے میں مواجہ شریف کے قریب بیٹھ کر لکھا تھا تب سے اب تک آگے لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

فرانسیسی اور برطانوی استعمار کو ہمارے داخلی انتشار کا خوب پتہ ہوگا ورنہ جنگ عظیم اول کے دوران سائکس اور پیکو کو یہ ہمت کبھی نہ ہوتی کہ عالم اسلام کے عین قلب میں نئی سرحدیں کھینچ دے۔ ہماری تقسیم پر دوسرے بھی اسی وقت مہر لگاتے ہیں جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وحدتِ ملی کے مسئلہ پر اب ہم اتنے حساس نہیں رہ گئے ہیں۔

رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ فضا میں آج پھر خوفناک شور بلند ہو رہا ہے جیسے شہر پر میزائل کا حملہ ہوا ہو۔ الدفاع المدنی کے سائرن بج اٹھے ہیں۔ اب میں خطرے کی آواز سن کر نیچے نہیں جاتا اور نہ ہی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھتا ہوں۔ ایسا نہیں کہ میں بیزار ہو گیا ہوں بلکہ ان نشریات کی صداقت سے میرا ایمان اٹھتا جا رہا ہے۔ صحرا میں شام کے جھٹپٹے اور اس پس منظر میں ایک اونٹ کی تصویر کے بجائے اب ٹیلی ویژن کے پردے پر جنگی طیاروں کی لینڈنگ کے مناظر دکھائے جا رہے ہیں۔ میرے اندر ایک پراسرار خوف سرایت کرتا جا رہا ہے، اپنی موت کا نہیں، بلکہ اس زمین کے باسیوں کا جہاں سے یہ طیارے کامیاب مہم جوئی کے بعد لوٹ رہے ہیں۔

26 جنوری 1991ء

خبر ہے کہ آج امریکی دارالحکومت واشنگٹن اور یورپ کے مختلف شہروں میں بڑے پیمانے پر جنگ مخالف مظاہرے ہو رہے ہیں۔ سابق امریکی فوجی اور بعض موجودہ امریکی فوجیوں کی مائیں اس جلسے سے خطاب کر رہی ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اگر زمینی جنگ شروع ہو گئی تو ان کے لاڈلوں کی زندہ واپسی کا امکان جاتا رہے گا۔ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے صدر بش یہ کہتے پھرتے تھے کہ امریکی ان کے ساتھ کھڑے ہیں اور یہ کہ وہ کسی ایسی تحریک سے واقف نہیں جو جنگ کے خلاف ہو۔ حالانکہ شروع سے ہی امریکہ اور یورپ کے مختلف شہروں میں جنگ خلیج کی مخالفت میں مظاہرے ہوتے رہے ہیں۔ کارپوریٹ میڈیا میں آج کے اس مظاہرے کی خبر بھی بس واجبی سی آئی ہے۔ پولس نے شرکا کی تعداد پچھتر ہزار بتائی ہے جبکہ منتظمین ایک لاکھ کا

دعویٰ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 500 تو صرف بیس مختلف شہروں سے آئی ہیں۔ ایک بس میں اگر پچاس آدمی سماتے ہوں تو صرف بس سے آنے والوں کی تعداد پچیس ہزار بنتی ہے۔ دوسرے ذرائع اس پر مستزاد ہیں۔ لگتا ہے کہ امریکہ میں بھی میڈیا کا حال تیسری دنیا سے مختلف نہیں ہے۔

دو ڈھائی ماہ پہلے کی بات ہے، ابھی جنگ مخالف مظاہروں میں وہ شدت نہیں آئی تھی، میں لندن میں واقع ایک بین الاقوامی تنظیم (WRI) کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ بحث اس مسئلہ پر چھڑ گئی کہ عراق اور امریکہ کی اس معرکہ آرائی میں خدا کس کی طرف ہے؟ ایک صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا کہ خدا ہمیشہ کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ ہوتا ہے اور عراقی عوام کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں، بش ان کے خلاف ساری دنیا کو اکٹھا کر لایا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ خدا ان کے ساتھ نہ ہو۔ ایک صاحبہ فرمانے لگیں کہ یہ بنیادی طور پر انا کی جنگ ہے، بش اور صدام کے انا کی، اور دونوں میں سے کوئی اس لائق نہیں کہ لوگ ان کے لیے جان دیں۔

تحریک امن والوں کی بھی ایک الگ دنیا ہے۔ انہیں اپنے سیاستدانوں کی جنگی پالیسیاں پسند نہیں۔ وہ اس کے ناقد تو ضرور ہیں مگر جانتے ہیں کہ وہ اسے بدل نہیں سکتے۔ وہ محض ایک علامتی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ مغرب کی تحریک امن میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ یہ ایک مجموعہ اضداد ہے جو اس سرمایہ دارانہ نظام میں اپنے بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ ان کے رشتے ماسکو سے جا ملتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ میں ان کے درمیان اٹھتا بیٹھتا آیا ہوں۔ یہ باغی لوگ ہیں۔ مگر کمزور باغی۔ یہ صدائے احتجاج تو بلند کرتے ہیں مگر اس باجبروت نظام کی بساط لپیٹنے کا ان میں یارا نہیں۔ حکومتیں بھی سمجھتی ہیں کہ ان تنظیموں کا وجود اور ان کے یہ عوامی مظاہرے سرمایہ دارانہ نظام کی پرکشش تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان بے ضرر مظاہروں کے سبب عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب میں متبادل نقطۂ نظر کے لیے بڑی گنجائش ہے۔ گویا تحریک امن بھی خواہی نخواہی اس نظام کا توسیعہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظاہرے اور بمباری دونوں ایک ساتھ جاری ہیں۔ سنا ہے کہ ان دنوں امریکہ میں حب الوطنی کا بخار اتنا تیز ہے کہ بعض جنگ مخالف تحریکیں بھی we are with the troops کا نعرہ بلند کر رہی ہیں۔

مجھے Bad Religion انقلابی طائفے کا وہ جنگ مخالف نغمہ یاد آ رہا ہے جس کی ان دنوں بڑی شہرت ہے۔

عنوان ہے:

Heaven is Falling

As I walk beneath the valley, I shall fear no evil

For thanks to King George and his rainbow cabinet, today murder is legal

کہتے ہیں کہ یہ نظم Psalm 23 کی پیروڈی ہے جس کی اصل عبارت یوں ہے:

Yea, though I walk through the valley of the shadow of death, I will fear no evil

تو کیا مغرب میں تحریکِ امن (Peace Movement) بھی امن کے نام پر بس ایک لطیف طنز بن کر رہ گیا ہے؟

27 جنوری 1991

ہفت روزہ المسلمون میں خاص التزام سے دیکھتا ہوں۔ پھر بھی پتہ نہیں کیسے پچھلے ہفتے کا شمارہ بروقت نہ دیکھ سکا۔ شیخ بن باز کا فتویٰ اس شمارے کی خاص چیز ہے۔ غالباً یہ دوسرا فتویٰ ہے جو شیخ کی سربراہی میں سینئر علماء کی طرف سے صدام حسین کی مخالفت میں شائع ہوا ہے۔ پہلے فتوے میں امریکی افواج کی آمد کو جائز ٹھہرایا گیا تھا۔ اس دوسرے فتوے میں عراق پر اتحادیوں کے حملے کو اسلامی جواز بخشا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے دشمن سے برسرِ پیکار ہیں (بشمول غیر مسلم افواج) وہ دراصل کارِ جہاد میں شریک ہیں۔ ابھی دو دن پہلے جمعہ کے خطبے میں امامِ حرم نے عراقی عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ صدام حسین جیسے طاغیہ کا تختہ پلٹ دیں۔ دوسری طرف صدام حسین اپنی جنگ کو جہاد باور کرانے پر مصر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کافر امریکیوں کے مقابلے میں وہ تن تنہا خدا کی نصرت کے بھروسے ڈٹ جانے والوں میں ہیں۔ عراقی میڈیا ایسی تصویروں کی کثرت سے اشاعت کر رہا ہے جس میں مردِ مجاہد صدام حسین کو دعاؤں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ جنگ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی ہے مسجد و محراب میں صدام کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔ بعض ثقہ علماء تو صرف اس لیے صدام کے حمایتی بن گئے ہیں کہ بقول ان کے صدام نے اسرائیل کو چیلنج کیا ہے اس پر میزائل سے مسلسل حملے کر رہا ہے۔ پتہ نہیں حق کس کے ساتھ ہے۔ میں اب تک اس صورتِ حال کو جمل اور صفین کے تاریخی تناظر میں دیکھ رہا تھا۔ ان دنوں ایک نیا زاویہ ہاتھ آیا ہے۔ حیران ہوں کہ چیزیں کیا ہوتی ہیں اور کیا دکھائی دیتی ہیں۔

ژاں بودریار (Jean Baudrillard) ایک فرانسیسی فلسفی ہیں۔ ان دنوں ان کے ایک مضمون The Gulf War will not take place نے علمی حلقوں میں دھوم مچائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس جنگ کا ہر سو چرچا ہے اور جو ٹیلی ویژن اسکرین پر ناظرین کو دکھائی جائے گی یا دکھائی جا رہی ہے وہ جنگ کے اصل مناظر نہیں بلکہ اس کا ایک جھوٹا پرتو (simulacrum) ہے۔ جس طرح ڈزنی لینڈ تخیل کی پیداوار ہے

جس پر بسا اوقات اصل ہونے کا گمان ہوتا ہے اسی طرح ٹیلی ویژن پر جنگ خلیج کے جو مناظر دکھائے جا رہے ہیں اس کا تعلق حقائق سے نہیں بلکہ ساختہ حقائق سے ہے جس پر بسا اوقات حقائق کا گمان ہوتا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں تو یہ اصل حقائق پر بھی بازی لے جاتے ہیں۔ بودریلارڈ اس صورتِ حال کو hyperreality سے تعبیر کرتے ہیں۔ ورنہ بھلا ایسی کون سی جنگ ہوگی جس میں بنکر شکن بموں کی بارش ہو رہی ہو، مہلک ترین جنگی اسلحوں اور خوف ناک ترین جنگی ساز و سامان کے ساتھ سات لاکھ اتحادی فوجی اپنی تکنیکی برتری کے مظاہرے کے لیے شب و روز سرگرم ہوں اور ان سب کے باوجود انسانی جانوں کے اتلاف کی کوئی اطلاع آتی ہو اور نہ ہی خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں اور عمارتوں کے ملبے دکھائے جاتے ہوں۔ اتنی خوش نما جنگ جس پر جشنِ بہاراں کا گماں ہوتا ہو حقیقت کا واقعی اظہار تو نہیں ہو سکتا۔ بقول بودریلارڈ یہ جنگ تو شروع ہونے سے پہلے ہی جیت لی گئی ہے اس لیے کہ جب اطلاعات پر آپ کا قبضہ ہو اور ٹکنالوجی کی مدد سے آپ ایک مصنوعی منظر نامے کو جنم دے سکتے ہوں تو پھر شکست کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے جنگ کہنا بھی تکلف ہے۔ اس میں فریقِ ثانی تو شرکت کرتا بھی نظر نہیں آتا۔ اصل جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جنگ کا کریہہ چہرہ لوگوں کے سامنے نہیں آتا۔ عام ناظرین ٹیلی ویژن اسکرین پر دکھائی جانے والے ساختہ مناظر کو اصل سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ گویا ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ایک طرح کی ساختہ حقیقت (simulation) ہے اصل حقیقت (reality) نہیں۔

اب جو میں نے ساختہ اور اصل حقیقت کے زاویے سے عالم اسلام پر نگاہ ڈالی ہے تو حیران اور ششدر ہوں۔ کیا صدام اصل مجاہد نہیں۔ مسلے پر ان کی وہ تصویر جس میں وہ خدا سے نصرت کے طلب گار دکھائے گئے ہیں، محض ایک ساختہ حقیقت ہے؟ ایک بعثی مسلمان سے جس کی زندگی دینی حوالے سے خالی رہی ہو جہاد کی توقع نہیں کی جا سکتی؟ مگر دوسری طرف امام حرم اور بن باز جس طرح ایک مسلم ملک پر بہیمانہ بمباری کی وکالت کر رہے ہیں اسے بھی تو اسلام کا صحیح موقف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیا ہمارے علما و دانش ور اور حکمراں بھی ساختہ حقیقت (simulation) کے طلسم میں پھنس گئے ہیں؟ یا یہ لوگ خود بھی ایک simulation کی پیداوار ہیں؟ خلیجی بحران نے حکمرانوں کے کھوکھلے جاہ و حشم کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔ انھیں اپنی بقا کے لیے باہر سے فوج بلانا پڑی ہے۔ یہ بڑے بڑے فوجی منصب دار جو اپنے سینوں پر تمغے سجائے نظر آتے تھے اب پتہ چلا کہ انھوں نے اس ترکیب سے اپنے ضعف پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ گویا جو کچھ نظر آتا تھا وہ اصل حقیقت نہ تھی۔

جب صدام کا جہاد لائقِ اعتنا نہیں اور اس سے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تو امامِ حرم کا وہ خطبہ جس میں وہ صدام کے خلاف خروج کی اپیل کرتے نظر آتے ہیں حقیقت کا آئینہ دار کیسے ہو سکتا ہے؟ سنی اسلام اور

خاص طور پر سلفی وہابی شیعے کے علما تو خروج کے سرے سے قائل نہیں۔ جہیمان العتیبہ کی تحریک اصلاح کو بغاوت کے طور پر دیکھا گیا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ چیدہ کبار علما اپنے فتووں کو سیاسی مصالح کے تابع کر دیتی ہے۔ کل تک اخرجوا المشرکین والیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب کہنے والی زبانیں آج نہ صرف یہ کہ امریکی افواج کو اپنی محافظت کے لیے استعمال کرنا جائز سمجھتی ہیں بلکہ ان کی مدد سے ایک برادر مسلم ملک اور اس کی عوام کو تہ تیغ کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں سمجھتیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حقیقت اتنی دھندلی بھی ہو سکتی ہے۔ ایڈورڈ سعید نے Orientalism کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ مشرق کے بارے میں ایک ایسا ڈسکورس ہے جس میں خود اہل مشرق کو بولنے کی اجازت نہ ہو۔ ہمارے علما اگر اسلام کی ساختہ تصویر کے خوگر ہو گئے ہیں تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ان کے مذہبی اور مسلکی ڈسکورس میں خدا کی آواز مشکل ہی سے سنائی دیتی ہے۔ بارالہا! ساختہ حقیقت اور اصل حقیقت کے بیچ ہم کب تک ہچکولے کھاتے رہیں گے؟

28 جنوری 1991ء

ادھر دو تین دنوں سے [illegible] اضطراب کا ماحول تشویشناک ہے۔ جنگ کی آگ اب ہمارے دروازے تک آپہنچی ہے۔ ابو سعید کے خالہ زاد بھائی جو بغداد کے نواح میں ٹیلی کمیونیکیشن انجینیر کی حیثیت سے تعینات تھے، خبر ہے کہ بمباری میں مارے گئے ہیں۔ بم چونکہ رہائشی علاقے پر گرا ہے اس لیے پوری فیملی کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ابو سعید مسلسل فون بوتھ کے چکر لگا رہے ہیں مگر کہیں سے کوئی تشفی بخش خبر نہیں ملتی۔ بغداد کے بیشتر فون نمبر ناقابل [illegible] مواصلات پر بمباری کے سبب ناکارہ بنا دیے گئے ہیں۔

آج تعزیت کے لیے شیخ خلف اللہ تشریف لائے تھے۔ دیر تک محفل کی زینت رہے۔ شیخ جامعہ امام میں شریعہ کے استاد ہیں۔ ان سے مجھے بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔ ایک زمانے میں میرے ایک کرم فرما اور معروف سعودی عالم شیخ عبد اللہ قصیر کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ میرا عقیدہ درست کروائیں جو بقول ان کے سلف صالحین کے راستے سے دور جا پڑا تھا۔ شیخ خلف اللہ میرے استاد قرار پائے جو کچھ عرصے باقاعدہ مجھے تعلیم دیتے رہے۔ شیخ کا علم گہرا اور مستحضر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ دماغ کے استعمال سے منع نہیں کرتے اور نہ ہی وہ کسی بات کو صرف اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ یہ سلف صالحین کا موقف رہا ہے۔ شیخ دیر تک ابو سعید کو ڈھارس بندھاتے رہے۔ ساتھ ہی امت کے ضعف اور اس کی بے بسی کا نوحہ کرتے رہے۔ ایک صاحب سے رہا نہ گیا، بولے کہ شیخ کس امت کی بات کر رہے ہیں آپ؟ کہاں ہے وہ امت؟ اتحادی افواج میں دس سے زیادہ مسلم ممالک کی فوجیں شامل ہیں جو اپنے ہی جسد ملی کو تاراج کر رہی ہیں۔ اگر ان کے اندر ایک امت ہونے کا کچھ بھی شعور ہوتا تو عراق کویت پر حملہ آور ہی کیوں ہوتا اور ایک لاکھ سعودی فوجی آج امریکہ کی قیادت میں اپنے ہی

ہم مذہبوں سے برسرپیکار کیوں ہوتے۔ یہ امت وسمت کینے کی باتیں ہیں، حکمرانوں کو بس اس بات کی فکر ہے کہ ہماری کرسی بچی رہے، ابو العباس کو اپنا تخت چاہیے چاہے اس کے لیے پورا عراق ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے۔ اور یہ پہلی بار نہیں ہو رہا ہے، جب 1492ء میں غرناطہ کا سقوط ہو رہا تھا اس وقت بھی تو عثمانی ترکوں نے اسے بچانے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی؟

شیخ خلف بن مناقشوں سے دامن بچانے کے عادی ہیں مگر وہ اس سوال کی چبھن کو نظر انداز نہ کر سکے۔ فرمایا کہ سوال اہم اور دلچسپ ہے۔ اس طرح کے اور بھی سوالات ہیں جو مکمل اور صحیح تاریخی تناظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔ مثلاً یہ سوال کہ اندلس کی اموی خلافت کے پایہ تخت قرطبہ کے سقوط کا حادثہ 1236ء میں پیش آیا۔ اس کے چند برس بعد 1248ء میں اشبیلیہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ غرناطہ کی سلطنت تو اس کے بعد بھی کوئی ڈھائی سو سال تک قائم رہی۔ قدرت نے تو انھیں بڑی مہلت دی۔ مگر وہ قرطبہ اور اشبیلیہ کے سقوط کے بعد بھی نوشتہ دیوار کیوں نہ پڑھ سکے؟ اب آؤ اصل سوال کی طرف۔ یہ کہنا درست نہیں کہ عثمانی ترکوں نے اندلس کے مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ 1453ء عثمانی خلافت کے جاہ و حشم کا سال ہے جب انھوں نے بازنطینی ریاست کے تاریخی پایہ تخت قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ اس فتح عظیم کو ابھی چالیس سال بھی نہ ہوئے تھے کہ 1492ء میں اندلس میں مسلمانوں کی آخری ریاست غرناطہ کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ عثمانی ترک اگر بروقت اپنی فوج کا رخ اندلس کی طرف موڑ دیتے تو اس حادثے سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن صورت حال اتنی سادہ نہیں تھی۔ 1492ء ہی وہ سال ہے جب کولمبس نئی دنیا اور نئے وسائل کی تلاش میں نکلا۔ اسپین یورپ کی ایک ابھرتی ہوئی قوت تھی۔ اب غرناطہ پر مکمل قبضے کے بعد اسے یہ موقع ملا تھا کہ وہ دور دراز کے علاقوں میں اپنے مشن بھیجے۔ ایک ایسی ابھرتی ہوئی قوت سے جو مسلسل مسلم ریاستوں کو زیر کرتی آ رہی ہو اور جس کی ترکتازیوں کا سلسلہ شمالی افریقہ کے ساحلوں تک پھیلا ہوا ہو نمٹنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی جب غرناطہ کے ناصری حکمرانوں نے مدد کی اپیل کی تو خلیفہ نے ایک مختصر بحری بیڑہ مدد کے لیے بھیجا جو ساحلی علاقوں میں کچھ کارروائی کے بعد واپس آ گیا۔ عثمانی ترک اس وقت کسی بڑی کارروائی کی پوزیشن میں نہ تھے ان کی فوجیں شمالی افریقہ کے مملوک حکمرانوں سے لوہا لینے میں مصروف تھیں۔ ایک عرصہ انھیں شمالی افریقہ پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے میں لگ گیا جہاں انھیں کئی بار اسپینی ریاست کو بھی مبارزت دینا پڑی۔ غالباً اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عثمانیوں کی سمندری قوت عیسائی اسپین کے مقابلے میں کمتر تھی اور ان کے علماء اس خیال کے قائل ہو گئے تھے کہ خدا نے سمندر پر اقتدار عیسائیوں کو دے رکھا ہے جبکہ خشکی کا اقتدار ان کے حصے میں لکھ دیا گیا ہے۔ عثمانی ترکوں نے صرف یہ کہ شمالی افریقہ کے خشک راستے کے ذریعہ اسپین تک پہنچنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے مصر، تیونس،

تر پولی اور مراکش کے وسیع علاقے پر کنٹرول حاصل کر لیا بلکہ ویانا کے محاصرے سے بھی باز نہ آئے جو اس وقت اسپین کی حکمرانی میں تھا۔

شیخ نے بتایا کہ سچ تو یہ ہے کہ عثمانی سلطنت مسلسل اسپین کے کیتھولک حکمرانوں سے برسرِ پیکار رہی۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر یورپ میں پروٹسٹنٹ تحریک کی ہمت افزائی بھی کرتی رہی۔ ملکہ برطانیہ اور ان کے سفرا اس زمانے میں ترکوں سے سیاسی اور فوجی مدد کے طلب گار ہوتے۔ وہ خلیفۂ وقت کو اس قسم کے خطوط لکھتے جس میں بتایا جاتا کہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے مسلمانوں کا ایک فطری تعلق ہے کہ وہ دونوں ہی بت پرستی کے خلاف ہیں۔ اس لیے بت پرست کیتھولک عیسائیوں کے مقابلے میں ان کی مدد مسلمانوں کا دینی فریضہ بن جاتا ہے۔

فرمایا کہ البتہ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ عثمانی ترکوں کی ان تمام کوششوں کے باوجود نہ تو مراکش کے ساحلوں سے اور نہ ہی ویانا کے دروازے سے مسلمان یورپ میں داخل ہو سکے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سخت موسم کے سبب انھیں ویانا کا محاصرہ اٹھانا پڑا اور اس ارادے سے گئے تھے کہ اگلے سال دوبارہ آئیں گے لیکن اگلے سال دوسرے محاذ پر ایسے الجھے کہ دوبارہ آنے کا موقع نہ مل سکا۔ رہا شمالی افریقہ کا محاذ تو 1574ء میں انھوں نے تیونس دوبارہ فتح کیا، 1476ء میں مراکش ان کی عملداری میں شامل ہوا۔ توقع تو یہ تھی کہ اب ساحل پار اسپین پر فوجی کارروائی ہوگی جہاں موریسکو مسلمان جنھیں جبراً عیسائی بنایا گیا تھا شدت سے عثمانی حملے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ نہ ہوا۔ عثمانیوں کی سوچ میں اب تبدیلی آچکی تھی۔ 1580ء میں انھوں نے اسپین کے ساتھ معاہدۂ امن پر دستخط کر دیے تاکہ اب یکسوئی کے ساتھ صفویوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس معاہدے کے بعد اسپین کے مسلمانوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ 1609ء میں جب حکومت نے ان کے جبری انخلاء کا فیصلہ کیا تو ان کی مدد کو کوئی نہ آیا۔ شیخ خلف اللہ یہ قصہ سناتے ہوئے افسردہ ہو گئے۔ فرمایا کہ ہماری تاریخ میں تین لمحات ایسے آئے ہیں جب اگر ہم نے بروقت کارروائی کی ہوتی تو آج صورتِ حال مختلف ہوتی۔ ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ اگر معرکہ بلاط الشہداء میں چارلس مارٹل کو شکست ہو گئی ہوتی تو آج آکسفورڈ کے اسکولوں میں قرآن کی تفسیر پڑھائی جا رہی ہوتی۔ میں اس پر دو اور مواقع کا اضافہ کرتا ہوں: اگر ترک اگلے سال ویانا کے محاصرے کے لیے وقت نکال پاتے اور بالفرض اگر 1580ء میں ترکوں نے اسپین کے ساتھ معاہدۂ امن کے بجائے موریسکو مسلمانوں کی مدد کا فیصلہ کیا ہوتا تو تاریخ مختلف ہوتی۔ افسوس کہ بہت سی قوت اپنوں سے مقابلہ آرائی میں ضائع ہو گئی اور جب آنکھ کھلی تو دنیا بدل چکی تھی۔ نہ صفوی باقی رہے اور نہ ہی عثمانی۔ عالمِ اسلام پر اب مختلف یورپی اقوام کا قبضہ تھا۔

شیخ خلف اللہ کا بیان جو ابو سعید کی تعزیت سے شروع ہوا تھا ہمارے ملی اور قومی پرسے کا اظہار بن گیا۔

29 جنوری 1991ء

خبر ہے کہ عراق نے اپنے بہت سے جنگی طیارے ایران بھیج دیے ہیں تاکہ جب زمینی جنگ شروع ہو تو اس میں کام آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایران کو اس جنگ میں گھسیٹنے کی ایک کوشش ہو۔ ایران کا کہنا ہے کہ اس نے یہ تمام جہاز ضبط کر لیے ہیں۔ ایران سے خلیجی جنگ کے سلسلے میں مختلف قسم کی آوازیں آرہی ہیں۔ انقلابیوں کا ایک پرجوش گروہ اس خیال کا حامل ہے کہ امریکہ جب خطے میں اتنا قریب آگیا ہے تو اس سے نمٹ لینا چاہیے۔ البتہ صدر رفسنجانی اپنے دو پرانے دشمن صدام اور امریکہ کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھ کر خوش ہیں۔ انھیں تشویش اس بات کی ہے کہ امریکہ کا قیام خطے میں طول نہ اختیار کر جائے۔ انھوں نے جمعہ کے خطبے میں اپنے موقف کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے کہ اس وقت عراق کی مدد کرنے کا واضح مطلب ہے کہ ہم خلیج فارس کو خلیج عربی میں بدلنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ کیا ایسا کرنا ہمارے لیے خودکشی نہیں ہوگا؟ خامنہ ای نے کہا ہے کہ امریکہ اور عراق دونوں ہی غلط، ناپاک اور بیکار مقاصد کے لیے جنگ کر رہے ہیں اس لیے ان میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔

دوسرے مسلم ملکوں کی طرح ایران میں بھی صدام کے لیے ہمدردی بڑھتی جا رہی ہے حالانکہ آٹھ سالہ ایران عراق جنگ کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جس میں کوئی نصف ملین سے زیادہ انسانی جانیں تلف ہوئیں اور ایک ٹریلین ڈالر سے زیادہ کا سرمایہ ضائع ہوا۔ کہتے ہیں کہ جون ۱۹۸۱ء میں جب اسرائیلی جنگی طیاروں نے عراق کے نیوکلیر ری ایکٹر پر بمباری کی تھی تو اس میں اسے ایرانی فضائیہ کا تعاون بھی حاصل تھا۔ یہ بات یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انقلاب سے پہلے، رضا شاہ پہلوی کے دور میں، ایران اسرائیلی اسلحوں کا بڑا خریدار رہ چکا تھا اور انقلاب کے بعد بھی آٹھ سالہ جنگ کے دوران اس کا انحصار بڑی حد اسرائیل پر رہا۔ اسرائیل کے لیے یہ ایک بڑی اور منفعت بخش تجارت تھی اور ایران کے لیے یہ خفیہ رابطہ ملکی بقا کا مسئلہ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت ایریل شیرون اسرائیل کے وزیر دفاع تھے اور ریگن انتظامیہ ایران کو اسلحہ کی فروخت روکنے کے لیے پرزور سرکاری مہم بھی چلا رہی تھی۔

آج عام عرب اسٹریٹ ہی نہیں بلکہ پرجوش ایرانی حلقوں میں بھی اس بات پر اظہار تاسف پایا جاتا ہے۔ اے کاش عراق ایک نیوکلیائی طاقت ہوتا تو امریکی اتحادی ہماری زمینوں اور ہمارے وسائل پر اس طرح ڈاکے نہ ڈالتے۔ مگر سوالات تو اور بھی ہیں۔ یہ مسئلہ کی صرف دم ہے۔ شیخ خلف اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے مسائل تہہ دار ہیں۔ بالکل پیاز کے چھلکوں کی طرح۔ جب تک ہم اس کی جڑ تک نہ پہنچ جائیں بات سمجھ میں نہیں آتی۔ صدام کا یہ اعتراض درست ہے کہ کویت کوئی مستقل علیحدہ ملک نہیں۔ عثمانی عہد میں وہ بصرہ کا حصہ رہا ہے۔ انگریزوں

نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مصنوعی سرحدیں بنائیں اور اپنے وفاداروں کو عالم اسلام کے مختلف علاقے سونپ دیے۔ امت کے فطری وسائل پر اب چند خاندانوں کی اجارہ داری ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ عالم اسلام متحد ہو مگر جو لوگ اتحاد کے نام پر کویت پر فوج کشی کے مجرم ہیں انھیں اس بات کا حق کس نے دیا؟ صدام بھی تو کسی خلافت کے قیام کے لیے نہیں اٹھے ہیں۔ وہ عالم عرب کے قائد بننا چاہتے ہیں۔ جمال عبد الناصر سے بڑے قائد۔ انھیں ان کا یہ جنون مبارک ہو۔ مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ امت مرحومہ کی باقیات آج لوگوں کی شخصی اور خاندانی وجاہت کے قیام میں صرف ہو رہی ہے۔ کہیں صدام ہیں تو کہیں قذافی کہیں حسنی مبارک ہیں تو کہیں خلیجی ممالک کے شیوخ اور کہیں عالی نسبی کے دعویدار اردن اور مراکش کے حکمراں۔ ان سب کا ہدف دراصل شخصی اور خاندانی حکومتوں کا استحکام ہے۔ قومی اور ملی شیرازہ بندی کا حصول نہیں۔ پھر شاعر کی یہ نوائے مضطرب کون سنے

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

30 جنوری 1991

خبر ہے کہ الخفجی پر عراق کا قبضہ ہو گیا ہے۔ خفجی سعودی کویتی سرحد پر واقع ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جنگی اعتبار سے تو شاید اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں لیکن اس اقدامی کارروائی نے سعودی عرب میں سراسیمگی پیدا کر دی ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ یہ دراصل زمینی جنگ میں امریکی فوجوں کو گھسیٹنے کی ایک چال ہے۔ مگر امریکی اتنی آسانی سے زمین پر اترنے والے کہاں۔ سنا ہے کہ سعودی اور قطری دستے شہر پر دوبارہ قبضے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ البتہ امریکی فضائی مدد انھیں حاصل ہے۔ آسمانی مدد کی طرف تو اب ویسے بھی ان کا دھیان نہیں جاتا۔ امریکیوں کو اپنے عرب اتحادیوں سے یہ شکایت تھی کہ ان میں اپنے وطن کے لیے مرمٹنے کے جذبے کا فقدان ہے۔ اب عرب اتحادیوں کو یہ نادر موقع ملا ہے کہ وہ اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیں۔ دراصل امریکی اس بات سے آگاہ ہیں کہ عرب قومیت جو اب مختلف ذیلی قومیتوں میں متشکل ہوئی ہے ایک عام عرب مسلمان کے اندر کوئی جوش کوئی ولولہ پیدا نہیں کرتی۔ عرب معاشرے کا روایتی ڈھانچہ شعوب وقبائل پر مبنی رہا ہے یا پھر مذہبی وابستگیوں نے انھیں شیعہ، سنی، دروز یا علوی بنائے رکھا ہے۔ سیاسی سرحدوں والی شناخت تو آج بھی ایک جبری تہمت معلوم ہوتی ہے پھر بھلا وہ اس کے لیے کیوں جان دینے لگے۔

ایک زمانہ تھا جب عرب قومیت کا طوطی بولتا تھا۔ عرب جاگ اٹھے تھے۔ العرب امۃ واحدۃ ذات رسالۃ خالدۃ کے نعروں سے عالم عرب گونجتا تھا۔ عربوں کی اس بیداری نے خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ عرب قومیت نے اسلام کی آفاقیت پر بھی شب خون مار لیا ہو۔ مائیکل افلاق جیسے

عرب قومیت کے شارع اور شارح کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہمارے (ان کے) عہد میں اسلام کی قوت کا احیاء عرب قومیت کی شکل میں ہوا ہے۔ مگر 67 کی جنگ کے بعد عرب قومیت کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ محمود درویش کی مشہور زمانہ نظم بطاقۃ ھویۃ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے:

سجل
أنا عربي
ورقم بطاقتي خمسون ألف
وأطفالي ثمانية
وتاسعهم سيأتي بعد صيف
فهل تغضب

مگر اب اس نظم میں اقدامی عنصر نہیں بلکہ شکست خوردگی کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ بالکل نزار قبانی کے ان اشعار کی طرح جو انھوں نے لاجئات اسماؤن الوطن میں رقم کیے ہیں:

تكسرت ثرانا النساء في دفاتري
تكسرت ملامح الجبال، والوديان، والحقول، والعشب
تكسرت نجم الفضة والذهب
فلا هناك صبايا
ولا هناك خولة
ولا هناك زينب
ولا هناك تمور وارطب
تكسرت قرطبة، تكسرت غرناطة
فلا نساء الشام يجلسن لي
ولا جميلات حلب
إذا انفرطت كحبات امرأة؟
يا غلقي اسماك في بحر العرب

گویا ایک دنیا تھی جو رخصت ہو گئی اور اپنے پیچھے حزن و ملال کا ایک غبار چھوڑ گئی۔ کہاں وہ لوگ تھے جو اس کہنے سے آگاہ رہے کہ محمد عربی سے ہے عالم عربی۔ ان اندوالوں کی بھی عجب شان تھی

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

شیخ خلف اللہ کہتے ہیں کہ آج بھی عرب ممالک کی نصابی کتابوں میں ترکوں کی منفی تصویر پڑھائی جاتی ہے۔ عربوں نے علم بغاوت بلند کیا اور الامبراطوریہ العثمانیہ کے تاروپود بکھر کر رہ گئے۔ ادھر ترکوں نے عربوں کی مخالفت میں عربی رسم الخط سے پیچھا چھڑا لیا یہاں تک کہ انھیں عربی زبان میں اذان کی آواز بھی گوارا نہ رہی۔ اب عرب بنام عرب کی اس جنگ میں دیکھیے فتح کس کے ہاتھ آتی ہے۔ امریکی ابتدا تو صرف سعودی عرب کے دفاع کے خیال سے آئے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اقدامی جنگ کی تیاری کر لی اور اب انھیں اس بات کی شکایت ہے کہ سعودی فوجی اور دوسرے عرب اپنے ملکی اور قومی وقار کے سلسلے میں خاطر خواہ حساسیت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کل عرب بغاوت کا ثمرہ مغربی اقوام کی جھولی میں گرا تھا۔ عربوں کو اس بات کا ادراک سائکس پیکو معاہدہ اور اعلان بالفور کے بعد ہی ہو سکا۔ خلیج کی یہ جنگ بھی امریکی ایجنڈے کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ عربوں کی بے بسی پر ترس آتا ہے کہ وہ بیچارے اپنی مرضی سے اپنے دشمن کا انتخاب بھی نہیں کر سکتے۔

کُل اَنا عربی.... فحول تعصب

31 جنوری 1991

خفجی میں ابھی ہلچل باقی ہے۔ کوئی 36 گھنٹوں کے بعد شہر پر دوبارہ سعودی قبضہ بحال ہو گیا ہے۔ شام چھ بجے کرنل احمد الربیان نے اپنی پریس کانفرنس میں 18 سعودی اور 30 عراقی جوانوں کے مرنے کی اطلاع دی تھی۔ 429 عراقی فوجیوں کو قیدی بنا لیا گیا ہے جن سے کرنل احمد نے حسن سلوک کا وعدہ کیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جنگ کے خاتمے کے بعد یہ عراقی قیدی مستقبل کے اچھے دوست ثابت ہوں۔ رات نو بجے کی نشریات میں جنرل شوارزکوف کی پریس بریفنگ بھی دکھائی گئی۔ بیس پچیس منٹ تک موصوف مختلف قسم کے ویڈیو مناظر دکھاتے رہے۔ ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ ان کے اسمارٹ بموں نے کتنی کامیابی کے ساتھ دشمن کے اہداف تباہ کیے۔ دشمن کو کس قدر جنگی ساز و سامان کا نقصان اٹھانا پڑا وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں چلتے چلاتے ایک جملہ کچھ اس طرح لڑھکا دیا کہ فی الفور اس کی سنگینی کا اندازہ نہ ہو سکا۔ فرمایا کہ جہاں دشمن کو اتنا بھاری نقصان اٹھانا پڑا وہیں امریکی میرین کے حصے میں بھی ۱۱ کے آئی اے (KIA) آئے۔ غور کرنے پر پتہ چلا کہ KIA دراصل Killed in Action کا مخفف ہے۔

ان دنوں امریکی ذرائع ابلاغ میں collateral damage کا بڑا چرچا ہے۔ اس اصطلاح کے پیچھے بھی بڑی سفاکیت چھپی ہے۔ آپ نے شہری آبادی پر بم گرایا۔ اسکولوں، ہسپتالوں اور کارخانوں کو تباہ کر

دیا اور اس بہیمیت پر شرمندہ ہونے کے بجائے یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ یہ دراصل collateral damage ہے۔ جنگوں میں نشانے تو خطا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی دسیسہ کاریوں کو سمجھنے کے لیے صرف انگریزی زبان کا جاننا کافی نہیں، خوش نما اصطلاحوں (euphemism) کی ایک طویل فہرست ہے جس نے ایک متبادل مگر بے رحم لغت کو جنم دیا ہے۔ مثلاً اپنے جنگی اہداف کو یہ لوگ assets کہتے ہیں اور بمبار طیاروں کو force packages۔ اور یہاں ان کے جہاز دشمنوں کے ٹھکانوں پر بمباری نہیں کرتے بلکہ انھیں محض بے اثر (neutralize) کرتے ہیں یا ان کی خدمت (sevice) اور زیارت (visiting the enemy) کے لیے جاتے ہیں۔ مہذب لوگوں کی اس جنگ کا کمال دیکھیے کہ یہاں کوئی مرتا نہیں بلکہ eliminate (محو) ہو جاتا ہے یا پھر اپنی سابقہ حیثیت پر قائم نہیں رہ پاتا یعنی degrade ہو جاتا ہے۔ ان کی ادائے دلفریب کے شکار کبھی کبھی اپنے بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن عشق اور جنگ میں تو یہ سب ہوتا ہی ہے۔ ایسے قتیل محبت حادثوں کو ان لوگوں نے friendly fire کا نام دے رکھا ہے۔ اگر کسی جگہ دشمنوں کا اثر دیکھ کر ان پر بے تحاشا بمباری کا خیال آ جائے تو پہلے وہ اپنے اہداف کو kill boxes قرار دیتے ہیں تاکہ ضمیر پر بوجھ کم پڑے۔ ویسے کارپٹ بومبنگ (carpet bombing) کا بھی انھیں اچھا تجربہ ہے، وہ فضا سے ہی کمال مہارت کے ساتھ انسانی خون اور لوتھڑے سے قالین بُن دیتے ہیں۔

بصرہ اور بغداد کی زیارت پر جانے والے اتحادی طیارے بم گرانے کے بجائے sorties ڈال کر واپس آ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صدام کی وحشت خیزی دیکھیے کہ وہ اپنے اسکڈ میزائل سے ہمیں خوف زدہ کیے رکھتا ہے۔ زبان کا کمال دیکھیے کہ امریکیوں کے پاس جہاں بحری، بری اور فضائی فوج ہے وہیں صدام کے پاس خوف ناک war machine۔ عراقی فوجیں ہلاک کرتی ہیں جبکہ امریکی محض neutralize یعنی بے اثر کرتے ہیں۔ اسکڈ میزائلیں شہریوں پر موت برساتی ہیں جبکہ امریکی میزائلیں محض extensive damage پر اکتفا کرتی ہیں۔ عراقی فوجیوں کے جنازے بھی نہیں اٹھ پاتے کہ امریکی sorties انھیں decimate کر دیتے یعنی ان کا نام و نشان مٹا دیتے ہیں جبکہ امریکی فوجیوں کے body bags یا body pouches بڑی شان سے واپس امریکہ بھیجے جاتے ہیں۔

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ڈائری کے بقیہ صفحات بھی اسی طرح کے اندراجات سے پر ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ انھیں بھی اپنے قارئین کی خدمت میں جوں کا توں پیش کر دوں لیکن کچھ تو طوالت کے خیال سے اور کچھ اس سبب کہ ان میں بعض نجی نوعیت کی تفصیلات آ گئی ہیں اور بعض ایسے شخصیں کا تذکرہ بھی جن کے حق میں شاید ان باتوں کی اشاعت اس وقت مناسب نہ ہو، میں انھیں کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

جنگ جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی اس کے اصل اہداف سے پردہ اٹھتا گیا۔ فورٹ اسٹیوارٹ میں امریکی فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے صدر بش نے صاف لفظوں میں کہا کہ یہ جنگ قربانی چاہتی ہے، ہم بالآخر فتح یاب ہوں گے اور لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ امریکہ جو چاہتا ہے ہو کر رہتا ہے 'that what we say goes' (لاس اینجلس ٹائمس، 2 فروری 1991، ص 11)۔ اتوار 3 فروری 1991ء کو صدر بش کی جانب سے پورے امریکہ میں یوم دعا کا اعلان کیا گیا جس سے اس بات کی مزید وضاحت ہو گئی کہ خلیجی جنگ میں ہلال کا مقابلہ صلیب سے ہے۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا اتحادیوں کی تابڑ توڑ بمباری جاری تھی۔ ٹیلی ویژن کے پردے پر بمبار طیاروں کے اترنے کا منظر دل میں ایک ہوک سی پیدا کر دیتا۔ خیال آتا کہ اب بغداد، بصرہ، موصل اور عراق کے دوسرے شہروں میں تباہی کیا ہوگا؟ پہلے ہی حملے میں بجلی، پانی اور ٹیلی مواصلات کی بنیادی سہولتیں تباہ ہو چکی تھیں، شہر کے شہر اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اطلاع تھی کہ زخمیوں کے لیے ہاسپٹل میں علاج اور آپریشن کی بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے۔ خیال آیا کہ اس سے پہلے بھی کوئی ساڑھے سات سو سال پہلے بغداد کی ایسی تباہی 1258ء میں منگولوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ تب جنیوا اور ہیگ کنونشن معرض وجود میں نہیں آئے تھے۔

البتہ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ نئے عہد کے منگول بھی اس اطلاع سے لیس ہیں کہ عراق میں داخلی محاذ پر سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ امریکی فوجیوں کو جو رہنما کتابچے دی گئی ہیں ان میں عراقی معاشرے کے فطری خلفشار کا بڑی تفصیل سے ذکر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ملک کی ساٹھ فیصد آبادی شیعہ مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کی سنی مسلمانوں سے ازلی لڑائی ہے اور کردوں کو اپنی علیحدہ شناخت پر اصرار ہے۔ کتاب میں ایسے نقشے بھی دیے گئے ہیں جن سے اس امت منتشرہ کے اپنے اپنے علاقوں کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا ابھی جنگ پوری طرح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ کرد اور شیعہ بغاوتوں کے پھیلنے کی خبریں آنے لگیں۔ 1258ء کے سقوط بغداد میں مسلمانوں کی باہمی چپقلش کو دخل تھا اور 1991ء کی امریکی یلغار بھی ہمارے داخلی خلفشار سے مہمیز ہوتی رہی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ہمیں ہمارے علاوہ کوئی اور زیر نہیں کر سکتا۔

نئے عہد کے منگول بھی سفاکی اور شقاوت قلبی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک انسانی جانوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں۔ جنرل شوارزکوف سے ایک پریس کانفرنس میں جب یہ

پوچھا گیا کہ کتنے عراقی فوجی اس جنگ میں مارے گئے ہوں گے؟ تو ان کا کہنا تھا کہ بہت بہت زیادہ۔ اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار بتا چکے تھے کہ وہ لاشیں گننے میں یقین نہیں رکھتے۔ جب انھیں بہت زیادہ گھیرا گیا تو یوں گویا ہوئے:

میں نہیں سمجھتا کہ جنگوں میں کبھی ایسا ہوا ہو کہ مرنے والوں کی صحیح تعداد کا پتہ چل سکا ہو۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس وقت لاشوں کی فوری تدفین کا مسئلہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس لیے میں کہوں گا کہ صحیح تعداد کبھی نہیں معلوم ہو سکتی۔ جن لوگوں کو اس بات کا قطعی علم ہو سکتا ہے وہ بدقسمتی سے مقتولین کے اہل خانہ ہو سکتے ہیں اور انھیں بھی اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب ان کے پیارے زندہ گھر نہیں لوٹتے۔ (ریاض 27 فروری، جنرل شوارزکوف کی پریس کانفرنس)

گرین پیس نامی تنظیم نے 75 ہزار عراقی فوجیوں کی موت کا اندازہ لگایا ہے۔ اس کے علاوہ پانچ ہزار فوجی خانہ جنگی فرو کرنے میں کام آئے جس میں تیس ہزار شہریوں کو بھی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بعد میں امریکی ذرائع سے آنے والی اطلاع کے مطابق جنگ میں کام آنے والے عراقی فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ اور امریکی اتحادیوں کی تعداد چار سو بتائی گئی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ستر فیصد بم اپنے اہداف سے دور گرے کوئی چند فٹ کی دوری پر تو کوئی پانچ میل کی مسافت پر۔ گویا ذرائع ابلاغ کے پردہ پوشوں نے اب تک جنگ کے مکروہ چہرے پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اب بعض تفصیلات چھن چھن کر باہر آ رہی ہیں۔ لاس اینجلس ٹائمس کے صحافی جان بالزر نے اپاچی ہیلی کاپٹر کی سنگ دلانہ کارروائی کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا ہے:

"اندھیرے میں دیکھنے والے آلات کے ذریعے عراقی فوجی کیڑوں کی طرح لگ رہے تھے، حواس باختہ اور خوف زدہ، جیسے ابھی ابھی اچانک نیند سے اٹھ کر اپنے بنکروں سے نکل آئے ہوں۔ وہ اصل صورت حال سے ناآگاہ تھے۔ انھیں اپنے نظر نہ آنے والے دشمنوں کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے شکار ہوتے رہے۔ 30 ملی میٹر کے بارودی گولوں نے تو بعضوں کے پرخچے اڑا دیے۔ ایک شخص نے گرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی، اگلے دھماکے نے اس کے چیتھڑے اڑا دیے۔ ایک شخص نے تو دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش کی، شاید امریکیوں کو رحم آ جائے اور وہ اسے زندگی بخش دیں۔"

22 فروری کو وہائٹ ہاؤس کے ترجمان مارلن فٹزواٹر نے شکست خوردہ عراقی فوج کے ساتھ ایک بڑا سنگدلانہ مذاق کیا۔ اس نے کویت سے نکلنے والی فوج کو اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ انخلا کے دوران ان پر کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ 25 فروری کو صدام نے انخلا کا حکم دیا۔ عراق جانے والے راستے پر دور دور تک پانچ رویہ گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں ان میں زیادہ تر نہتے عراقی فوجی اور عام شہری شامل تھے۔ لیکن شہر سے نکلنے کے

بعد میلوں طویل اس قافلے کی گھیرابندی کر دی گئی اور پھر امریکی فوجیں فضا سے ان پر حملہ آور ہو گئیں۔ 26 فروری کی صبح مزید امریکی فوجی دستے وہاں پہنچ گئے اور پھر اس شاہراہ موت پر انسانوں کا شکار شروع ہو گیا۔ بقول میجر جنرل رو آل میسور، ایسا لگتا تھا کہ لوگ مرغابیوں کا شکار کر رہے ہوں۔ میکائیل کیلی نام کے ایک رپورٹر نے، جس کا 10 مارچ کو اس شاہراہ سے گذر ہوا، اپنے مشاہدات کچھ اس طرح رقم کیے:

ابھرا سے عراقی سرحد تک کا پچاس ساٹھ میل کا طویل راستہ جلی ہوئی بمزدہ گاڑیوں اور جھلسے ہوئے انسانی لاشوں اور اعضاء سے پٹا تھا۔ مجھے کسی جسم پر فوجی لباس کا کوئی ایسا ٹکڑا دکھنے کو نہ ملا جس سے اس کے سابق فوجی ہونے کا اندازہ ہو سکے۔ اس کی وجہ غالباً دھماکوں کی شدت تھی کہ جس کے سبب لباس جل کر خاک ہو گئے تھے اور ان کے جسم جھلس کر کوئلے کی ممی میں تبدیل ہو چکے تھے۔

نئے عہد کے منگولوں نے اسی پر بس نہیں کیا انھوں نے شقاوت قلبی کے نئے معیار قائم کیے۔ آٹھ سے دس ہزار عراقی فوجیوں کو زندہ درگور کرنے کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہے۔ یہ واقعہ 24 اور 25 فروری کا ہے۔ کوئی دس ہزار عراقی فوجی جو مختلف بنکروں اور خندقوں میں موجود تھے ان میں سے صرف دو ہزار فوجی ہی جان کی امان پا سکے تقریباً آٹھ ہزار فوجیوں کو امریکی دیو ہیکل زمین شکن مشین (earth mover) اور ٹینکوں کی مدد سے ان کے خندقوں اور بنکروں میں ہی زندہ دفن کر دیا گیا۔ جنگ کے دنوں میں امریکی ٹیلی ویژن چینلوں پر اس خوش قسمت عراقی کا اکثر تذکرہ ہوتا تھا جس کی گاڑی امریکی بمباری سے عین پہلے پل سے بخیر گذرتی دکھائی گئی تھی اب جنگ کے خاتمے پر اس بدقسمت عراقی کی تصویر سامنے آئی ہے جو ٹرک کے اوپری حصے سے باہر نکلتے ہوئے بمباری کا اس طرح شکار ہوا ہے کہ اس کا پورا وجود چشم زدن میں جھلس کر کوئلے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ایک خوف ہے جو اس کی جھلسی اور منجمد آنکھوں سے اب بھی ہویدا ہے۔ مگر اس تصویر کے لیے شاید امریکی ذرائع ابلاغ میں کوئی جگہ نہیں۔

جنگ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسی دوران میری ملاقات ایک بڑے سعودی اہلکار سے ہو گئی۔ فرمایا کہ جنگ تو جلدی ختم ہو جائے گی البتہ اس کا ملبہ صاف ہونے میں خاصا وقت لگے گا۔ ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ فتح و کامرانی کے احساس پر شکست نے ڈیرے ڈال دیے ہوں۔ انھیں ایک ایسی کامیابی ہاتھ لگی تھی جس میں خود ان کا اپنا وجود روندا گیا تھا۔ یہی حال ان علما مشائخ کا تھا جنھوں نے امریکی مداخلت کے حق میں دلائل شرعی فراہم کرنے کے لیے باضابطہ کتابیں لکھ ماری تھیں۔ ان دنوں سابق امریکی سفیر اپریل گلیسپی پھر سے موضوع بحث بن گئی تھیں جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انھوں نے صدام کو کویت کے قبضے پر ورغلایا تھا۔ بعضے کہتے تھے کہ امریکی تو اس منصوبے پر ڈیڑھ دو سال پہلے سے کام کر رہے تھے۔ کویت کی بازیابی تو محض ایک جملہ معترضہ تھا در اصل مقصد خطے میں امریکی بالادستی کا استحکام اور عراق کی ترقی کو لگام دینا تھا۔ گویا

خلیجی بحران میں پوری امت بے وقوف بن گئی۔ واصف الراعی اپنی خاص مسکراہٹ کے ساتھ کہتے کہ بے وقوف بنی نہیں بلکہ بندوق کے زور پر بے وقوف بنائی گئی۔ ہمیں از خود بے وقوف بننے کی آزادی بھی کب حاصل ہے؟

جنگ کے نتائج اور اس کی تباہ کاریوں نے مجھے اندر سے خاصا مجروح کر دیا تھا۔ ایک حزن تھا جو میرے اندر سرایت کر گیا تھا۔ میں جس قدر غور کرتا مجھے 1258ء کے منگول حملوں اور 1991ء کے امریکی صحرائی طوفان (عاصفۃ الصحرا) میں ایک حیرت انگیز مماثلت معلوم ہوتی۔ اگر ہلاکو خان کو بھی CNN کا سہارا مل گیا ہوتا تو دنیا آج اسے ایک مہذب اور انسان دوست شخص کی حیثیت سے جانتی۔ میرے کانوں میں صدر بش کی تقریر کے یہ جملے گونجنے لگے:

At this moment, America, the finest most loving nation on Earth, is at war; at war against the oldest enemy of the human spirit-- evil that threatens world peace. At this moment, men and women of courage and endurance stand on the harsh desert and sail the seas of the Gulf. By their presence they're bearing witness to the fact that the triumph of the moral order is the vision that compels us.

الفاظ میں بھی کیا طلسم ہوتا ہے۔ لفظوں کے بازیگر مکروہ حقائق پر بڑی آسانی سے پردہ ڈال دیتے ہیں۔ ایک نیا بیانیہ وجود میں آجاتا ہے۔ الفاظ کی بمباری مہلک بموں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ خلیج کی جنگ میں بمبار طیاروں سے کہیں زیادہ ٹیلی ویژن کی راست نشریات نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ ساختہ خبروں کے اس سلسلے نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ہماری بصیرت اور بصارت دونوں مجروح ہو چکی ہیں۔

میں ستمبر کے اوائل میں یہاں آیا تھا اور تب سے سوائے چند مختصر یورپی اسفار کے میرا زیادہ تر قیام مملکت نجد و حجاز ہی میں رہا۔ آج کوئی چھ ماہ بعد جب میں دہلی کے لیے عازم سفر ہوں کویت کی آزادی کی خبر سن کر ایک عجیب طرح کے احساس سے دوچار ہوں۔ میں اس احساس کو کیا نام دوں۔ نام تو میں بہت سی چیزوں کو نہیں دے سکتا۔ میں نے خلیج کے بحران کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ علما و دانش وروں کی مجلسوں میں بیٹھا ہوں۔ حکمرانوں کی مصلحت آموز قیل و قال کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ میرے لیے یہ سب کچھ بھی حاصل حیات سے کم نہیں۔ میں بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں مگر اسے بیان نہیں کر سکتا۔

☆☆☆☆

مارینا کراوچینکو (ماسکو، روس)
انگریزی سے ترجمہ: ڈاکٹر مجاہد مرزا

معاصر روسی ادب: رجحانات، مسائل، انداز

اس وقت نقادوں کے لیے معاصر روسی ادب کو آنکنے کے میں مسئلے درپیش ہیں۔ سماج کو جاننے سے متعلق غیر معروضیت در آئی ہے۔ اکثریت منفی تاثر لیے ہوئے ہیں اور کچھ میں استعداد ہی نہیں ہے۔ معاصر زبان سے متعلق نقطۂ نظر محض ایک "اسطورہ" ہے۔ تو اس ضمن میں ایسا ہے کہ کچھ کہتے ہیں:

"ہمارے ہاں آج ادب ہے ہی نہیں"... "معاصر روسی ادب کا فنی معیار بہت پائیں ہے"...

آج بہتر معاصر ادب سے متعلق Perceptions (جن میں ہیجانی، قنوطی، تخریبی اور ڈراکت شامل ہیں) پر مبنی ہے اور وہ قارئین کی اقلیت کے لیے ہے"۔ بدقسمتی سے اس نوع کے اساطیری بیانات، بنیادی ادبی علم سے عدم آگہی کے اظہارات کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ، اس نوع کی منفی آرا کی گہری عمرانیاتی/ نفسیاتی جڑیں ہیں جن میں سے بیشتر ویسے ہی منفی ماحول سے پھوٹی ہیں، جس کا کہ آج ہمارا سماج شکار ہے۔ معیاری معاصر ادب کی افزائش کے راستے میں سب سے پہلی رکاوٹ تو سرکاری سطح پر پیش کرنے والے اداروں میں مشترکہ مقاصد پر مبنی آگاہی دیے جانے سے متعلق پالیسیوں کا فقدان ہے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے کہ مناسب معاصر ادب اور نئے باصلاحیت ادیب، روایتی ذرائع ابلاغ عامہ (اوقات اور چینل "کلچر" یعنی ثقافت، پر بھی معاصر ادب کا عکس مفقود ہے) کی تجارتی وضاحتی روشنائی کی دلچسپی کا محور نہیں ہیں۔ انٹرنیٹ پر بھی موضوعاتی مواد کثیر متنوع، غیر منظم معلومات پر مبنی اور یوں اگر ہے تو "کچھ دار قارئین کی اقلیت" کی خاطر ہے۔ اس صورت احوال کے مدنظر، شائع ہونے والے اجمالی متنوع مواد اور اسی طرح انٹرنیٹ کی فضا میں موجود ادبی تخلیقات سے استفادہ کرتے ہوئے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اوسط سطح کے قارئین میں معاصر ادب بارے آگاہی پر از مسائل ہے۔

مزید برآں ان ادوار میں روسی معاشرہ میں عوامی شعور کی روحانی سمت اور اخلاقی اصولوں میں تبدیلی کے پس منظر میں، قارئین اور مصنفین کے بیچ اختلافات کی خلیج گہری ہوئی ہے۔ ہر شخص آگاہ ہے کہ روسی قارئین ہمیشہ اخلاقی اسباق لینے کی جانب مائل رہے ہیں۔ ان کے لیے الفاظ گھڑنے والے ایک نجات دہندہ کی مانند ہوتے ہیں جو سکھانے اور زندگی کے وجودی مسائل کا حل تلاش کر کے دینے کے غیر مشروط داعی رہے ہیں (بیشتر کلاسیکل ادیبوں کو ایسے ہی خیال کیا جاتا رہا ہے)۔ آج کا قاری معاصر ادب سے نہ صرف تفریح کا متقاضی ہے بلکہ چاہتا ہے کہ اسے آسان راہیں بھی دکھائی جائیں۔ مگر آج تو ادیب بدل چکے ہیں۔ ان میں سے وہ جو باصلاحیت

ہیں وہ وہ صرف کاروباری مفاد کو مدنظر رکھتے ہیں بلکہ زیادہ تر پڑھنے والوں کو سوچ کی پیچیدہ راہوں تک لے جاتے ہیں اور وجودی انداز کی بند گلی میں بھی لے جا کر کھڑا کرتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی قارئین کی اکثریت کے لیے موجب سرخوشی نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود روسی معاصر ادب وجود رکھتا ہے اور فروغ پذیر ہے۔ بہت سے اشارے اس کی گواہی دیتے ہیں۔ جن میں سے ایک ادبی انعامات کی تعداد میں اضافہ ہے (اس وقت روس میں ۱۰۰ سے زائد ادبی انعامات دیے جاتے ہیں)۔ روسی زبان کی کتابوں کی اشاعت خاصی حد تک بڑھ چکی ہے۔ بہرحال بہت زیادہ ادبی میلوں کا انعقاد ہونے لگا ہے۔ اور آخر میں یہ کہ ادبی تزئینیت کم ہو رہا ہے۔

آئیے۔ روسی معاصر ادبی رجحانات پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔ بہت سے محققین محسوس کرتے ہیں کہ حالیہ برسوں کا ادب مخلوط ہے جسے اصناف، اظہار اور ادبی اسالیب وغیرہ کا عالمی مخلوط کہا جائے گا (چنانچہ ای۔ وودالازکن کے ہیجان انگیز ناول "لاور" میں صد در صد گوتھک انداز میں پرانے روسی الفاظ کی بنت کے ساتھ ساتھ اکیسویں صدی کی لفظی بنت بھی موجود ہے)۔ بہت سی تخلیقات کے تجسیمی انداز بھی حقیقی اور تخیلی تجسیمات کے امتزاج ہیں (مثال کے طور پر وی۔ سیدیکی کا ناول "دیوار" روایتی طرز پر لکھا گیا ہے لیکن اس میں ایک حصہ بیسویں صدی کے سیاہ جاتی یا گمنام افراد سے متعلق ہے جو خود کو ازمنہ وسطیٰ کے سمولنسک نامی شہر کی دیوار کے پیچھے پاتے ہیں۔ دانش ورانہ اور عوامی تحریر کی سرحد زیادہ دھندلی ہونے لگی ہے (جس کی خاص مثال اکونن کی کتب ہیں)۔ پھر اصناف ادب میں کود پھاند ہے (مثال کے طور پر اے۔ سولیپکوروی کی تخلیق "جیتنے والی" میں، مخلوط پر مبنی ناول نویسی، فرضی دنیا میں ذلت کی زندگی گزارنے والوں سے متعلق ناول نویسی، روسی مثالی جہان تخالف نثر اور سماجی نفسیاتی نثر کو مدغم کیا گیا ہے)۔

یہ محسوس کیا جانا کم اہم نہیں کہ کچھ نقاد وثوق سے کہتے ہیں کہ "ایک نئی نسل (عہد) کی بولی جانے والی زبان" کو نہیں چنا گیا ہے۔ ایک نئی نوع کے نکتہ جہاں کو، مثال کے طور پر ایم۔ الیزاروف، اے۔ ایوانوف اور ایم کوچرگن کی تحریروں میں تلاش کیا جانا واقعی دشوار ہے۔ نقاد بکھرے گئے ادبی اسالیب کو بالکل بھی مثبت خیال نہیں کرتے جس کے سبب موضوعی اور الفاظ سے متعلق امتناعات غائب ہو چکے ہوں (یاد دلا دیں یہ ماحلیت کا بھیانک پیرادو اسی طرح وی۔ سوروکن کے ناولوں میں واقعتہً ممنوعہ الفاظ کی موجودگی کو)۔ اور بلاشبہ معاصر ادب میں بیسویں کو تجارتی جگہ کو احساس یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ وہ خاص طور پر ہدف بنائے گئے قارئین کے لیے ہے۔ یوں ڈی۔ دونسووا کی کتابوں کی کامیابی اس کے سوا کا متوقع ہیں۔ ہیروئن کا روایتی امیج اور طنزیہ انداز بیان ہے، یہ وہ سب کچھ ہے جو خانہ دار خواتین اور اسی طرح کچھ طلب کرنے والی خواتین کے دوسرے حلقوں کو درکار ہوتا ہے۔

کہانی کاری پر مبنی کس نوع کے ادب کو نقاد معیاری قرار دیتے ہیں؟ روایتی دانش ورانہ (ارفع)
ادب نفیس اسلوب پر مبنی ادب خیال کیا جاتا ہے جو قاری کے باعلم، دانشمند اور تصوراتی حس کے حامل ہونے کا
طلب گار ہوتا ہے۔ اسی طرح ارفع نوع کی ادبی تحاریر میں پیچیدہ فلسفیانہ مسائل کا اظہار متوقع ہوتا ہے۔
اکثر و بیشتر مواد ثانوی ہو کر رہ جاتا ہے جبکہ مصنف کی انا کا عکس پرتو پیش پیش ہوتا ہے۔ ارفع ادب کی ذیل میں
نئی اصناف وضع کی جاتی ہیں اور ادبی تجارب کیے جاتے ہیں۔ بیشتر ایسی تخلیقات میں مابعد جدید کے انداز کا
اظہار ہوتا ہے۔ اس نوع کے ادب کا وقت گزرنے کے ساتھ کلاسیک میں شمار کیا جانا کچھ کم نہیں ہوتا۔ یو۔ بوئیدا،
ایم۔ دیشٹیو سکایا، اے۔ وولس، اے۔ ایچ سی، اے۔ کہا کووٹ، وی۔ مکانن، ایل۔ لیمتر دیشو سکایا، وی۔ ہلیون،
او۔ سلاو نیکووا، ایم۔ شیشکن (فہرست بلاشبہ مکمل نہیں ہے) جیسے ادیبوں کو معیاری سنجیدہ مصنفین مانا جاتا ہے۔ ارفع
ادب کا ایک سنجیدہ پہلو یہ ہے کہ وہ قاری کو سوچنے پر مائل کرتا ہے اور اسے مصنف کے ساتھ مکالمہ کرنے کی
تحریک دیتا ہے۔

لیکن دانش ورانہ ادب کو اکثر "مطالعہ برائے مدبرین" نام دیا جاتا ہے (نقاد ایس۔ چپرنین کے
لفظوں میں "اعلیٰ تخلیقی باصلاحیت قارئین"۔ مثال کے طور پر ساشا سوکولوف کی تصنیفات میں کثیر سطحی توسلی تخیل
(Multi-layered associative imagery) مصنف کی پیچیدہ اندرونی دنیا اور ان کے اپنی طرز کے
امکانات کے تنوع کی عکاسی کرتی ہے اور یہ مخصوص باصلاحیت قارئین سے خطاب کرتی ہیں۔ کچھ ناقدین نے طنزیہ
انداز میں رائے دی ہے کہ جس طرح وہیل (ایک ضخیم سمندری ممالیہ: مترجم) کا پلینکٹن (بے حد مہین سمندری
مخلوق) کے بغیر وجود ممکن نہیں، اسی طرح سنجیدہ ادب بالطف انگیز مواد کے بنا موجود ہو جائے گا۔

وسیع پیمانے پر پڑھے جانے والے ادب کے خصوصی اجزا درج ذیل ہیں: مستحکم صنف (مثال کے
طور پر رومانی ناول "محبت کا برگ" میلوڈراما کے اصولوں پر لکھا گیا اور قریب قریب اس کے حواشی سے نہیں
نکلتا)۔۔۔۔۔ مواد کی مرکزیت (ایسی تحاریر میں لامحالہ پر تجسس موڑ ہوتے ہیں اور دل کو چھو لینے والے
واقعات)۔۔۔۔۔ اسلوب اور طرز بیان تک سہل رسائی (ایسی تصنیفات زبان، فقرہ سازی اور اسالیبی نفاست
کے لحاظ سے مختلف نہیں ہوتیں۔ بنت سادہ ہوتی ہے، بیانیہ جاتی تاثرات اور کردار سازی رائج نہج کے مطابق
ہوتے ہیں)۔ کرداروں کا عیاں تاثر (حتیٰ کہ باصلاحیت تحاریر بھی اس لغزش سے پاک نہیں ہیں، مثال کے
طور پر بی۔ اکونن کے ناولوں میں مثبت کردار کا ہیرو عملی طور پر ناقابل تبدیلی ہے۔ ایک شریف اپنے اندر گھٹا ہوا
انسان، جو خود سے اور دوسروں سے بلند اخلاق کے معیارات کا طالب رہتا ہے)۔

مزید یہ کہ بڑے پیمانے پر پڑھے جانے والے ادب کو اصناف اور تنوع کے حوالے سے یوں بانٹا جا

سکتا ہے۔۔۔۔۔ جاسوسی اسٹریہ (د۔ داشکووا)، کلاسیکی (د۔ پتروا)، پولیس سے متعلق (اے۔ مارینینا)، تاریخی (این۔ الیکساندروا) وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ رومانوی ناول، خاص طور پر جذباتی (این۔ بیستیژووا، ای۔ ولموت)، مہم جویانہ تاریخی (ای۔ آر بیشوا، این پولیشچوک)، خانگی ناول۔ (این۔ بلاتووا) تجدد تیز (این۔ آندرے ایوا) سلاو قوم سے متعلق (ایم۔ سیمیونووا)، تاریخی (اے۔ مازن)، مزاحیہ (ایم۔ اوکسکی) جدید (ایس۔ لینیانکو)، وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ ڈراونا ادب برائے اسرار (اے۔ راتی ایو) جوش خیز یعنی تھرلر (اے۔ اور ای۔ گرانووسکی) وغیرہ۔

تاریخی مگر ایک صنف میں متنوع "عوام کے لیے تاریخ" مقامی طور پر روسی ادب میں اس نوع کا وی۔ پکل کا تخلیق کردہ ادب کلاسیکی شمار ہوتا ہے۔ وی۔ پوروتنکو و ای۔ رادزنگی اور اے۔ اسوو بھی روسی معاصر ادیب ہیں۔ کلہ ڈیکٹیتی پر مبنی ادب کو یکساں نوعیت کا، کلاسیکی طرز پر لکھا گیا، مبنی بر تعیش پڑھتی اور "غیر ماہرانہ تخلیقی قارئین" کو اکسانے والا ادب ہونے کا الزام دیا جاتا ایک ریت ہے۔ لیکن "اگر ستارے روشن ہیں تب کسی کو تو وہ درکار ہوں گے"۔ لطف اور وقت گذاری کی خاطر پڑھے جانے والے درجنوں مصنفین کی سینکڑوں اشاعتیں، بلاشبہ قارئین کی بڑی تعداد کی روحانی اور جمالیاتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں اور ساتھ ہی کامیابی سے ان کی تسکین کا ساماں بھی۔

یاد رہے، ماہرین کے مطابق "پست" سے وابستہ تحاریر لکھنے کی صلاحیات کو نکھارنے کی غرض سے فعالیت کا وسیع ترین میدان ہیں۔ مثال کے طور پر، بیکوف جیسے مستند ادیب کہتے ہیں کہ ایک کامیاب ہیجان خیز تھرلر لکھ ڈالنا، او زیادہ صلاحیت کا غماز ہے کیونکہ اس قسم کی صنف تحریر کیا جانا، پلاٹ باندھنے کی ماہرانہ صفت اور نفسیاتی فضا تخلیق کیے جانے کے ہنر کا متقاضی ہے۔ آخری دنوں کچھ معروف نقاد (مثال کے طور پر آلا لاتینینا، سرگئی چپرینین) افسانہ نگاری میں ایک اور جوج کو بھی شمار کرنے لگے ہیں۔۔۔۔ وہ ہے "وسطیہ ادب" جو اپنے فنی معیار کے مطابق لطف انگیز اور ارفع ادب کے بیچ جگہ پاتا ہے۔

ادب وسطیہ تیار شدہ قارئین کے لیے ہے کیونکہ اس میں تصوراتی کی سطوح باہم ہوتی ہیں۔

(مثال کے طور پر جو شخص روسی اور غیر ملکی کلاسیکی ادب سے شناسا ہے، وہ سہل طور پر بی۔ اکونن کی ادبی تخلیقات کی ادبیانہ پالیسی کو قابل ستائش بیان کرے گا)۔ ادب وسطیہ کا پلاٹ ہوتا ہے مگر اس کی بنت بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس صنف کی تحریروں کی خاص صفت تحریر کا یک صنفی نہ ہونا ہے کیونکہ اس میں نثری ادب کی بیک وقت کئی اصناف استعمال کی جاتی ہیں۔ درخشاں مثال اے۔ ایوانوف کا ناول "عجیب سروالے" ہے جو کہانی کی بنت اور منظر کشی میں تھرلر یعنی ہیجان خیزی کا پرتو لیے ہوئے ہے مگر بیک وقت اپنے روحانی اور اخلاقی جھکاؤ کے سبب تربیت دینے والا ناول، داستانی ناول اور نفسیاتی ناول کی اصناف کی دہلیز پر کھڑا ناول قرار پاتا ہے۔

روسی ادب وسطیہ کے حوالے سے ان ناموں کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے: بی۔ اکونن، وائی۔ گریشکووتس،

ای۔ اشیسوف۔ اے۔ ایوانوف، ایم۔ کوچرسکایا، ایم ماسکوینا، یو۔ پولیاکوف، و۔ رودینا، پی۔ حانیو۔ اے۔ چاکووسکی، وی۔ توکاریوا، ایل۔ اولتسکایا (فہرست ظاہر ہے نامکمل ہے)۔ از راہ تذکرہ، اگرچہ فنی طور پر مقوم سے عبارت ہوتے ہوئے مگر قابل توجہ ایسی تصنیفات سے متعلق معروف ادیب ایم۔ سیلیکوف کا ایک بے حد دلچسپ اگرچہ قابل بحث نکتہ نگاہ ہے، جو قابل ہیں کہ

”وسطی صلاحیت کا حامل ادب چاہے جدید ادب کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے“۔ قاری کے لیے یہ بات ہمیشہ ہی کم اہم نہیں ہوتی کہ فنکارانہ اظہار کا تخلیق کار اس کے سامنے حقیقت کو کس انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ادیب کا تخلیقی انداز خاص طور پر حقیقتہ ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو آج روسی ادب میں دو طرح کے تخلیقی طرائق ہیں: مابعد الجدید اور حقیقت نگاری۔ ان دونوں کے اپنے اپنے اوصاف ہیں مگر کچھ اوصاف کچھ حوالوں سے باہم بھی ہیں۔ چند باتیں مابعد الجدید سے متعلق: اس امر کو روایتی طریقے سے فروغ دیا گیا ہے کہ مابعد الجدید انداز بیاں، ارفع ادب کا ایک لازمی جزو ہے۔ اظہار فن کے ایک انداز کے طور پر اور دنیا سے متعلق خاص نکتہ نگاہ کی حیثیت سے موجود مابعد الجدیدیت ــ از بس پیچیدہ اور مبہم مظہر، جس کی صاف طور پر جہتیں متعین کرنا مشکل ہے (یہ بات بھی محققین نے محسوس کی ہے)۔

وہ انتہائی با صلاحیت غیر ملکی مابعد الجدید مصنفین، جن سے عام قاری آگاہ ہیں، ایچ۔ ایل۔ بورخیس، جے کورتازار، روبی گارنر اور ڈبلیو ایکو ہیں۔ روسیوں میں وی۔ ایروفی ایف۔ ایس۔ سوکولوف۔ ای۔ لیمونوف۔ اے۔ بیتوف، وی۔ پلیوین اور وی۔ سوروکن کو مابعد الجدید ادیبوں میں شامل کیا جانا لازمی ٹھہرتا ہے۔ مابعد الجدید شعور کا نکتہ آغاز یہ عمرانی تیقن ہے کہ روایتی طرائق، گھسا پٹا انداز اور ثقافت وصوری کے میدانوں میں معیارات سب بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ سبھی اسالیب کے پیالے بھر چکے ہیں یعنی 190 اصول وضوابط پہلے سے طے ہیں“۔ نتیجہ یہ کہ اس انداز میں کوئی بھی نئی بات نہیں کی جاسکتی ہے۔ ایسے حالات میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ظاہر کردہ حقائق کی جانب اپنا رویہ یکسر تبدیل کیا جانا چاہیے۔ اور اس طرح مابعد الجدید تحاریر کی اہم ترین فنی تکنیک طنز ہے جو ایسے مواقع پر استعمال کی جاتی ہے جن مواقع میں اس کا استعمال نامناسب لگتا ہو۔ مثال کے طور پر او۔ سلاونیکووا کے ناول ”محبوبہ اللہ بین“ کا ہیرو، اس کے حالات اور حتی کہ خود ناول کا عنوان، مصنف کے تیزابی طنز میں ڈوبے ہوئے ہیں جو بعض اوقات تضحیک تک میں ڈھل جاتا ہے۔ ساتھ ہی ناول میں بیان کردہ صورت احوال قطعی مزاحیہ نہیں اور ناول کا اختتام تو بہت ہی سانحہ خیز موڑ پہ جا رکتا ہے۔

لیکن گراد کے معاصرہ کے عہد کے کچھ حصوں میں مزاح کا استعمال ایک صدمہ خیز احساس پیدا کرتا ہے (اے۔ ترگنیف ”سو جاؤ اور سالو“)۔ مابعد الجدیدیت کے فنی ضوابط کا ایک اور اہم حصہ یادیں ہیں اور وہ

بھی بہت، بہت وسیع انداز میں۔ تحریر میں قومی جزو کے طور پر یادوں کے مواد کو برتا جانا مابعد الجدید انداز میں لکھنے والوں کو نئے نئے خیالات و تصورات وضع کر کے استعمال کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس حوالے سے کلاسیک کی طلب بہت زیادہ ہے۔ اس بات کی ایک سب سے زیادہ قابل شناخت مثالوں میں بی۔ اکونن، جو اگرچہ مثالی مابعد الجدیدیت پسند نہیں ہیں، البتہ تخلیقی نگارش کے تمام انداز برتنے سے نا آشنا بھی نہیں۔ کی تخلیقات ہیں۔ ان کے ناولوں میں روسی اور غیر ملکی ادب کے کردار، مقامات، اور واقعات بکھرے ہوئے ملتے ہیں، جیسے ذہن نارسا کے حامل فندورین کا نام، جیسے بہت سے کرداروں کے نفسیاتی اوصاف، جیسے کہانی کے گھماؤ پھیر اور جیسے ابواب کے عنوانات (ناول: نصاب سے ہٹ کے پڑھائی) اور بہت کچھ۔

ایک اور مثال یو۔ ویازیمسکی کا ناول "زبردست موسوار" ہے۔ اس تصنیف کا مرکزی خیال اور فنی تصور بہت حد تک بلگاکوو کے ناول "ماسٹر اور مارگاریتا" کے اس فقرے سے متعلق ہے: "ہم نے موسم بہار کے میٹھے بگریت (یہ ایک خاص قسم کا کرنل ہے۔ بلگاکوو چونکہ تخیل نگار تھے چنانچہ یہ لفظ تخیلیہ" برتا گیا ہے۔ مترجم) کھائے۔" کلاسیک میں مابعد الجدیدیت پسندی کا استعمال تصنیفات کی حیثیت سے متعلق خیال کا اعادہ کرنے کی جانب مائل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بہت سی تخلیقات میں روسی کلاسیک میں عام برتے جانے والی ترکیب "مردہ کو جانا" کو منتخب کیا گیا ہے۔ روس کے کچھ مابعد الجدید مصنفین کی تخلیقات میں یہ کردار عجیب شکل اختیار کر لیتا ہے (وی۔ پیلیوین اور یو۔ مامئی ایو وغیرہ کی تخلیقات میں)۔ اس کردار کی خاص قسم سے ہماری ملاقات مابعد الجدید مصنفین کے لیے لکھی گئی ویلیدیکت الگونی ایف کی کتاب "موسکوا پیتوشکی" میں ہوتی ہے جس کا اہم کردار ایف۔ ایم۔ دستائیفسکی کے "ذلتوں کے مارے لوگ" کا جدید ترین روپ ہے۔

وی۔ مکانن کے ناول "اَن" میں روس کے کلاسیکی ادب میں جنگ گفتگو ز کے روایتی کردار فوجی افسر کی ایک قطعی غیر متوقع شکل ہمیں ملتی ہے۔ یہ یاد رکھا جانا بھی اہم ہے کہ مابعد الجدیدیت، ایک جمالیاتی تجربہ ہے۔ مثال کے طور پر وی۔ سوروکن کے ناول "یوم محافظ" میں اپنی نوع کی جدت طرازی ملتی ہے، جس میں مصنف بہتر طور پر تخیلی انداز میں ازمنہ وسطی اور عہد جدید کے حقائق کو مدغم کرتا ہے۔ د۔ بیکوف نے بھی ایک خاص دریافت کی تھی جنھوں نے اپنے ناول "چ" میں مہم جویانہ بیانیے اور تاریخی مباحثات کا صد فیصد غیر مطلوب تخلیق کیا۔ مابعد الجدید ادب میں ادب سے کھلواڑ کا بہت واضح عنصر ہے۔ اور اسی طرح د۔ بیکوف اپنے ناول "آرتھوگرافی" میں آزادی کے ساتھ عہد نقرہ کے محور کن کرداروں سے نمٹتے ہیں اور اپنے مسودوں میں اس عہد کے ادب کے خصائص کو استعمال کرتے ہیں۔ اور نتاوپی۔ پاسکی اپنے ناول "چوتھے دن کا بھوت" میں ایف۔ ایم۔ دستائیفسکی کے کرداروں کا اس عہد میں وجود اپنے ہی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

برادری" کے دنیا کے بارے میں تاثرات بتائے گئے ہیں۔ وی۔ میدنگی کے ادبی کام (ناول: دیوار) کا تعین روشن خیال قدامت پسندی اور اعتدال پسند اقدام پرستی کا نظریہ کرتا ہے۔

وطن کی مٹی سے جڑے تصورات، جس کے کلاسیکی نمائندے وی۔ راسپوتن، وی۔ استافائیف، بی۔ موژایف اور ای۔ نوسوفین کا پرتو، اے۔ ورلاموف ("گاؤں میں پیدائشی گھر")، او۔ پاولوو ("سرکاری پری کہانی"، "ماتیوشن کا مقدمہ") جیسے آج کے ابھرتے ہوئے نثر نگاروں میں گزرا ہوا ملتا ہے۔ یہ لکھنے والے اپنی تخلیقات میں ایل۔ این۔ ٹالسٹوئی کی جمالیاتی اور فلسفیانہ روایات کی پیروی کرتے ہیں۔

حقیقت نگاری کے دائرے میں لکھنے والوں جوان لوگوں کے ایک گروہ کو علیحدہ کیا جانا ضروری ہے جسے نقادوں نے "حقیقت نگاران نو" نام دیا ہے۔ ر۔ سے۔ پرلیپن ("پیتھلن پھپھی"، "کالا بندر")، پی۔ سینچن ("اپنی جیتو") گ۔ سعد اللہ ئیف ("میں ۔۔۔ چیچن")، د۔ گتسکو ("روسی بولنے والی وہ"، "پہچان کاؤنٹ") کی تخلیقات کی خصوصیت انتہائی اہم موضوعی معاملات کے بارے میں فطری حقائق کی تفاصیل کے ساتھ تلخ اور بھرپور انداز بیان ہے۔ ان مصنفین کی تحاریر کے مروت پیشانی ت۔ کافکا کے یہ الفاظ ہو سکتے ہیں: "ہمیں صرف وہی کتابیں پڑھنی چاہئیں جو ہمیں دانت کاٹیں اور ڈنک ماریں"۔ وہ لکھنے والے جو نفسیاتی حقیقت نگاری کی روایات پر کاربند ہوتے ہیں وہ انسان کے اندرونی دنیا، وجود کے مسائل اور ذہنی ڈھانچے کی پرداخت پر گہری توجہ کے سبب ممتاز ٹھہرتے ہیں۔ ان میں ہم اے۔ کباکوف ("سب قابل درستی ہے")، وی۔ مکانن ("اس")، اے۔ ایلچیوسکی ("فارس کا"، "ماتیس"، "ریاضی")، ایم۔ وشنیوتسکی ("تجربے") اور دوسروں کو شامل کرسکتے ہیں۔ روسی ادیبوں ایم۔ کوچرسکی، د۔ روبینا، این۔ سوکولوفسکایا، ایل۔ اولتسکایا وغیرہ جیسی ہوداؤئی نو جذباتیت پسندی (Neo-sentimentalism) موضوعی مواد اور نفسیاتی حقیقت پسندی کے میلان کے نزدیک تر ہے۔ اس ادبی رجحان کی خاص صفت بیان کرنے والے کی انسانی روح کی اور خود مختلف اظہارات میں انسان کی جانب محبت بھری توجہ ہے۔ نو جذباتیت پسندی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کے بیچ یہی فرق ہے (دوسری نوع کی تخلیقات میں مصنف اٹھائے گئے موضوع کی جانب کبھی غیر جانبداری سے اور کبھی بھرپور انداز میں اپنی رائے دیتا ہے)۔ اپنے طور پر نو جذباتیت پسندی کلاسیکی جذباتیت پسندی سے مختلف ہے (مثال کے طور پر این۔ ایم۔ کارامازن کی کہانیاں) جس نوع کی بھی تخلیقات میں احساس پیدا کرنے والا عنصر طنز ہوتا ہے (این۔ سوکولوفسکایا "ادبی لاوم")، بیشتر اوقات مابعد الجدید جمالیات کی شمولیات ہوتی ہیں (ایل۔ اولتسکایا "کوکوتسکی کا مقدمہ")، اور "ساحرانہ حقیقت پسندی" کی تجسیم نگاری (د۔ روبینا "لیونارڈو کا طرز خط")۔

معاصر روسی ادبی عمل کا مشاہدہ کرتے ہوئے آپ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ براہ راست ادبی تخلیق پرستی

سے جڑے کئی مسائل ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ لکھنے کے معاصر ماہرین کے لیے قارئین کی جانب سے رائے دیے جانا (فیڈ بیک) متعلقہ رہتی ہے۔ اس بارے میں بہت باتیں ہوئی ہیں اور بہت رد و قدح بھی۔ مثال کے طور پر زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ مجلہ "ہلیے تھٹکوئی وا" (معاملات کتب: مترجم)"، جو ایک موقر مجلہ ہے، کے ایک شمارہ میں 26 معاصر نثر نگاروں کے انٹرویو شامل کیے گئے تھے۔ مجوزہ سوالوں میں سے ایک سوال، مصنف کے لیے قاری کی شخصیت کی اہمیت کے بارے میں تھا۔ قابل غور امر ہے کہ جن لکھنے والوں سے یہ سوال پوچھا گیا ان میں سے اکثر قارئین ایک دوست ایک ہم کلام دیکھنے پر رضامند تھے۔ ساتھ ہی یو۔ ایکو کی یہ معروف بات بھی کہی گئی کہ "میں نے اپنی تخلیق کا رخ کس مثالی قاری کی جانب موڑا؟ اپنے ہم خیال کی جانب، ایسے کسی کی جانب جو میرا کھیل کھیلنے کو تیار ہو"۔ دوسرا مسئلہ پہلے سے قریبی طور پر وابستہ ہے اور ان لکھنے والوں کی خاطر اہم ہے جو اپنے قارئین کی اکثریت کی جانب سے رد عمل پانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

بات ہو رہی ہے پُرلطف کہانی اور طرز نگارش پر مبنی معیاری مواد میں ہم آہنگی اتحاد کی۔ بہت سے لکھنے والے اس بارے میں بات کرتے ہیں۔ چنانچہ د۔ روبینا قائل ہیں کہ ایک ادیب کو اچھا داستان گو ہونا چاہیے "ایک ساحر، ایک داستان گو جو نئی دنیا میں تخلیق کرتا ہو" حتیٰ کہ د۔ بیکو جیسے طلب کیش جمالیات پسند بھی یقین رکھتے ہیں کہ "پیچیدہ مزاج لوگوں کو سادہ کتابیں لکھنا سیکھنی چاہئیں"۔

تاہم سنجیدہ ادبی تنقید کی دنیا میں اور ساتھ ہی ارفع ادب کے مستند نمائندوں کے بیچ بھی اختلاف آرا ہے۔ مثال کے طور پر بہت اچھی طرح پہچانے جانے والے نقاد ایس۔ چپرینن دعویٰ کرتے ہیں کہ "ایک بھرپور کہانی کا اعلیٰ سطح کی فنکارانہ تحریر سے اوندھا بچھاہر ہے ناکام ہوگا"

اور تیسرا مسئلہ جو بہت سے معاصر ادیبوں سے متعلق ہے وہ ہیرو کی تلاش ہے۔ اس ضمن میں متضاد ایک اصول کے مطابق دو ہرا ہوتا ہے۔ ایک جانب آرائشی الفاظ کے استعمال کے ماہرین کے لیے "ہمارے دور کے ہیرو" کی تلاش کرنا دلچسپ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں نقاد ایس۔ دامیلکن کے مطابق وی۔ مکانن کامیاب رہے ہیں۔ ان کے ناول ان کا مثبت کردار بمعجزہ بیان "عہد کو سمجھنے کی کلید اور موت کا استعارہ ہو سکتا ہے"۔ علاوہ ازیں حالیہ برسوں کے روسی ادب میں روایتی معاصر کے تشخص کو تشکیل دینے کی اور بھی کوششیں ہوئی ہیں۔ یہ ایل۔ الطسکایا کے ناول کا اسعار دانیل شٹین ہے "دانیل شٹین، مترجم"۔ پھر دوسرے ناولوں کے ہیرو ہیں جیسے اے۔ ایوانوف کا "جغرافیہ دان نے گلوب ہی پی کے ختم کر دیا" ز۔ پریلپین کے "سنکل پھی" اور ایس۔ میناتیف کے "بے روح" کے ہیرو۔ "جنگلی مرد کی داستان" کا ہیرو بلکہ د۔ دوتسووا کے تو بہت سے ناولوں کی ہیروئنیں بھی ایسی ہی ہیں۔ دوسری جانب نقادوں کے مطابق مثبت ہیرو کی تخلیق کا معاملہ ابھی اٹکا ہوا ہے۔ ویسے ایسا ہیرو حقیقت میں روسی

کلاسیکی ادب میں بھی مفقود تھا۔ اور یہاں ادب وسطیٰ کے نمائندگان نجات دہندہ بن کے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقتدار سے لاتعلقی برحق خیال کرتی ہیں کہ آج بھی۔ الفاظ ہی اس مشکل کام سے کسی حد تک عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، جنھوں نے خاصے قابل اعتبار انداز میں کشش اور تکنیک کو ایسا ست قدروں کے تشخص میں یکجا کیا ہے۔

اور آخر میں ایک سوال جو غیر متعلقہ نہیں اور نہ ہی مبہم، اسی لیے یہ اذہان کو جوش دلاتا ہے: "معاصر ادب کو پڑھا جانا کیوں ضروری ہے؟" اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ بلاشبہ معاصر ادیب اس سوال کا جواب دینے کے خاص طور پر مجاز ہیں۔ مثال کے طور پر ایلین سولوفرکا یا قائل ہیں کہ "معاصر ادب پڑھا جانا چاہیے کیونکہ یہ کسی نہ کسی حوالے سے عظیم الشان روسی ادب کی روایات کا تسلسل ہے۔" اور ایس۔ میہوتی کو یقین ہے کہ: "ایسے پیش قدم افراد کے مسودے پڑھنا انتہائی دلچسپ ہو سکتا ہے جو آگے چل کے کلاسیک کہلائے جا سکتے ہیں۔" عام قاری اس سوال کا جواب یوں گھڑ دیتا ہے اس سے متعلق اسامیہ تیار کیے جانے کی ایک یونیورسٹی میں ایک سروے کرایا گیا تھا۔ معاصر ادب پڑھنے کی ضرورت کی وجوہات طلبا نے یوں گنوائی تھیں: اس لیے کہ ادب میں یکسانیت کو توڑا جا سکے۔ اس لیے کہ حقیقت سے متعلق مستند معاصر ادیبوں کی رائے جانی جا سکے۔ اس لیے کہ عہد کی روحانی فضا کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ اس لیے کہ بہتر طور پر خود کو سمجھا جا سکے۔ تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ کونسا ادیب مستقبل میں قدم دھر پائے گا اور کلاسیک ٹھہرے گا۔ تاکہ نیا روحانی تجربہ کیا جا سکے۔ تاکہ سمجھا جا سکے کہ کلاسیک اصناف، رجحانات اور ہیئت کیوں کر فروغ پذیر ہوتے ہیں اور کس طرح ادبی روایات منعکس ہوتی ہیں۔ تاکہ ابدی سوالوں کو نئی شکل میں دیکھا جا سکے۔ تاکہ اپنی ذاتی تنقیدی سوچ اور جمالیاتی ذوق کو صیقل کیا جا سکے۔ اور اسی طرح فنی مہارت اور آرائشی تجارت کے معیارات کے پیمانوں سے متعلق کچھ اور الفاظ تھے۔

معاصر ادب کی لامحدود دنیا پر دن بدن قدرت حاصل کر کے اور اپنے اندر کا ایک کتب خانہ (فرانسیسی ادبی نقاد پیئر بایار Pierre Bayard کا اظہاریہ) آپ ادبی تخلیق کاری کے معانی کے بارے میں سوچنے کا آغاز کرتے ہیں۔ اور آپ سمجھ لیتے ہیں کہ تخلیق کی قدر وہ جو کہانی میں مضمر ہے اور وہی وابستہ مسائل میں یا اپنی طرز کے تجربات میں۔ اصل اور بنیادی شے تخیل یعنی امیجری ہے، لکھنے والے کی تخلیقی اہلیت جس کے سبب پڑھنے والا نظارہ کرتا ہے، محسوس کرتا ہے اور ایک دہرائی نہ جا سکنے والی یکتا اور حیران کن اسلوب میں داخل ہو جاتا ہے (اور ان کی ہر با صلاحیت تخلیق بلاشبہ ایک اسلوب ہوتا ہے ایسا اسلوب جس کی بلند ترین اور کثیر الجہت فہم جو اسے رائف لوسیف پیش کرتے ہیں۔) انتہائی گوڑے اور شاندار تصوری تخلیق، ایک خاص دنیا ہے۔ فضا بدوار محسوس کیے جانے کے قابل، خوش کن، لذت خیز، آپ کو گرفت میں اور مکمل گرفت میں لینے کی اہل اور پھر مصنف کی صلاحیت کا ثبوت بھی (جو عمومی طور پر طرز یا انداز کہلا سکتا ہے) اور اس کی تخلیق کا جادو نہ جانے والا بے پایاں سحر۔

شاہد حبیب (لکھنؤ، بھارت)

خط پہ چاند کا پتہ لکھنے والا شاعر: سلیم محی الدین

سلیم محی الدین وابستہ ہیں ولی، سراج، وجہی، قاضی سلیم اور بشر نواز کی تابندہ شعری روایت کی حامل سرزمین سے۔ انھوں نے کسی تحریک یا رجحان سے متعلق ہو کر شعر و ادب کی خدمت کی راہ نہیں اپنائی۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند فکر سے لے کر جدید اور مابعد جدید رجحانات کے خوشگوار عناصر ان کی شاعری میں خوبصورتی کے ساتھ گھلے ہوئے مل جاتے ہیں اور ان کی شاعری تازہ ہواؤں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ سلیم محی الدین کو پڑھتے ہوئے قاری کو مختلف النوع تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ جہاں وہ اپنے زمانے میں وقوع پذیر ہو رہے مظالم اور غربت و افلاس کی کراہیت کے اظہار کے لیے اپنی شاعری کا استعمال کرتے ہیں تو ساتھ ہی اپنے دل کی آواز پر بھی کان دھرتے ہیں۔ محبوب سے لو لگاتے ہیں۔ آس پاس اردگرد کے ماحول کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ جس طرح غالب اور ذوق کا موازنہ کرنا اب اردو تنقید میں ناانصافی میں شمار ہوتا ہے اسی طرح ہمیں دبستان اورنگ آباد کے شعرا، قاضی سلیم، بشر نواز اور سلیم محی الدین کے مابین موازنہ سے گریز کی راہ اپنانی ہوگی۔ کیونکہ ان سبھی کے مطمح نظر الگ الگ ہیں اور خصوصیات بھی۔ گو کہ سلیم محی الدین کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین امتزاج موجود ہے لیکن ایک قاری کو سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ان کا انداز گفتگو ہے جو لوگوں کو زمانے کے ساتھ نہیں بلکہ زمانے سے ایک قدم آگے چل کر دکھانے کی بات کرتا ہے۔

زیر نظر مضمون کے عنوان کو اختیار کرنے میں سلیم محی الدین کا یہی انداز سخن حاوی رہا ہے۔ بچپن میں اور بچوں کی طرح سلیم کو بھی چندا ماما سے لگاؤ رہا ہوگا لیکن ان کا یہ لگاؤ زیادہ دنوں تک محض لگاؤ ہی نہیں رہا بلکہ اسے سر کرنے اور اس پر فتح پانے کے جنون میں تبدیل ہو گیا۔ جب دنیا چاند پر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے تو ایسے میں سلیم کا خلاقانہ ذہن چاند پر کالونی بسانے کی بات کر رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نئی نسل کو اس کالونی سے دنیا کے نام خط لکھتے وقت چاند کا پتہ تحریر کرنے پر ابھار رہا ہے۔

سلیم نے چاند کے استعارے کو استعارے کی فضا سے نکال کر حقیقی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ شعر دیکھیں:

چلنا اگر ہے وقت کے ہمراہ تو سنو
دنیا کے نام خط پہ پتہ چاند کا لکھو

چاند پر کالونی بسانا تو شاید سلیم کی منزل ہے لیکن اس کے ماسوا بھی ان کی شاعری میں چاند سے مختلف طرح کی وابستگی کا ذکر ایک قرینے سے ملتا ہے۔ کبھی سلیم ہتھیلی پہ چاند رکھنے کی بات کرتے ہیں تو کبھی ماتھے پر چاند سجانے کا ذکر۔ اور کبھی چاند کی خوبصورت سجاوٹ اور اس کی تراش خراش کو اپنی زندگی میں اتارنے کی ضد بھی ہوتی ہے

ہم ہتھیلی میں چاند رکھتے تھے
ہاں لکیروں پہ زور اپنا تھا

کیوں ماتھے پہ چاند سجائیں
تو میری پہچان ہے پیارے

میری بستی کا نام نقشے پہ
چاند جیسے گھروں نے لکھا تھا

ہاتھ کی لکیروں میں چاند کب ابھرتے ہیں
دائرے مقدر کے ٹوٹتے سنورتے ہیں

دھوپ بوئیں کہ دھوپ کاٹیں ہم
واقعی چاند سا تراشیں ہم

ان اشعار میں شاعر نے اپنے اجتہادی تفکرات کے سہارے جس طرح کی روش اپنائی ہے، اسے دیکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ چاند سے ان کا جذباتی تعلق ہی ہے جس کے سہارے چاند کو مختلف حیثیتوں سے دیکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ورنہ چاند سجانا اور چاند سا تراشنا جیسی باتوں کو شعری پیکر عطا کرنا جتنا سہل نظر آتا ہے اتنا سہل قطعی نہیں ہے۔

سلیم نے محض چاند کو مسخر کرنے کی بات نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کا خلاقانہ ذہن انھیں اس سے بھی آگے بڑھ کر نظام شمسی کے دیگر سیاروں کو بھی اپنی ہتھیلی میں اگانے اور اس کے ذریعے انسانی زندگی میں مثبت تبدیلی لانے کا عندیہ دیتا ہے۔ اسی لیے وہ سورج کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ سورج تو ان کے حکم سے ہی اپنی زندگی کے شب و روز دیکھتا ہے۔ سورج کو وہ امید کی ایک علامت اور آنے والے کل کے خوش کن تصور کے طور پر بھی دیکھتے ہیں اور اس کے ذریعے ہر انسان کی زندگی میں ایک اچھے وقت کی آس پیدا کرتے نظر آتے ہیں۔ سورج طاقت و قوت کا استعارہ تو ہے ہی لیکن اس سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ایسی صورت نہیں ہے

دھوپ کا داغ ہے ہتھیلی میں
ہم نے سورج کئی اگائے تھے

آج کا دن تو تم رکھ لو
کل پھر سورج نکلے گا

شام کے ساتھ ہے زوال اپنا
لوگ کیوں سورجوں سے ڈرتے ہیں

پوجنے والے سورجوں کے سلیم
رات کی زندگی سے ڈرتے ہیں

آئینوں سے یہ کھلواڑ کب تک
کوئی سورج اتارو زمیں پہ

دوسرے شعر میں جس طرح ایک ہارے ہوئے انسان کو حوصلہ بخشنے کی بات ہو رہی ہے اور آخری شعر میں سورج کو زمین پر اتارنے کا مضمون بیان کیا گیا ہے وہ غیر معمولی فنکاری کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سورجوں کی پوجا کرنے والوں کو اس سے ڈرنے کے بجائے اسے زمین پر اتارنے کے لیے آمادہ کرنا اور رات کی تاریکی سے خوفزدہ لوگوں کو حوصلہ بخشنا سلیم کی دلنشین مضمون آفرینی ہے۔ ہمارے دور کو انفارمیشن ایج کہا جاتا ہے۔ اسے اس خطاب کو عطا کرنے میں اخبارات کا بڑا اہم رول رہا ہے لیکن اس خصوصیت کو سلیم ایک دوسرے نظریے سے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی ہے کہ اخبار خبروں کی ترسیل کا ذریعہ ہو کر پروپیگنڈے کی ترسیل کا اڈہ بن گیا ہے۔ اسی لیے وہ کبھی اخبار کا سامنا کرنے کو ایک عذاب تصور کرتے ہیں تو کبھی اخبار کے بجائے چہرہ پڑھنے کی بات کرتے ہیں۔ ذرا اسی بات پر چہرے کو اخبار کرنے سے روکتے بھی ہیں کیونکہ اس سے مسائل حل نہ ہو کر مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ ان اشعار میں شاعر کی نیرنگیٔ طبع کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے

آج جینا عذاب ہے کتنا
تازہ اخبار سامنے رکھنا

اخباروں میں کیا رکھا ہے
حسن ہے چہرہ پڑھنا سیکھو

میری نظریں جسے ڈھونڈتی ہیں سلیم
آج اخبار میں ہے وہ کالم کہاں

شاعری کہتے نہیں لفظوں کے پیکر کو نعیم
یہ رگِ جاں سے ابھرتے منظروں کا نام ہے

انتظار نعیم کے اس شعر کے مفہوم کو سلیم محی الدین نے بھی باریکی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد غزل کی دیگر خوبیوں کو بیان کرنے اور اپنی غزل کی وقعت کے اندازہ کے لیے انھوں نے ایک انفرادی راہ اپنائی ہے۔ ان کے انفرادی رنگ کو ان اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے

طرز غالب ملے، میر کا غم ملے
اس سمندر سے پیاسے کو شبنم ملے
اس کی باتیں، باتیں اس سے
تنہائی سوغات غزل کی
لے آئیں گے میر کا لہجہ
مانیں گے ہر بات غزل کی
حرف، وراثت، لفظ، قبیلہ
میری غزل کو پڑھا جائے
دکھاؤ غزل نکتہ چینوں کو میرے
مرے دستخط ہیں یہ میرا کہا ہے

آخری دو شعروں میں شاعر اپنی غزل کو پرکھنے کی نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ حرف، وراثت، لفظ، قبیلہ کہہ کر شاعری کے تہذیبی رویوں کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ شاعری حرف کی وراثت ہے اور اس ورثے پر نہ صرف فخر ہے بلکہ اس کے لیے امتحان کے مرحلے کا انگیز کرنے سے بھی گریز نہیں۔ اس قدر مربوط (Compact) مضامینی نظام کی چست بندی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ جدید تمدنی معاشرت میں شہروں کو علمی، تہذیبی اور اخلاقی برتری کے مسکن کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ممکن ہے فن کار بھی اس تناظر میں شہر اور گاؤں کی تفریق کرے۔ یہاں سلیم محی الدین نے اس حوالے سے جو مضامین نکالے ہیں، وہ ان کی جدت کی مثال کہے جاسکتے ہیں۔ یہ اشعار ہمیں شہری نظام زندگی کے ساتھ ساتھ شاعر کے مکمل معنیاتی نظام کی طرف متوجہ ہونے کی بھی دعوت دیتے ہیں۔

ایسی بات نہیں ہے کہ شہروں کے تعلق سے اس طرح کا احساس صرف سلیم محی الدین کا ہی ہے، بلکہ یہ احساس ہر اس شخص کا ہے جس نے گاؤں اور شہر دونوں کی طرز معاشرت کو غور سے دیکھا ہے، لیکن شاعر نے عمیق مشاہدے کا جو کمال دکھایا ہے اور اسے لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے، وہی انھیں امتیاز عطا کرتا ہے۔ یہاں پر سلیم

ایک ماہر تمدن کے طور اپنی شناخت قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

جسم دکاں ہے، ذہن بکاؤ شہروں میں
جنگل تو دو چار دیوانے آتے ہیں

مکاں ہیں بہت، ان میں گھر ہی نہیں ہیں
نئی بستیوں کا یہی المیہ ہے

یہی واقعہ ہے، یہی زندگی
اگر پاؤں ڈھانکے ہوا سر کھلا

دلوں میں نفرتیں، ذہنوں میں چبھنیں
فصل تیار ہوتی جا رہی ہے

دشمنی بھی اسی سے کرتے ہیں
دوستی جس سے کچھ نبھا دیں ہم

کروں کیسے نقشے میں شامل
وہ گاؤں جو مجھے ملتا نہیں ہے

آخری شعر میں شاعر شہروں کی اندھادھند توسیع (Unplanned Extension) کے نتیجے میں نگلتے گاؤں سے فکرمند ہے۔ اسے انھوں نے "کروں کیسے نقشے میں شامل" کہہ کر نئے اسلوب و استعارے کا استعمال کرتے ہوئے اپنی بات کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ دانشوری مستقبل کے تعلق سے فکرمندی کا نام ہے۔

سلیم محی الدین کی غزلیں اور ان کا تخلیقی نظام ان کے فنی دسترس کا اشاریہ ہیں۔ اس کے ذریعے انھوں نے مستقبل کو لے کر ایسی فکرمندی کا اظہار کیا ہے جو انھیں ایک دانشور کے طور پر بھی ایک شناخت عطا کر رہی ہے۔ سوز آئندہ اور دن کے کگار جیسی تراکیب کا استعمال ان کی انفرادیت واضح کرنے میں کامیاب ہیں۔

نہ جانے شاعر نے کن لمحات میں یہ اشعار کہے لیکن تخلیق شعر کی لاشعوری کیفیت کا اندازہ ان اشعار میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے

اگلی صدی میں جائیں گے
ہم سوز آئندہ میں

رات خنجر سے گزر ہی گئی
دن کی کگار سے الجھنا ہے

ان تلازمات کے مشاہدے کے بعد یہ کہنے میں حق بجانب ہونے کا یقین مستحکم ہوتا ہے کہ سلیم کی دانش وری کے عرفان کو بہت جلد قبولیت کا ساحل بھی عطا ہوگا اور ان کا شعری سرمایہ شعور کی سطح کے افراد کو بھی متوجہ کرے گا۔ سلیم کے یہاں غم جہاں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کی بھی عمدہ مثالیں ہیں۔ انھوں نے روایتی مضامین کو بھی بخوبی برتا ہے اور محبوب کے در کو کھٹکھٹانے میں کسی قسم کی عار محسوس نہیں کی ہے۔ سلیم کی رومانی شاعری وضعداری کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ فکر و اسلوب کی کسی نئی جہت کی تلاش یہاں بہت مشکل نظر نہیں آتی۔ چھپیں لفظ کا بطور ردیف استعمال کر کے شاعر نے رومانی شاعری کی روایت میں ایک نئی شان کا اضافہ کیا ہے

اس کا آنا تو خوب ہے لیکن
اس کا جانا لہو رلائے گا

اس کی تصویر میں اشاروں جب
مرے مولا تو جان بھر دینا

مجھ سے کیا کیا پوچھ رہی ہیں
البم کی تصویریں اس کی

مکالموں کے حصار میں گم
سوال چھپیں، جواب چھپیں

بجھا ہوا ہے نصیب منظر
نظر ہے صحرا، سراب چھپیں

حکایتوں کی اسیر دنیا
کہانیوں کی کتاب چھپیں

غیر مانوس الفاظ کو شعری پیکر عطا کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ بھاڑ اور البم جیسے الفاظ ان کی شاعری میں استعمال ہوتے ہی نگینے کی طرح جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان اشعار کو سلیم محی الدین کے نمائندہ اشعار تو نہیں کہا جا سکتا مگر ان میں لفظوں کے استعمال کی تخلیقی ہنرمندی نے اسلوب میں ایک نوع کی تازگی پیدا کر دی ہے

کچھ چھریلا، اپنا بھاڑ
کچھ شیشوں کی باتیں اس کی

میں تو اس کو بھول چکا ہوں
بادل میں تصویر بنی ہے
البم میں میں سو تصویریں
ایک مگر کچھ بول رہی ہے

تنہا رہوں یا بھیڑ سے گزروں، تنہا میں کب ہوتا ہوں
یوں لگتا ہے جیسے مسلسل مجھ پہ نگاہیں تیری ہیں

قید تنہائی سے نکالے وہی
جو مجھے قید کر گیا مجھ میں

اب نہ وہ ہے، نہ اس جیسا کوئی
کس کو ڈھونڈیں خدا کی زمیں پہ

اس کو گزرے زمانہ ہوا
مدتوں سے نہیں امنگ کوئی

تھا دشمن جاں روبرو
انداز تھے لہجہ نہ تھا

عکس نہیں تیرا لیکن
کیوں پھر تجھ سا لگتا ہوں

ہرجائی کا استعارہ ہماری شاعری میں بارہا استعمال ہوا ہے لیکن بنا ردیف کی ایک غزل میں شاعر نے بطور قافیہ ہرجائی کا استعمال کر کے اور ہرجائی کی مناسبت سے نیلام ملنا کا خوبصورت استعمال کر کے کیا خوب شعر بنایا۔
اس شاعر میں بعض ایسے لفظوں کا استعمال بھی دیکھیں کہ بار بار کے برتے ہوئے الفاظ بھی اچھے لگتے ہیں۔

کر کے نیلام میری تنہائی
وہ ہوا ہے سلیم ہرجائی

گفتگو آنسوؤں نے کی تھی سلیم
اس کو خط ہچکیوں نے لکھا تھا

وہ کسی صبح کی علامت ہے
میں کسی شام کا ستارہ ہوں

دن تھا اس کی ملاقات کا
دھڑکنیں رات بھر اچھلیں

دوسرے شعر میں لفظ ہچکی کا استعمال بطور خاص دلچسپ ہے۔ 'ہچکیوں کا خط لکھنا' ایک ایسا فقرہ ہے جس کی مثال کلاسیکی فنکاروں کے یہاں بھی موجود ہوگی لیکن اس کا استعمال یہاں جس سبک انداز میں ہوا ہے، اس سے قاری کو علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے احساس کو قرأت میں منتقل ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے جس کا تجربہ تو ہر عاشق کو ہوتا ہے لیکن اس کو شعریاتی نظام میں ایسے بھی پرویا جا سکتا ہے۔

سلیم کا کمال فن ملاحظہ کیجیے

میری نیکیاں سب اسے بخش دو
مرے حال کی گر وہ پرسش کرے
بہت چہروں کی سب پگھل جائے
تم اگر بے نقاب ہو جاؤ
الجھے دھاگے سلجھ گئے تھے سبھی
تم نے کچھ دیر تو ٹھہرنا تھا

کم الفاظ میں موثر طریقے سے اپنی بات کو پیش کرنے کے لیے ہماری شاعری میں تلمیحات کے استعمال کی روایت رہی ہے۔ سلیم محی الدین نے بھی اس روایت کو برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اپنے نظریے کی ترسیل کی ہے۔ شاعر کے ذہن رسائی مثالیں دیکھیے

رات کی رات تم بھی حاتم تھے
رات کی رات کیوں فقیر ہوئے

کچھ تو ہے ڈاروِن میں سچائی
آدمی کب ہے آدمی جیسا

دنیا ہے بدر کا میداں
مٹھی بھر انسان دے مولا

کشتیاں تو جلا چکا ہوں مگر
گومگو ہے مرا یقیں مجھ میں

حاتم، ڈاروِن، بدر اور کشتیوں کے جلانے کے ذکر سے ہمارا ذہن فوراً ان واقعات کی طرف پہنچ جاتا ہے اور اس سے استفادے کی شکل شعر میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان تلمیحات کے خوبصورت استعمال سے قاری لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ چارلس ڈاروِن (1809-1882) نے 1859ء میں انسانی نشو و نما کے تعلق سے اپنا مشہور نظریہ ارتقا پیش کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ انسان بنیادی طور سے بندروں کی ترقی یافتہ نسل ہے۔ اس تھیوری کو مسلم دنیا نے مسترد تو کیا ہی لیکن مغربی دانش وروں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اس پر سوالات قائم کیے۔ انسانوں کی اخلاقی پستی کو دیکھتے ہوئے اسی واقعے کی طرف دوسرے شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر بڑا ادب کسی نہ کسی مخصوص مقام میں ہی پروان چڑھتا ہے۔ ایسے میں اگر اس مخصوص مقام کا عکس جہاں سے تخلیق کار وابستہ ہے، اس کا عکس نہ جھلکے تو کہا جائے گا کہ تخلیق کار نے اپنے مقام کو ادب میں نظرانداز کیا ہے۔ اس پر یہ الزام بھی لگ سکتا ہے کہ وہ اپنے یہاں کے حالات و ظروف کو بیان کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیکسپیر سے لے کر میر اور فیض جیسے تمام ہی عظیم فنکاروں کے یہاں مقامی رنگ اور اس کے لوازمات کو خاطر خواہ نمائندگی ملی ہے۔ ایسے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ سلیم محی الدین جیسے حساس شاعر کے یہاں مقامی رنگ نہ پایا جائے اور اس سرزمین کی آب و ہوا اور اس کی خوشبو کی نمائندگی نہ ہو جس کو ولی اور سراج جیسے باکمالوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ سلیم نے بھی اس دشت میں اپنی موجودگی خم ٹھونک کر درج کرائی ہے اور اس میں کسی عار کو حائل نہیں ہونے دیا ہے۔ مقامیت کے رنگ کی بوقلمونی سے انھوں نے اپنے شعری نگار خانے کو سجا کر رکھا ہے

ہم بھی سینے میں آگ رکھتے ہیں
کوئی رشتہ کپاس مت کرنا

دلوں میں نفرتیں، ذہنوں میں چیخیں
فصل تیار ہوتی جا رہی ہے

جھوٹی بھی رکھیں ہی
عمر جیون کے سکھاتی ہیں

عظیم ادب سے یہ توقع بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کا ترجمان ہو۔ اسی لیے ادب کو ایسی تاریخ کے زمرے میں رکھا جاتا ہے جس میں نام و مقام کی وضاحت نہیں ہوتی۔ اس کی اس حیثیت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا اور جب جب تاریخ دانوں کو کسی زمانے کی درباری مورخ اور آزاد فکر مورخ کی متضاد روایوں کی تصدیق کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس وقت کی ادبیات عالیہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سلیم محی الدین کا شمار بھی ان فنکاروں کیا کیا جانے گا جنھوں نے اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے اپنے وقت پہ گہری نظر رکھی اور اپنے مشاہدات کی قوت کو بروئے کار لا کر اپنے وقت کی قابل اعتماد تاریخ کو بلا کسی خوف کے قلم بند کیا اور یہیں پہ سلیم محی الدین کے شاعرانہ امتیازات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ شاعر کی خیال بندی ملاحظہ کیجیے

فلک بولوں پہ مبارک سلامت
مرے چار ٹکڑوں پہ دنیا خفا ہے
مرثیہ دل، نظر ، حواس کا ہے
آج ماتم مرے احساس کا ہے
بدلنے ہی والا ہے منظر نیا ہے
خلاؤں میں اللہ اکبر سنا ہے

شاعر سوچ کی اتنی نئی صورتیں سامنے لاتا ہے کہ ایک عام انسانی دماغ حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ کیا 'سوچ' کی بھی اتنی پرتیں ہو سکتی ہیں لیکن سلیم محی الدین کی غزل میں جب سوچ ردیف کے استعمال کو ایک قاری دیکھتا ہے تو خود اس کے ذہن کے پردے کھل جاتے ہیں

آوازوں پہ پہرے ہیں
تیز کرو اب دھیمی سوچ
رشتوں کی الجبرا میں
مثبت مثبت منفی سوچ

دنیا چاہے گاؤں ہے
میرا گھر ہے میری سوچ

آخری شعر میں تو شاعر نے دنیا بھر کی مخالفت کرتے ہوئے گلوبلائزیشن ہی کا بخیہ ادھیڑ دیا اور اپنے گھر کو ہی اپنی دنیا سمجھ ڈالا۔ حقیقت ہے کہ انسان کو اس دنیا سے اتنا ہی حاصل ہوتا جس قدر اس کی سوچ ہوتی ہے۔ اگر لاکھ دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے لیکن انسان کی سوچ کو بدلنے کی فکر نہ کی جائے تو یہ گلوبلائزیشن ایک عام سی زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں لا سکتا۔ اس موقعے سے شاعری مضمون آفرینی کو بھی دیکھتے چلیں۔

خود ہی روتا ہے بے گھری پہ سلیم
جو گیا لے کے میری چٹائی

اپنی آنکھ بند کر لو
چاروں اور اندھیرا ہے

بھول، وعدے نئی کتابوں میں
ایک نئی صدی نصابوں میں

جو مکمل بھی ہو، مسلسل بھی
اس صدی کا خواب ہو جاؤ

نئی صدی کے اختتام کے گواہ ہونے کی حیثیت سے شاعر ان لمحوں کو بھی اپنے لفظوں میں قید کر لینا چاہتا ہے، جو عمر رفتہ کی وجہ سے دوبارہ اس کی زندگی میں نہیں آسکتے۔ لیکن ان لمحوں کو بھی انھوں نے ایک پیغام کی ترسیل کے موقعے کے طور پر دیکھا۔ سیاسی گلیاروں کی بازی گری سے بھی اپنے لیے مواد اور پیام کی تلاش کر لی۔ ملاحظہ کیجیے اس رخ کو بھی

ملک کا واجپیہ برت بدھا
تمھیں مبارک، وزیر ہو تم
خدا نگہباں، خدا ہی حافظ
سنا ہے اس کے مشیر ہو تم

غزلیہ شاعری کی ایک خوبی اس کی تہہ داری ہے۔ اشارے کنایے میں کہی گئی بات غیر واضح ہو کر بھی پر اثر ہوتی ہے۔ اس لیے غزل گو شاعر اپنی بات کے دائرے کو وسعت دینے اور اسے مؤثر بنانے کے لیے شعری وسائل کو بروئے کار لاتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ ان ہی وسائل میں سے ایک ہے اور یہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حلیم محی الدین نے اپنے اسلوب کو دلکش بناتے ہوئے نادر تشبیہات کا بھی سہارا لیا ہے اور حیرت انگیز تجربے کیے ہیں۔ ان کی نوع رنگ لغت میں سے استعارے کے چند خوبصورت استعمال کو ذیل کے اشعار میں محسوس کیا جا سکتا ہے

لاکھ شیشے اگر سجائے گا
ایک چہرہ کہاں سے لائے گا

بپھری ہوئی موجوں کے سمندر سے گزرنا
دشوار ہوا ذات کے لشکر سے گزرنا
دل سا کوئی درویش ملا ہے نہ ملے گا
بے صورت و صدا روز اسی در سے گزرنا

دل کی بستی کا اک اصول سا
جو لٹے ہیں وہی امیر ہوئے
جن کو متن المسطور ہونا تھا
حاشیے پہ بنی لکیر ہوئے

ڈھ گیا موم کا نگر کوئی
آنکھ بھر آئی، پھر دھواں اٹھا

آئینوں سے یہ کھلواڑ کب تک
کوئی سورج اتارو زمیں پہ

میں ہواؤں کے پر کترتا ہوں
راہ میں میری حادثے رکھنا
تتلیاں درمیان پھولوں کے
بانٹتی ہیں مکالمے رکھنا

تتلیوں کو گل سے رو برو ہوتے دیکھ کر جس طرح کا استعارہ شاعر نے اخذ کیا، وہ نادر ہے۔ تتلیاں پھولوں سے رس نچوڑنے پہنچتی ہیں نا کہ مکالمے کے لیے۔ لیکن بار بار کی ملاقات اور اس پر ایک خاص طرح کی آواز کا اخراج۔ اس نے شاعر کے خلاق ذہن کو ایک نئے استعارے کو وضع کرنے کی راہ سجھا دی۔ اسی طرح پرندے کی جستجو کو شاعر نے کس رنگ سے دیکھا وہ بھی ملاحظہ کرتے چلیں

شعلے اگل رہا تھا، سورج لہو کی خاطر
آنکھیں ملا رہا تھا ایک بے خبر پرندہ
اب تک لہو میں روشن تیری ہی جستجو ہے
ہارا نہیں ہے اب تک محو سفر پرندہ

تصویریں جب بولیں گی
اپنی آنکھیں مانگے گا
بستی میں آج اعلان کرو
آج بجوکا بولے گا

دل کا شیشہ بکھر گیا جب سے
ہم بھی نازک لبوں سے ڈرتے ہیں

--

دل جزیرہ تو کب کا ڈوب چکا
اب کہاں بود و باش ہے تیری
بوجھ اتنا ہے جتنی طاقت
پھر کیوں یارب دل روتا ہے

آخری شعر میں شاعر نے قرآنی آیت لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا سے استفادہ کرتے ہوئے رب سے اپنے دل کی کیفیت کو بیان کیا ہے اور بوجھ کو اٹھانے کی سکت کا سوال کیا ہے لیکن اس انداز میں کہ ایک غیر محسوس خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ شاعری میں اگر غنائیت اور موسیقیت بھی پائی جائے تو ایسی شاعری کو خواص ہی نہیں عوام میں بھی مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور یہ شاعری کی بنیادی خوبی بھی ہے کہ اس میں ایسے الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا جائے جسے موسیقی کی باریک سے باریک تار پر بھی گایا جا سکے۔ ہمارے تمام ہی بڑے شعراء نے اس اصول کو بڑی احترام کے ساتھ برتا ہے۔ بیچ کے دور میں میراجی اور اختر الایمان جیسے کچھ شعراء نے ایسی بحروں اور تراکیب کا استعمال کیا جس میں یہ اصول ٹوٹا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ شاعری بغیر غنائیت کے بھی کی جا سکتی ہے۔ ان کے تجربوں کو اگر کامیاب سمجھا جائے تو بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کی مقبولیت خواص کے ایک محدود دائرے میں ہی مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ سلیم نے ان تجربات کو اپنی آزاد نظموں میں آگے بڑھایا ہے لیکن اس کے ساتھ ان کی روایتی شاعری میں موسیقیت اور غنایت کی موجودگی بھی مسلّم ہے۔ انھوں نے اس کے لیے مختلف وسائل کا استعمال کیا ہے۔ ایک واضح وسیلہ جو انھوں نے غنایت کی آمیزش کے لیے بروئے کار لایا ہے وہ ہے الفاظ کی تکرار۔ اشتقاقی لفظوں کی تکرار کے ذریعے سلیم نے سماں باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کے چند شعر دیکھیں

سورج جیسا منظر منظر بکھرا تو
آئینوں کی دھوپ سے ڈرنے والا میں

سایہ سایہ دھوپ اگانے والا تو
خوابوں جیسا آنکھ اترنے والا میں

سایہ سایہ تلاش ہے تیری
زندگی ہم قماش ہے تیری

میں جو بکھرا ہوں جھیل شیشے سا
کیوں نظر پاش پاش ہے تیری

ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ادب کا کام انبساط و لطف اندوزی ہے اور اگر فنی پاسداریوں کے ساتھ اس میں فلسفۂ حیات اور درسِ اخلاق کے عناصر بھی پائے جائیں تو اسے اعلیٰ ادب کہا جائے گا۔ سلیم محی الدین کا شمار ان لوگوں میں کیا جائے گا جنھیں اپنی شاعری کو پیامی شاعری کے درجے میں داخل کرنے میں کسی طرح کی جھجک نہیں ہے۔ شاعر اس میں فکری شان پیدا کرنے کے لیے ستر تہوں میں جھانکنے کے لیے بھی

قم ہوئے درد کے دھول میاں
اس کی چاہت کی جنگ خود سے کی
طاق پہ رکھ دیئے اصول میاں

پیٹ کا دوزخ ہی جو بھر دے
کوئی ہنر تو ایسا سیکھو
ہم سا پتھر کب سیکھے گا
جھیلوں جیسا گہرا لہجہ

اپنے قد پہ ہے اعتبار
بڑھتے سایے ہی کچھ گھٹالیں ہم

میں زندہ تو اب تک ماضی میں ہوں
مرے پاس لیکن نوادر نہیں

ہر بڑے فنکار میں خود اعتمادی، خود ستائی اور خود پرستی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے احساس نے میر کو اپنے کہے کو فرمانا اور مستند گردانا جیسے تلازمات کے استعمال پر اکسایا۔ شاعر اگر نو آموز ہو اور اس طرح کے احساسات کا شکار ہو جائے تو اس کو فنی خامی میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اگر فنکار نے استادی تسلیم کروالی ہے اور اس کے بعد اس طرح کے احساسات کا اظہار کر رہا ہے تو پھر یہ خامی نہیں خوبی میں شمار ہونے لگتا ہے۔

سلیم جی اب تک کی شاعری کے مطالعے کے بعد قاری انھیں ایک استاد شاعر کے طور پر دیکھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ سلیم محی الدین بھی اس طرح کے احساس سے دو چار ہوتے ہیں اور اپنی شاعری میں جگہ جگہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں حالانکہ اس میں بعض دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر خود ہی اپنے شاعرانہ اکتسابات کا اعلان کر رہا ہے لیکن آفرین کہ اس میں پھوہڑپن کا شائبہ دور دور تک نظر نہیں آتا بلکہ اس میں بھی ایک وقار اور شائستگی جھلک رہی ہوتی ہے اور عظیم تخلیقی جسارت بھی

سلیم یہ بھی مرے دل کا کارنامہ ہے
چراغ ورنہ کوئی آندھی میں جلتا

بولتا جو ہو لفظ لفظ سلیم
کیا ضروری ہے دنگا کرنا

اپنے قلم کے باعث ہی
مجبور میں ہوں اور تنہا ہوں

ہر مصیبت گھر آئی ہے سلیم
بے سبب آفتوں سے ڈرتے ہیں

تجھ میں پڑا ہوں دریا کی
ایسے ملی ہے گہری سوچ

سوچ اے ہوا! پیڑ گراتا تو تجھے آتا ہے
میری خاطر کوئی چلمن کوئی پردہ سرکا

ہے ریا، شبنم صفت، سایہ مزاج
ساتھ میرے جو رہا مجھ سا ہوا

ہم قالب کا چہرہ پڑھیں گے
تم کتابوں میں رکھنا حوالے

نیند تو گویا ان آنکھوں کی دشمن ہے
مجھ کو پھر بھی خواب سہانے آتے ہیں

یوں ہی میلا ضمیر مت کرنا
ہم سے سیکھو قناعت کرنا

جس کی تختی پہ میرا نام نہیں
ہاں وہی تو مرا ہے دروازہ

ہر کوئی کب سلیم جھیل سکا
تجربہ میری ہے گھری جیسا

کسی ورق پہ مجھے نہ لکھنا دوست مرے
اندر باہر روز بکھرنے والا میں

لفظوں کو میں تول کر رکھ دوں
اک ایسی میزان دے مولا

ہاں غزل ہے ہماری وراثت
ہم کہ ٹھہرے دکن دیس والے

سلیم محی الدین کی شاعری کے اس سرسری سے مطالعے کے بعد یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری قوس قزح کے رنگوں سے رنگی ہوئی ہے۔ لفظوں کو برتنے کے نظام سے لے کر معنیاتی نظام کی بنیادیں ان کے یہاں مضبوط ہیں اور ان کی شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ لفظ و حرف کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کی جڑیں بھی کافی مضبوطی سے گڑی ہوئی ہیں۔ ان کا تیور اور آہنگ ایسا ہے کہ وہ دیر سویر نقادوں سے اپنی حیثیت تسلیم کروا ہی لیں گے۔

☆☆☆☆

پروفیسر مقبول احمد مقبول (مہاراشٹر، بھارت)

سنجے مصرا شوق کی رباعی گوئی

رباعی فارسی اور اردو کی کلاسیکی اصناف میں مختصر ترین مگر اہم اصناف میں سے ایک ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے آغاز ہی سے اور اصناف کے پہلو بہ پہلو رباعی گوئی بھی موجود رہی ہے۔ اگرچہ اس صنف کی طرف شعرا کی نظر التفات کم رہی ہے لیکن ہر زمانے میں کچھ شعرا ایسے ضرور رہے ہیں جنھوں نے رباعیاں کہی ہیں۔ بعض شعرا نے تو رباعی کے حوالے سے اپنی خاص شناخت قائم کی ہے۔ مثلاً امجد حیدرآبادی، جوش ملیح آبادی، جگت موہن لال رواں، فراق گورکھپوری، عطا کلیانوی وغیرہ۔ فراق کے بعد اگرچہ اکا دکا شاعر رباعی گوئی کی طرف ملتفت رہا لیکن مجموعی حیثیت سے رباعی گوئی کے میدان میں جمود کی سی کیفیت طاری تھی۔ لیکن پچھلی تین چار دہائیوں میں ہمارے شاعروں نے اس کی طرف بطور خاص توجہ دی ہے اور دے رہے ہیں۔ خاص طور سے پچھلی دو دہائیوں میں بھی رباعی گو شعرا منظر عام پر آئے ہیں جو خوش آئند بات ہے۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں بھی ایسے شاعر ہیں جنھیں نہ رباعی گوئی سے ذہنی مناسبت ہے اور نہ وہ رباعی کے فنی تقاضوں کی تکمیل کی طرف توجہ دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود محض "رباعی گو" کہلانے کی خاطر وہ اس وادی پر پیچ میں سرگرداں ہیں۔ ان موجودہ رباعی گو شعرا میں کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جنھیں نہ صرف رباعی گوئی سے ذہنی مناسبت ہے بلکہ وہ رباعی گوئی کے فنی تقاضوں سے واقف بھی ہیں اور ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی ان میں موجود ہے۔ لکھنؤ کے ایک بانکے شاعر کا شمار بھی عصر حاضر کے ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے جسے ادبی دنیا سنجے مصرا شوق کے نام سے جانتی ہے۔

سنجے مصرا شوق پیشے سے صحافی ہیں۔ انھوں نے کامرس میں پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد اردو ادب اور فارسی ادب میں بھی پوسٹ گریجویشن کیا جو ان کے اردو اور فارسی ادب سے گہری دلچسپی کے مظاہر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تامل اور گجراتی زبانوں میں بھی سرٹی فکیٹ کورس کیے ہیں جو ہندوستانی زبانوں سے ان کی محبت کو درشاتے ہیں۔ برہمن ہیں، اس لیے سنسکرت بھی آتی ہی ہوگی۔ ہندی تو ان کی مادری زبان ہے۔ گمان ہے کہ انگریزی سے بھی اچھی واقفیت ہوگی۔ جب کوئی اتنی زبانیں جانتا ہو اور شاعر بھی ہو تو یقیناً ان تمام زبانوں کے ادب کے مطالعے سے اس نے روشنی حاصل کی ہوگی۔ سنجے مصرا شوق کا کلام اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ سنجے مصرا شوق غزل بھی کہتے ہیں اور رباعی بھی ان کا میدان ہے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "رات کے بعد رات"

کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ رباعیوں کا کوئی مجموعہ تو شائع نہیں ہوا لیکن مختلف رسائل و جرائد میں ان کی
رباعیات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ رباعیات کے انتخابات اور رسائل کے رباعی نمبروں میں بھی ان
کی رباعیات شامل ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعہ بھر رباعیات تو ان کے پاس ضرور موجود ہوں گی۔ اگر
مجموعہ بھر رباعیات نہ بھی ہوں تو نہ سہی۔ کیوں کہ اصل چیز معیار ہے مقدار نہیں۔ اگر کسی نے چند رباعیاں ہی کہی
ہیں لیکن معیاری کہی ہیں تو اہمیت بہر حال ان چند رباعیوں ہی کی ہوگی۔ بہت پہلے ہمارے ایک دکنی شاعر ملا
وجہی نے اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں معیار اور مقدار کے حوالے سے یہی بات کچھ اس انداز سے کہی ہے:

جو بے ربط بولے تو بیتاں بکیں
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
جسے بات کے ربط کا نام نئیں
اسے شعر کہنے سے کچھ کام نئیں

خیر یہ بات تو ایک جملۂ معترضہ کے طور پر زیب قرطاس ہوگئی۔ بات ہو رہی تھی نجمہ سحر اشوق کی
رباعیات کی۔ نجمہ سحر شوق نے رباعیاں کہی ہیں اور اچھی کہی ہیں۔ ان کی رباعیات میں خیال کی جدت بھی
ہے اور بیان کی ندرت بھی ہے۔ وہ جو بھی کہتے ہیں اچھے اسلوب میں کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی آواز اور اپنے
اسلوب کو منفرد بنانے کی شعوری کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے
ہیں۔ نجمہ سحر اشوق نے اپنی کوشش و کاوش میں کامیابی کے لیے خدا سے دعا بھی کی ہے۔ ان کی دعا ملاحظہ
فرمائیے

تخلیق کو الفاظ کا مسکن دے دے
لہجے کو مرے ایک نیا پن دے دے
بجھتی ہوئی شمعوں کو کروں میں روشن
مولا تو مرے فکر کو ایندھن دے دے

جو شاعر اپنے کلام میں ندرت اور جدت پیدا کرنے کی کوشش کرنے کے باوصف خلوص دل کے
ساتھ اللہ سے دعا بھی مانگتا ہے تو اللہ اسے اس کی توفیق بھی دیتا ہے۔ نجمہ سحر اشوق کی زبان بھی بڑی صاف
ستھری ہے۔ لکھنو کے باشندے ہیں۔ اردو اور فارسی زبانوں سے واقف ہیں اور نسیم اختر صدیقی جیسے استادِ فن
کے شاگرد ہیں۔ پھر فطری ذہانت تو ہے ہی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام چیزیں ان کے فن کو جلا
بخشنے اور اسے سنوارنے میں کسی نہ کسی حیثیت سے معاون و مددگار رہی ہیں۔ روانی صفائی اور بندش کی چستی کے

اعتبار سے بھی اشوق کی رباعیات متاثر کرتی ہیں۔ جیسے

قیدی ہیں مری ذات میں منظر جیسے
دنیا ہے مری آنکھ کے اندر جیسے
دل نور سے معمور ہے ایسے میرا
قطرے میں سمایا ہو سمندر جیسے

☆

نادان ہی اچھا ہے نہ دانا اچھا
بیگانہ ہی اچھا نہ یگانہ اچھا
یہ بات بزرگوں سے سنی ہے ہم نے
اچھے ہو اگر تم تو زمانہ اچھا

☆

رخ اپنا کسی سمت نہیں موڑتی ہے
جو کچھ بھی بناتا ہوں اسے توڑتی ہے
امید تو دیتی ہے دلاسے لیکن
پیچھا مرا تقدیر کہاں چھوڑتی ہے

☆

پیمانِ وفا چھوڑ کے جائے کیسے
خوددار ہے منہ موڑ کے جائے کیسے
ہے میرے سوا کون سہارا اس کا
تنہائی مجھے چھوڑ کے جائے کیسے

تیسری رباعی میں "عذاب تنہائی" کی شدت کو جس کرب انگیزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ بڑی انفرادیت کا حامل ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ تنہائی مجھے ہرگز نہ چھوڑے گی۔ کیوں کہ اس نے مجھ سے پیمانِ وفا باندھا ہے اور وہ خوددار بھی ہے۔ اپنے پیمانِ وفا سے وہ مکرنے والی نہیں ہے۔ اس طرح تنہائی شاعر کا دائمی مقدر ہے۔ یہاں پیش کردہ دوسری رباعی بھی نجمہ منصور اشوق کے داخلی کرب و غم کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ نجمہ منصور اشوق کی رباعیوں میں جابجا سوز و گداز، غم کی کیفیت، کسک اور محرومی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن اس

کے باوجود سخت اور نامساعد حالات کا ڈٹ کر سامنا کرنے کا حوصلہ بھی وہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ تبھی تو کہتے ہیں

غم آئے تو ہونٹوں پہ تبسم کر لیں
یادوں سے تری، دل کا تیمم کر لیں
مشکل سے کریں سامنا ڈٹ کر ہم لوگ
موت آئے تو اس سے بھی تکلم کر لیں

"محبوب کی یادوں سے دل کا تیمم کر لینے" میں جو ندرت بیان اور جدت ادا ہے اس پہ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہر صاحب ذوق کو بہ آسانی محسوس و معلوم ہوتا ہے۔ مجھے مصرا شوق کی بعض رباعیاں رومانیت سے معمور ہیں۔ ایسی رباعیوں میں انھوں نے ہندی لفظوں کا استعمال بھی بڑی ہنرمندی سے کیا ہے۔ یہاں ایسی رباعیاں ہیں جن سے فراق اور جاں نثار اختر کا رنگ جھلکتا ہے۔ دیکھئے

وہ پیکر نازک جو پون سا ڈولے
خاموش نگاہوں کی زباں سے بولے
آکاش پہ گھر آئے ہیں کالے بادل
لگتا ہے کہ اس شوق نے گیسو کھولے

☆

ساجن کا کوئی خط جو کہیں پاتی ہے
چھپ چھپ کے اسے پڑھتی ہے شرماتی ہے
ملنے کا بہانہ لیے خالی گگری
ہر روز وہ پنگھٹ پہ نکل جاتی ہے

☆

پنگھٹ پہ سر شام اکیلی لڑکی
بچپن میں مرے ساتھ کی کھیلی لڑکی
کیوں شرم و حیا چھوڑ نہ پائی اب تک
دنیا میں ابھی تک ہے پہیلی لڑکی

مجھے مصرا شوق نے حمدیہ نعتیہ اور منقبتیہ رباعیاں بھی نہایت ادب و احترام اور بڑی عقیدت و محبت سے کہی ہیں۔ مثال کے طور پہ نعتیہ رباعیاں ملاحظہ کریں:

رشتہ مہ و انجم سے بھی جوڑا میں نے
سرکارؐ کے دامن کو نہ چھوڑا میں نے
اس نورِ مجسمؐ کے برابر نہ ہوا
خورشید کو سو بار نچوڑا میں نے

☆

ہر ظلم و ستم سے پاک عالم ہو جائے
زخمِ دلِ کونین کا مرہم ہو جائے
چھو جائے جہاں ذکر کمالاتِ رسولؐ
ادراک کا خورشید وہیں خم ہو جائے

دو رثائیہ رباعیاں بھی دیکھیں

ہر دشمنِ اسلام کی شامت آئی
چہرے پہ دشمن کے ندامت آئی
مقتل میں جو شبیرؑ نے آگے بڑھ کر
تلوار اٹھا لی تو قیامت آئی

☆

یکتا ہے یگانہ ہے جدا ہے عباسؑ
اسلام کے مقصد کی بقا ہے عباسؑ
دریا سے وفاؤں کا پتا مت پوچھو
بہتے ہوئے پانی پہ لکھا ہے عباسؑ

اس قسم کی رباعیاں ہمیں مصرا شوق کی کشادہ دلی، مذہبی رواداری، صلح کل اور بقائے باہم کی غمازی کرتی ہیں۔ ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسرے مذاہب کی برگزیدہ شخصیات اور ان کے فرمودات کا احترام اور آدر کرے۔ اس سے باہمی احترام کے جذبات کو فروغ ملتا ہے۔ انگریزی سیاست نے اپنے حقیر مفادات کی خاطر مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان جو خلیج پیدا کی ہے اس طرزِ عمل سے وہ خلیج دور ہو سکتی ہے۔ آپسی محبت و مودت اور بھائی چارے کو فروغ دینے کا یہی ایک نسخہ ہے۔ آج بھارت میں اس نسخے کو عام کرنے کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ کیوں کہ آج بھارت کے حالات انتہائی نازک موڑ پر آ چکے ہیں۔

نجے مصرا شوق کی رباعیوں میں رنگینی، تازگی، روانی، ندرت، وحدت اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ دو جگہ رباعیوں میں عروضی خامیاں بھی نظر آتی ہیں جو کھٹکتی ہیں۔ ملاحظہ نعتیہ رباعی

عالم کو فروغ اخلاقی میں آپ
مجموعہ کلام اجتماعی میں آپ
آدم کو گناہوں سے بچانے کے لیے
خالق نے جو لکھی وہ رباعی ہیں آپ

اس رباعی کا دوسرا مصرع ساقط الوزن ہو گیا ہے۔ میں نے کتابت کی غلطی کے امکان پر بھی غور کیا لیکن ہر زاویے سے غور کرنے کے باوجود کتابت کی غلطی کا امکان نظر نہیں آیا۔ دوسری رباعی یہ ہے

جب ذکر پیمبرؐ کے لیے لب کھولے
تو نطق بھی ہونٹوں کے شہد کو گھولے
ہم ایسے غلامان رسول الثقلین
جس سنگ کو چھو لیں وہی کلمہ بولے

اس رباعی کے دوسرے مصرعے میں شہد کی ہ کو نجے مصرا شوق نے متحرک نظم کیا ہے یعنی ابد کی ب کی طرح۔ ایسا کرنے سے فصاحت متاثر ہو گئی اور شہد میں کڑواہٹ پیدا ہو گئی۔ یہ بول چال کا تلفظ ہے۔ کسی ثقہ شاعر نے یہ تلفظ استعمال نہیں کیا۔ اس لفظ میں ہ ساکن ہے۔ جیسا کہ لغت کے علاوہ درج ذیل اشعار سے بھی واضح ہوتا ہے

تیرہ بختی موزیوں پہ کرتی ہے نازل بلا
شہد لٹتا ہے شب تاریک میں زنبور کا

(ناسخ)

گو شہد کی چھری ہے مژگان چشم شیریں
پر ہے نظارہ اس کا سم کوہکن کی خاطر

(محبت دہلوی)

زبان و دہن میں گھلا شہد گویا
جو تعریف ہونٹوں پہ آئی علی کی

(نامعلوم)

نجے سرا شوق کی کہیں کہیں، رباعی میں عوامی بلکہ عامیانہ لہجہ بھی نظر آتا ہے جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً درج ذیل رباعی کا پہلا مصرع غیر فصیح ہے

جو دائرۂ غم سے نکل لیتے ہیں
وہ فکر کی ہر شاخ سے پھل لیتے ہیں
منزل پہ پہنچتے ہیں عمل سے اپنے
خوابوں کو حقیقت میں بدل لیتے ہیں

”نکل لینا“ عوامی انداز ہے جس میں سوقیانہ پن بھی نظر آتا ہے۔ ایسے موقعوں پر فصیحا ”نکل جانا“ کہتے ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایسے عوامی لب و لہجے سے (جس میں سوقیانہ پن بھی ہو) بچنا چاہیے۔

ان دو ایک خامیوں سے قطع نظر نجے سرا شوق کی رباعیات اچھی ہیں۔ ان کی رباعیات میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور مضامین کی رنگارنگی بھی ہے۔ داخلی احساسات کی گرمی بھی ہے اور خارجی ماحول کا عکس بھی ہے۔ زندگی کی تلخی و ترشی بھی ہے اور معاشرے کے اخلاقی زوال پر کڑھن بھی ہے۔ انھوں نے سیاست حاضرہ کی مکاریوں اور منافقتوں کا پردہ بھی چاک کیا ہے اور معاشرے کو راہِ مستقیم بھی سجھاتی ہے۔ وہ ایک دردمند انسان ہیں اسی لیے ان کی رباعیوں میں انسانی دردمندی کے عناصر اور مذہبی رواداری کی روشنی بھی ہے۔

☆☆☆☆

آئینہ فرنگ: ترکی کا پہلا اردو سفرنامہ

سفر عربی زبان کا لفظ ہے جس کی معنی مسافت طے کرنا ہے اور قطع مسافت ہے جبکہ نامہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی خط، مکتوب، دفتر، قرطاس وغیرہ ہے۔ سفرنامہ سفر کا روزنامچہ یا سیاحت نامہ کو کہتے ہیں۔
سیاحت نامے کے اصطلاحی معنی ایک ایسی تحریر ہے جس میں مصنف کے سیاحت کردہ مقامات کی معلومات و نقطہ نظر موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جس میں سیاح نے دوران سیاحت دیکھے ہوئے مقامات، ملے ہوئے لوگوں اور ان لوگوں کے حالات حاضرہ کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اپنی رائے قلمبند کی ہوتی ہے۔ جغرافیہ، آب و ہوا، لوگ، تاریخی مقامات، گزرگاہ اور نقل و حمل کے ذرائع و خصوصیات اور باشندوں کی روزمرہ زندگی سیاحت نامے کے مواد کو تشکیل دینے والے عناصر ہیں۔ لہٰذا ایک ادبی صنف ہونے کے علاوہ یہ مصنف کے نقطہ نظر سے لکھی ہوئی ایک تحریر ہے جس کا تعلق تاریخ، جغرافیہ، سماجی علوم، قوانین حتیٰ کہ صحت جیسے بہت سے مضامین سے ہے اور ایک ہی وقت میں یہ بہت سے شعبوں کے لیے ایک ذریعہ معلومات ہے۔

اس کا نام استنبول ہو یا اسلامبول اور یا قسطنطنیہ، یہ بلا شبہ ان چند شہروں میں سے ایک ہے جو دنیا کی تاریخ میں ادب کے مختلف اصناف کا موضوع رہے ہیں۔ استنبول وہ شہر ہے جو مغرب اور مشرق میں سینکڑوں سفرناموں کا موضوع بنا ہوا ہے اس کے حوالے سے مختلف ثقافتوں اور قومیتوں کے مسافروں نے اپنے انداز میں لکھا ہے۔

اردو زبان کا پہلا سفرنامہ یوسف خان کمبل پوش کا عجائبات فرنگ ہے جس میں سیاح کی سیاحت انگلستان کے مشاہدات ملتے ہیں۔ کمبل پوش نے اس سفرنامے کو 1837ء میں لکھا تھا جب کہ ترکی سے متعلق پہلا سفرنامہ اردو کے پہلے سفرنامہ سے صرف 48 سالوں کے بعد یعنی 1885ء میں قلمبند ہوا۔ ترکی کے متعلق لکھا گیا یہ پہلا اردو سفرنامہ نواب عمر علی خان کا آئینہ فرنگ ہے۔ آئینہ فرنگ سے لے کر آج تک اردو زبان پر ترکی کے متعلق لکھے ہوئے ایک سو سے زیادہ سفرنامے موجود ہیں۔

شبلی نعمانی کا سفرنامہ روم و مصر و شام، مولوی عبدالرحمن امرتسری کا سفرنامہ بلاد اسلامیہ، منشی محبوب عالم کا سفرنامہ یورپ، شیخ عبدالقادر کا مقام خلافت، نازلی رفیعہ سلطان کا سیر یورپ، اختر حمید بلگرامی (سر بلند جنگ) کا دنیا عورت کی نظر میں، محمد حمید اللہ خان کا سفرنامہ قسطنطنیہ، خواجہ غلام ثقلین کا روزنامچہ سیاحت، شاہ بانو کا سیاحت

سلطانی ترکی کے بارے میں لکھے گئے پہلے اور اہم سفرناموں میں سے چند ہیں۔

ترکی کے پہلے سفرنامہ نگار محمد عمر علی خان برطانوی راج ہندوستان میں ریاست بھوپال کے باسودہ علاقے کے نواب تھے۔ وہ 1864ء سے 1896ء تک باسودہ کے نواب رہے ہیں اور اپنی زندگی کے تقریباً 50 سال سفر میں گزارے اور انھوں نے اپنے مشاہدات کو سفرنامے کی شکل میں تحریر کیا اور وہ اپنے دور کے وہ مصنف ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ سفرنامے لکھے ہیں۔ آزاد و غریب کا سفرنامہ، رئیس فرہنگ فرنگ، نیرنگ چین، نیرنگ، رنگون، قند مغربی، اور فرہنگ فرنگ، معاہنگ فرنگ ان کے دوسرے سفرنامے ہیں۔(1)

ا آئینہ فرنگ میں نواب محمد عمر خان کے لندن، پیرس، اٹلی، سپین، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور ترکی کی سیاحت کے مشاہدات شامل ہیں۔ یہ سفرنامہ ترکی کے متعلق لکھے گئے دوسرے سفرناموں کے مقابلے میں ادبی لحاظ سے موزوں نہیں ہے۔ نواب عمر خان کوئی تبصرہ کیے بغیر، یا اپنے جذبات اور خیالات کو شامل کیے بغیر، صرف ان مقامات کے بارے میں مختصر معلومات دیتے ہیں جن کا انھوں نے مشاہدہ کیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے جن شہروں کی سیر و سیاحت کی وہاں کے جغرافیائی تغیر و تبدل، آب و ہوا، جنگل، پہاڑ، قلعے، اسٹریٹیجک صورت حال (فوجی حکمت عملی کے حالات) اور فوجی قوت کے بارے میں مفید معلومات فراہم کیں ہیں۔ یہ سفرنامہ 109 صفحے پر مشتمل ہے۔

انھوں نے 14 اگست 1883 کو اپنے سفر کا آغاز کیا اور آئینہ فرنگ کے ابتدا میں جو جملہ حرکت میں برکت ہے لکھا ہے لگتا ہے کہ وہ ان کی زندگی کا فلسفہ ہے۔ وہ یورپ کی سیر کی وجہ سفرنامے میں ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں:

جہاز سے ثواب آخرت پائیں اور سفر دیگر ممالک سے دنیا کمائیں۔ دنیا بھر میں حصول فوائد دنیوی کے لیے ملک یورپ سے بڑھ کے کوئی سفر نہیں کہ جس میں ہر طرح کا تجربہ قسم قسم کی تعلیم انواع انواع کی دیکھی بھالی اشیاء عجیبہ اور صناعات نادرہ کی کثرت ہے۔ اور یہ ملک فی ما ترقی پذیر ہے۔ اور تہذیب اخلاق اور تدبیر منزل اور سیاست مدن کا ایک عملی نمونہ ہے۔(2)

سفرنامہ کے پہلے صفحوں میں جہاز کی کمپنی، جہاز کا کرایہ اور سمندری رستے کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ نواب عمر علی خان کے اس سفر کے دوران میں مصر اور ہندوستان میں ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے انھیں دوسرے ملک اترنے سے پہلے جہاز پر قرنطینہ میں رہنا پڑا۔

نواب عمر علی خان کے اس سفرنامے میں ترکوں کا حصہ 15 صفحوں پر مشتمل ہے۔ وہ 13 اکتوبر 1883 کو جہاز پر سوار ہو کر استنبول روانہ ہو گئے تھے۔ وہ قراوارغ (مونٹینیگرو)، یونان کے جزائر، بلقر سلطانی، چناق قلعہ، کالی پولی سے استنبول (اسلام پول) پہنچے جس کے بارے میں انھوں نے یہ اشعار لکھے

یہ آرزو تھی مرے دل میں ایک مدت سے
کہ دیکھیے گا جو دکھاتا ہے کب خدا یہ زمیں
خدا کا حکم نہ تھا کیوں کر دیکھتے اس کو
کھلا باب اجابت پہ مرے قفل نہیں
پس از تضرع زاری ہوئی دعا مقبول
دکھایا خالق اکبر نے آج قسطنطین
ہزار شکر ہے اس کا بر آئی دل کی امید
نہ کیوں ہو خاطر افسردہ کو میری تسکین
رہے یہ دولت اسلامیہ سدا آباد
یہی جب تلک کہ مہ و مہر و چرخ و ابر و زمین (3)

نواب محمد عمر علی خان اپنے سفرنامے میں استنبول کے متعلق لکھتے ہیں کہ شہر تین حصوں میں منقسم ہے اور بحیرہ مرمرہ سے گھرا ہوا ہے۔ پہلا حصہ استنبول، دوسرا حصہ اسکودار (Üsküdar) اور تیسرا حصہ بشکطاش (Beşiktaş) ہے۔

پہلے حصے میں وہ جن مقامات کے بارے میں لکھتے ہیں وہ آیا صوفیا (Ayasofya)، باب عالی (Bab-ı Ali)، جامع سلطان احمد (Sultan Ahmed Camii)، جامع سلطان بایزید (Bayezid Camii)، جامع سلطان محمد فاتح (Fatih Camii)، جامع سلطان سلیم (Yavuz Selim Camii)، جامع نوری عثمانیہ (Nuri Osmaniye Camii)، مقبرہ ابو ایوب انصاری ہیں۔ قاسم پاشا (Kasımpaşa)، غلطہ (Galata)، داؤد پاشا (Davut Paşa)، سماتیہ (Samatya)، یدی قلعہ (Yedi Kule)، مکری کوئی (Makriköy-Bakırköy) وہ محلے ہیں جو حصہ استنبول میں واقع ہیں۔

جامع سلطان بایزید کے سامنے والی دائرہ عسکریہ کے متعلق جہاں آج استنبول یونیورسٹی واقع ہے یوں لکھتے ہیں:

جامع سلطان بایزید کے روبرو دائرہ عسکریہ ہے یعنی ایک بلند چاروں طرف اٹھی ہوئی کہیں کہیں دوکانیں نیچے ان کے ہیں اور فوج کی بارکیں اور کہیں تو بے کی جالی تماشا دیکھنے کو لگی ہے۔ مسجد کے روبرو اس کا دروازہ ہے۔ اندر کا میدان قواعد نہایت فراخ ہے جس میں پانچ چھ ہزار فوج قواعد کرتی ہے۔ بیچ میں ایک بڑی کوٹھی دو منزلہ ہے۔ اس کو عسکری سرائے کہتے ہیں۔ (4)

اسی طرح انھوں نے کئی جگہوں کی منظر کشی کی ہے وہ غلطہ میں موجود مینار کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

غلطہ پر ایک منارہ بہت بلند ہے کہ اس پر سے تمام شہر نظر آتا ہے۔ جب کہ اس شہر میں کہیں آگ لگتی ہے تو اس پر بھی نشان قائم کر دیا جاتا ہے۔ اور حضور قائم ہونے نشان کے توپ چلانے سے سات فیر توپ چلتی ہے۔ تمام شہر اطلاع ہو جاتی ہے۔ اور آتش زدگی کے انسداد کے کارخانہ سے پانی کی کلیں وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ (5)

غلطہ کے علاوہ ایک اور مینار ہے جس کے بارے میں نواب عمر علی خان یوں لکھتے ہیں:

محلہ عسکری کا اس دائرہ عسکری میں ایک منارہ بہت بلند ہے۔ وقت آتش زدگی کے سرخ نشان علامت آتش زدگی قائم کر دیتے ہیں۔ (6)

دائرہ عسکریہ اور غلطہ میناروں کے علاوہ وہ استنبول کے دوسرے حصے یعنی اسکدار کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: حصہ دوم اسکدار، اگن بوٹ پر سوار ہو کر یہ حصہ بھی دیکھا۔ اس حصہ کی آبادی تین لاکھ آدمی کی مشہور ہے۔ وہاں بجز بازاروں اور پہاڑوں پر مکانات متفرق اور باغات کے کوئی امر قابل تحریر کے نہ پایا۔ حیدر پاشا تک دیکھا۔ اس میں ٹرینیں۔ پھر لوٹ کے مکان پر آیا۔ (7)

استنبول کے تیسرے حصہ بشکطاش کے حوالے سے محمد عمر علی خان نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس حوالے سے انھوں نے منظر کشی بھی خوب کی ہے وہ کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

سرائے سلطانی لب دریا نشیب میں پانی سے ملی ہوئی ہے۔ تمام سلطانی سرا پائے اور باغات اور دیوار احاطہ اور مکانات سنگ مرمر کے ہیں جن پر کھڑکیاں سنہری چھوٹی چھوٹی دروازہ سنگ مرمر کے کمانی دار مطلا کھلے معلوم ہوتے تھے۔ ایک دروازہ کے قریب چھوٹا حوض کل مطلا خاص سلطان کی سواری کا سے پر تو نیا رکھا ہے اور یہی نام عبدالعزیز خان سلطان کی والدہ کا تھا۔ دو تین میل تک اس طرح کا سلسلہ مکانات اور باغات کا لب دریا چلا گیا ہے۔ یہاں اگن بوٹوں کی نہایت کثرت ہے جیسے لندن میں ریلوں کی دریا میں یہ حال ہی ہے۔ دو دو چار چار ایک ہی مرتبہ مل کے اسٹیشنوں سے چھوٹتے ہیں۔ کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ یہ گیا وہ آیا وہ گیا یہ آیا سمندر میں بڑے بڑے جہاز اور اگن بوٹ اور کشتیوں کا بازار معلوم ہوتا ہے۔ ان سب مکانات سلطانی کو اور جو بازار کہ اس کے متعلق ہے بشکطاش کہتے ہیں۔ دریا کی طرف تو سرائے سلطانی کی دیوار ہے اور اوپر پہاڑ کی جانب اس کے محاذی دوسری دیوار ہے جس کے اوپر باغات اسکے اوپر میدان قواعد اور سفیر روس کا مکان ہے۔ درمیان میں دونوں دیواروں کے ٹرنو چلتا ہے۔ دریا کے طرف دیوار جو محلات سلطانی کی طرف واقع ہوئی ہے اس میں دروازہ سنگ مرمر کا ہے جس کے کواڑ مطلا کے ہیں اور اندازا کا ہے۔ درمیان میں سڑک کے

ایک دروازہ ترپولیا تنگ مرمر کا بنا ہے۔ محل کے قریب کے دروازہ کے پاس ایک چھوٹی مسجد مجیدی بنی ہے۔ وہیں سلطان جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور محلات بادشاہی جو توپ خانہ کی طرف تمام ہوئی ہیں اسی کے روبرو لب دریا ایک میدان میں دروازہ کے سامنے پندرہ بیس توپیں رکھی ہیں۔ عید کو یا اور کوئی تقریب ہو پہلے یہاں کی توپ چلتی ہے پھر اور توپ خانوں کی۔ اسکے اوپر مسجد جامع والدہ سلطان ہے اس سے ذرا آگے۔ یہ محلہ تمام ہوا۔

محلہ توپ خانہ شروع ہوا۔ ہر قسم کی توپیں وہاں رکھی ہیں۔ اور میگزین کثرت سے ہے اور توپیں عمدہ تو چناق قلعہ میں ہیں مگر یہاں بھی لڑائی کی ضرورت کی اندازے سے ہیں۔ یہ محلہ بھی ڈیڑھ دو میل کا دریا کے کنارے چلا گیا ہے۔ اس میں بھی ترنبہ ہے۔ ترک اسکوترانبوا کہتے ہیں۔ انتہا اس کی غلطہ تک ہے۔ غلطہ نیچے دریا کے کنارے چلا گیا ہے قاسم پاشا تک۔ یہ سب میں بڑا محلہ اور بہت آبادی ہے۔ اس کے پہاڑ پر بھی خوب آبادی ہے۔ اس محلہ کو یک اوغلی کہتے ہیں۔ یہیں پہاڑ پر سرکار انگریزی کا سفارت خانہ ہے۔ عمدہ عمارت ہے اور سلاطین یورپ کا بھی گلی پڑا تھا اس یہیں سفارت خانہ ہے۔ پہاڑ پر ٹرنوبرابر چکر سے چلا جاتا ہے۔ اس شہر کی صفائی مثل لندن اور پارس کے ہے۔ اکثر اس میں ارمنیہ نصاریٰ آباد ہیں۔(8)

نواب خان نے اس سفرنامے میں سماجی، سیاسی اور ثقافتی عناصر کو بھی شامل کیا ہے۔ ان میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

قسطنطنیہ کے سردے نہایت شیریں اور انگور بھی بڑے سفید اور سرخ بہت شیریں۔ بیل جوتتے ہیں اور ہل بطور ہند کے ہے۔ ترکاریوں میں یہاں شلغم نہیں مرچ سرخ بہت بڑی۔ تمام ہر محلے کے ترک اور اقوام مثل ہندیوں کے بہت کھاتے ہیں۔ استنبول میں تا ایام تشریق ہر ہر مسجد کے میدان کے سامنے بازار ہوتا ہے۔ ہر نماز کے وقت اکیس اکیس فیر توپ کی ہر ہر توپ خانے سے چلتی ہے۔ جب توپیں چلتی ہیں جنگی کی اور جہازوں کی تو ایک گھنٹے تک عجب کیفیت رہتی ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ اور تمام قبرستان استنبول میں سرو کے باغ ہیں۔ اس لیے کہ وہاں یہ دستور ہے کہ ہر قبر پہ ایک درخت سرو لگا دیتے ہیں۔(9)

انھوں نے ریلوے، بحری جہازوں اور پلوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس دور کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ درج ذیل ہے:

غلطہ اور استنبول کے درمیان دو پل واقع ہوئے ہیں۔ دونوں آہنی ہیں۔ دوسرے پل کے متصل جنگی بحری بیڑہ جہازات سلطانی کا ہے۔ قریب پچاس ساٹھ جہاز کے ٹھہرا رہتا ہے۔(10)

وہ ترک ریل دیکھنے کے لیے ریل پر سوار ہو کر ایاستفانوز (Ayestefanos-Yeşilköy) جہاں روس اور روم کے درمیان عہد نامہ ہوا تھا، جاتے ہیں لیکن انھوں نے سفرنامے میں ریلوے پر تبصرہ نہیں کیا۔

17 ستمبر کو روسی جہاز میں سوار ہو کر چناق قلعہ جاتے ہیں جہاں رنگ برنگ، رنگ رنگ فروٹ بھی ملتے ہیں جاتے ہیں۔ نواب عمر خان بھی ادھر سے صراحی اور گلدان لیتے ہیں۔ اور چناق قلعہ سے ایک ہی جہاز پر ازمیر سمرنا (Izmir-Symrna) جاتے ہیں۔ ازمیر کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

اس جہاز کا ازمیر میں جسے سمرنا کہتے ہیں اور بہت بڑا شہر ہے ایشیا کا ہے اور اس میں ریل بھی ہے نہیں جانا ہوا بلکہ سیدھا میں اس نے لنگر کیا۔ اس بندر میں چھ سات ہزار آدمی کی آبادی ہوگی۔ تین ٹکڑوں پر یہ شہر آباد ہے۔(11)

خلاصہ کے طور پر ترکوں کے بارے میں لکھے گئے پہلے اردو سفرنامے میں معلومات عمومی ملتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی۔ تاہم انھوں نے بحری جہاز سے جتنا سفر کیا، اہم مقامات دیکھے اور نقل و حمل کے بارے میں جتنا بھی لکھا وہ اس عہد پر روشنی ڈالتا ہے۔ نواب عمر علی خان بے شک اردو ادب میں صنف سفرنامہ میں ایک اہم اور نمایاں شخص ہیں۔ اس سفرنامے کے بعد لکھے گئے ایک سو سے زائد اردو سفرنامے برصغیر کے لوگوں کے لیے ترکی کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ برصغیر کے لوگ کس ذوق و شوق سے ترکی کا سفر کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو کتنی محبت سے صفحۂ قرطاس پر اتارتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سفرنامے دونوں ملکوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

حوالہ جات

1- ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور 1987، ص 157۔158

2- نواب عمر خان، سفرنامہ آئینہ فرنگ، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ 1885، ص 5۔

3- ایضاً، ص 88۔

4- ایضاً، ص 83۔

5۔ ایضاً، ص 84۔

6۔ ایضاً، ص 83۔

7۔ ایضاً، ص 84۔

8۔ ایضاً، ص 85۔

9- ایضاً، ص 87۔

10- ایضاً، ص 86۔

11۔ ایضاً، ص 92۔

احمد سہیل (امریکہ)

اردو میں تاریخ گوئی اور داستان گوئی کی روایت اور فن

تاریخ گوئی اور داستان گوئی کے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہوئے انھیں ایک دوسرے سے ممیز بھی کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کا خمیر یکساں طور پر گندھا ہوا ہے۔ اس کا اثر ہندوستانی اور پاکستانی ڈراما اور تھیٹریکل میدان پر گہرا نظر آتا ہے۔ داستان گوئی اور تاریخ گوئی کی نظری مبادیات کو تین نکات میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ راوی ۔۔۔۔۔ قصہ گوئی کی صورت میں ایک کہانی یا داستان میں موجود ہوتا ہے۔

2۔ زبانی داستان گوئی، تاریخ گوئی، روایت، اساطیر، تاریخ اور ثقافت کے رواجی سلسلے ہوتے ہیں۔

3۔ داستان گوئی، الفاظ، تصاویر اور آواز کے زیر و بم کے ذریعے سے واقعات کو رنگینی سے اخراج کرتے ہیں۔ فن تاریخ گوئی سے مراد کسی شعر، مصرع یا نثر کے حروف ابجد سے کسی واقعہ کی تاریخ کا برآمد کرنا ہے۔

یہ روایت اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ہے۔ جو شعر برآمد ہوا سے مادہ یا مادۂ تاریخ کہا جاتا ہے۔ فارسی و اردو میں یہ تاریخ اور عربی میں قطعہ تاریخ اور ترکی میں یہ رمز بھی کہلاتا ہے۔ اردو میں یہ روایت کئی صدیوں سے جاری ہے مگر اب اس کا رواج اردو سے عدم واقفیت کی بنا پر کم ہوتا جا رہا ہے۔ تاریخ گوئی یا معنی الفاظ کے ذریعے کسی واقعے کی تاریخ، بحساب ابجد نکالتا ہے۔ اور تاریخ کو حتمی طور پر متعین کیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ دن مہینہ سال ایک جملے یا مصرعے سے اخذ کی جا سکتی ہے۔ اسے "مادہ تاریخ" سمجھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار یہ پیچیدگی کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ اور "تاریخ گوئی" کی ہیئت کا تخلیقی تکنیک اور ابہام کا شکار ہو کر "معمہ گوئی" کی شکل بھی اختیار کر کے پہیلی نما سوال کی صورت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ داستان گوئی کا دہلی میں سب سے زیادہ چرچا رہا اور یہاں داستان گوئی کے فن کو ایک پرفارمنس آرٹ کے طور پر رواج دیتے ہوئے، داستان کے بیانیہ اظہار کو تخلیقی اور نیا رنگ عطا کیا۔ اور یہ فن ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ روایت ہے کہ ایک نشست میں میر تقی میر نے بھی داستان گوئی کے جوہر دکھائے تھے۔ داستان سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ مگر غدر کے ہنگامے کے بعد داستان گوئی کا فن اجڑ کر لکھنؤ چلا گیا۔ پھر یہ فن اودھ اور رامپور کے دربار میں " داستان

گویاں" کے نام سے معروف ہوا۔ اس کے علاوہ مرثیہ گوئی کے زیر اثر داستان سرائی میں حرکات اور سکنات لب ولہجہ اور اعضا، اشارے اور تجسّس سے داستان گوئی میں تنوع پیدا ہوا۔

یگانہ چنگی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ "پچھلی صدی میں داستان نگاری کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں جو داستانیں منظر عام پر آئیں ان میں خواجہ سگ پرست، شہزادہ جان عالم کی سواری، حاتم بادگرد وغیرہ شامل ہیں۔ بلاشبہ تمام داستانیں انسان کو زمانے کے پیچ و خم اور مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لیے نصیحت ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں "حکمائے یونان کے بقول قصہ گوئی کا فن شاعری اور موسیقی کی دیویوں سے بھی قدیم تر ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ کہانیاں پانچ، دس ہزار سال پیشتر وجود میں آچکی ہوں" قصہ گوئی اور داستان کا فن اردو زبان میں عربی اور فارسی کے توسط سے پہنچا ہے۔ عربی کے مشہور افسانے الف لیلیٰ، السند باد، حاتم طائی کو تراجم کے ذریعے اردو میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ عربوں میں زمانہ جاہلیت میں یہ فن بہت مقبول تھا۔ ڈاکٹر گیان چند دوسری جگہ لکھتے ہیں "عرب میں داستان گوئی باضابطہ ایک فن تھا جو عہد جاہلیت میں عروج پر تھا۔ چاندنی رات میں کھانے کے بعد شائقین حضرات ریت پر اکٹھا ہو جاتے تھے۔ سامر (قصہ گو) قصہ سناتا تھا۔ ہجرت میں اسے مجبوراً روک دی جاتی تھیں" (اردو کی نثری داستانیں ص 41) یہ عرب سے منتقل ہو کر ایران پہنچا وہاں اس نے فارسی لبادہ اختیار کیا پھر ایرانی تجار اور سیاحوں کے ذریعہ اس نے ہند کی سرزمین پہ قدم رکھا۔ اردو والوں نے اس فن کا پرجوش اور پرتپاک انداز میں آگے بڑھ کر استقبال کیا اور اسے عروج و بلندی کے معراج پر پہنچایا۔

سہیل بخاری کے بقول دراصل پورے ایشیائی ادب کا مزاج عاشقانہ ہے اس لیے داستان بھی محبت کے جذبے سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی۔ داستان کے ہیرو کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے کسی ایسی ہستی کا انتخاب کیا جائے جو مافوق الفطرت عناصر اور کم سے کم عمال، وزرا، اور امرا کی شکل میں پیش کیے جائیں یہاں کہ ہیرو کو عوام سے بالاتر اور محترم تر پیش کیے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہیرو میں چند امتیازی صفات ہوتی ہیں۔ وہ بے پناہ حسن کے ساتھ ساتھ وفا کا پتلا بھی ہوتا ہے۔ ہیروئین عاشق کے لیے یہاں تک ایثار کرتی ہے کہ والدین کو چھوڑ کر اس کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ داستان "بیژن و منیژہ" میں منیژہ کی جرأت مندانہ کاوشوں کی بنا پر روایتی اقدار کے باوجود اپنے عاشق کے لیے ہمت و جرأت کا اظہار ملتا ہے۔

دیو، دیونی اور بھوت پریت کا ذکر تقریباً کسی نہ کسی صورت میں کم و بیش ہر داستان میں ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی آتشی مخلوق ہے جو عموماً مشاہدے میں نہیں آتی مگر ان کا وجود تحریر و تقریر میں موجود ہوتا ہے۔ گویا

آنکھوں سے نہیں دیکھا کانوں سے سنا ہے، ذہنوں میں ان کا وجود جاگزیں ہے اور انھیں غیر معمولی قوتوں کا حامل سمجھا جاتا ہے"۔ داستانوں کے پلاٹ میں زیادہ تنوع نہیں ہوتا۔ تمام قصے کچھ ان خطوط پر چلتے ہیں کہ ہیرو کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے راہ میں بہت سے حوادث، دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تمام مصائب کا وہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور فتح یاب ہوتا ہے۔

جہاں تک داستان کی اصل غایت کا تعلق ہے وہ کہانی کی غایت سے مختلف نہیں۔ زیادہ تر داستانوں کے موضوعات ہلکے پھلکے عشقیہ و تفریحی ہوتے ہیں۔ کچھ داستانیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں اخلاق آموزی، تہذیب نفس، عالمانہ دقیقہ سنجی، مذہب اور تبلیغ پر زور دیا جاتا ہے لیکن یہ تمام باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور داستان کی اصل غایت میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔ داستانی تکنیک کو کلچرل، اخلاقی اور دیگر مسائل کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے تاکہ سننے والے یا پڑھنے والے ان داستانوں کو درس آموز کلیات کے طور پر شعوری یا لاشعوری طور پر ذہن نشیں کر سکیں۔ داستانوں میں اخلاقی تعلیم یا مذہبی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں یعنی معلمین اخلاق اور علمبرداران مذہب نے بھی داستان کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کے ایسا کرنے کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اخلاق و مذہب کے مبادیات تفریحی مطالعہ کے طور پر آسانی سے سمجھائے جا سکتے ہیں۔ تفریح اور عشق کا التزام بھی کسی داستان میں ضرور ملتا ہے۔ اس کے علاوہ عجائب نگاری کی بہت زیادہ کوشش ہوتی ہے۔ طلسم و سحر، نیرنگ و فسوں پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے جاتے ہیں۔

بقول صغیر افراہیم داستان دراصل زندگی اور اس کی حقیقتوں سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ خواہشات کی تکمیل جب حقیقی عنوان سے نہ ہو پاتی تو تخیل کے سہارے ان کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی اس لیے انسان جب اپنے حالات سے فرار حاصل کرتا تو عموماً داستانوں کی دنیا میں پہنچ کر ذہنی و قلبی سکون حاصل کرتا۔ سہیل بخاری کے بقول دراصل پورے ایشیائی ادب کا مزاج عاشقانہ ہے اس لیے داستان بھی محبت کے جذبے سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی۔

کچھ داستانیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں اخلاق آموزی، تہذیب نفس، عالمانہ دقیقہ سنجی، مذہب اور تبلیغ پر زور دیا جاتا ہے لیکن یہ تمام باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور داستان کی اصل غایت میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔ داستانی تکنیک کو کلچرل، اخلاقی اور دیگر مسائل کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے تاکہ سننے والے یا پڑھنے والے ان داستانوں کو درس آموز کلیات کے طور پر شعوری یا لاشعوری طور پر ذہن نشیں کر سکیں۔ داستانوں میں اخلاقی تعلیم یا مذہبی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں یعنی معلمین اخلاق اور علمبرداران مذہب نے بھی داستان کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کے ایسا کرنے کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اخلاق و مذہب کے مبادیات

تفریحی مطالعہ کے طور پر آسانی سے سمجھائے جا سکتے ہیں۔ تفریح اور عشق کا التزام کسی نہ کسی داستان میں ضرور ملتا ہے۔ اس کے علاوہ عجائب نگاری کی بہت زیادہ کوشش ہوتی ہے۔ طلسم و سحر، نیرنگ و طلسموں پر دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے جاتے ہیں۔ بقول صغیر افراہیم "داستان دراصل زندگی اور اس کی حقیقتوں سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ خواہشات کی تکمیل جب حقیقی عنوان سے نہ ہو پاتی تو تخیل کے سہارے ان کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی اس لیے انسان جب اپنے حالات سے فرار حاصل کرتا تو عموماً داستانوں کی دنیا میں پہنچ کر ذہنی و قلبی سکون حاصل کرتا۔ صفدر امام قادری نے لکھا ہے: "اردو میں داستانوں پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اکثر ان کی زبانی روایت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ داستانیں تحریر کے قالب میں آنے سے پہلے زبانی روایت کا حصہ تھیں لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رہتی ہے کہ ان داستانوں کو قلم بند کرنے کا سلسلہ اردو کے حصے میں بھی چار پانچ سو برس سے ضرور قائم ہے۔ اس میں کچھ ترجمہ اور کچھ بادشاہوں کی فرمائش کا بھی ہاتھ رہا ورنہ سب رس جیسی کتاب آج سے تقریباً چار سو برس پہلے کیسے سامنے آگئی ہوتی۔ سچائی یہ ہے کہ ہماری موجودہ نسل داستانوں کو تحریری شکل میں ہی پڑھتی رہی ہے اور ان کے الفاظ یا داستانی روایت کا مکمل عرفان ہم نے کتابوں کے مطالعے سے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چھاپہ خانے اور بدلتی ہوئی دنیا میں زبانی روایت کے معاملے محدود کر دیے اور رفتہ رفتہ ہم کتابوں میں سمٹنے کے لیے مجبور ہوئے۔"

برصغیر پاک و ہند میں ویسے تو بہت سی داستانیں مشہور ہوئیں لیکن سب سے مشہور داستان امیر حمزہ تھی۔ جب اسے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا تو وہ بہت پھیلتی چلی گئی۔ 19ویں صدی کے آخر میں جب داستان امیر حمزہ کو چھپوانا شروع کیا گیا تو اس کی کوئی 46 جلدیں بنیں۔ داستان امیر حمزہ والی ایک ٹکڑا ہے طلسم ہوش ربا جو جلدوں پر محیط ہے۔ ان 46 جلدوں کو اکٹھا کرنے اور پڑھنے اور تنقید کرنے کا کام بھارت کے نقاد شمس الرحمان فاروقی صاحب نے کیا۔

قصہ گوئی کے بارے میں اشفاق احمد کا کہنا تھا کہ داستان گوئی کا کمال یہ تھا کہ بڑے بڑے مجمعوں میں داستان گو اپنی داستان اگر شروع کرتا تھا تو لوگ سحر زدہ حالت میں اسے سنتے تھے۔ وہ اپنی کہانی شروع کرتا تھا درمیان میں فرض کریں بادشاہ کا ذکر آیا تو مجمع میں سے ہی ایک شخص بادشاہ کے لباس میں ملبوس بادشاہ کی کہانی شروع کر دیتا تھا۔ پھر فرض کریں ذکر آیا ملکہ کا تو ایک اور شخص ملکہ کے لباس میں موجود ملکہ کی کہانی شروع کرتا تھا گویا داستان گو حضرات نے ایسا ڈرامائی تاثر قائم کیا تھا جسے ایک زمانے تک عوام میں پذیرائی ملی۔ میر باقر علی اردو داستان گوئی اور دلی کی تہذیب کی آخری نشانی تھے۔ داستان گوئی کے فن میں میر باقر علی نے خصوصی شہرت حاصل کی تھی یہ ان دنوں کی بات ہے جب دلی ہندوستان کا دل تھی۔

قلعہ برباد ہو چکا تھا لیکن شاہجہانی دہلی کے یادگار زمانہ لوگ اس کے سہاگ کی داستان اور آپ بیتیاں گھر گھر سناتے نظر آتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو بھی اسی دلی کی یادگار ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی داستان گوئی کا فن بس انہی پر ختم ہے۔

تحریری شکل میں ان کی کل 17 داستانیں بطور یادگار موجود ہیں۔ جن میں سے پہلی داستان یہی کتاب "ملیل وال کانٹہ" ہے۔ میر باقر علی داستان گو 1850ء میں دلی میں پیدا ہوئے اور 1928ء میں ان کا انتقال ہوا۔ میر صاحب کے بزرگ ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ میر باقر علی نے داستان گوئی کا فن اپنے ماموں میر کاظم علی سے سیکھا تھا جو اس وقت نظام حیدرآباد کے ہاں داستان گو مقرر تھے۔ میر باقر علی داستان کیا کہتے تھے چلتی پھرتی تصویریں پیش کرتے تھے بلکہ یوں کہیے خود تصویر بن جاتے تھے۔ اہل علم اور بڑے بڑے راجہ نواب انھیں یاد فرمایا کرتے تھے خصوصاً نظام حیدرآباد اور رام پور، لوہارو، دوجانہ، مالیر کوٹلہ، پٹیالہ، کشمیر وغیرہ کے والیان ریاست نے میر صاحب کے فن کی بڑی قدر و منزلت کی اور انھیں ہمیشہ سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ یہ فن انھیں اپنے ننھیال سے ملا تھا۔ ان کے نانا میر امیر علی اور ماموں میر کاظم علی کا تعلق دلی دربار سے تھا۔ یہ دونوں مانے ہوئے داستان گو تھے۔ 1890ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر حسن علی تھا۔ کم عمری میں والد کے انتقال کے بعد ننھیال میں پرورش پائی اور نانا اور ماموں کے ساتھ داستان سرائی کی محفلوں میں شرکت سے بچپن ہی سے داستان گوئی سے رغبت پیدا ہوگئی اور ایسی رغبت پیدا ہوئی کہ اس فن میں امامت کا درجہ پایا۔ انھوں نے 18 مارچ 1928ء کو دلی میں انتقال فرمایا۔ شاہد احمد دہلوی نے ان کی داستان گوئی کی محفل کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ اجلی اجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت لگا دیا جاتا اس پر قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔ سامعین گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقہ کا دور چلتا۔ گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا سے افیون کی گولی نکالتے۔ دوائی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی نکال کر اس میں گھولتے رہتے۔ اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون پانی میں آجاتی تو روئی نکال کر اگالدان میں پھینک دیتے۔ اور گھونٹ سے کی چسکی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔ اور فرماتے "چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو" پھر داستان شروع کر دیتے۔

16 ویں صدی میں پنپنے والی داستان گوئی کی صنف کا سلسلہ ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں بیتا۔ دلی کے آخری داستان گو میر باقر علی کا انتقال 1928ء میں ہوا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ داستان گوئی کے قواعد کے بارے میں زیادہ کوئی علم موجود نہیں ہے۔

داستان گوئی سے متعلق مرزا اسداللہ خاں غالب کا خیال ہے کہ داستان طرازی من جملہ فنون سخن ہے۔ سچ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔

بقول کلیم الدین احمد "داستان کہانی کی طویل پیچیدہ اور بھاری بھرکم صورت ہے۔" گیان چند جین کے مطابق "داستان کے لغوی معنی قصہ، کہانی اور افسانہ کے ہیں۔ خواہ وہ منظوم ہو یا منثور۔ جس کا تعلق زمانہ گذشتہ سے ضرور ہو اور جس میں فطری اور حقیقی زندگی بھی ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ غیر فطری، اکتسابی اور فوق العادت شاذ و نادر فوق العجائب بھی ہو سکتے ہیں۔

افسانوں کی قسموں میں داستان ایک مخصوص صنف کا نام ہو گیا تھا۔" یورپ میں جو عاشقانہ داستانیں تصنیف کی جاتی تھیں اور ان میں کچھ کہانیاں ہیجان انگیز اور پرکشش ہوتی تھیں وہ قصوں باقاعدہ لکھی جاتی تھیں۔ ان پچھلی عاشقانہ داستانوں کو "رومانس" کہا جاتا تھا۔ رومان کی کئی قسمیں ہوتی تھیں۔ اردو میں تاریخ گوئی اور داستان گوئی ایک زمانے سے ہو رہی ہے جس پر فارسی ادبیات کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی گئی۔ اس سلسلے میں تسلیم سہوانی کی "مخمس تسلیم بہ زبان فارسی {۱۸۸۵ء} ۔ الم کی "معین تاریخ" {۱۸۹۵ء}۔ کافی مشہور ہوئی۔ اس حوالے سے حافظ فیروز الدین کی ایک عمدہ کتاب "تاریخی خزانہ" ہے۔ ریاد گی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے "پچھلی صدی میں داستان نگاری کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں جو داستانیں منظر عام پر آئیں ان میں خواجہ سگ پرست، شہزادہ جان عالم کی سواری، حاتم، بارہ گرد وغیرہ شامل ہیں۔ بلاشبہ تمام داستانیں انسان کو زمانے کے پیچ و خم اور مصیبت و آلام میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لیے نصیحت ہیں

لیکن کیا موجودہ دور کا قاری اس سائنسی ایجاد کے اس دور میں داستانوں کی طرف راغب ہو سکتا ہے آج کل کے قاری کے پاس تو ایسی طویل داستانوں کو پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں وہ جدید ٹیکنالوجی کا عادی ہے جب کہ اس ٹیکنالوجی کو بنانے والے کے ہاں سائنس فکشن پر مبنی ناول اور مختصر کہانیاں تخلیق پا رہی ہیں تو اس کا دائرہ انگریزی ادب تک محدود ہے جس کی مثال مشہور ناول "ہیری پوٹر" ہے جس میں داستان کی طرح واقعہ در واقعہ سمونے کی کوشش بڑی کامیابی سے کی گئی ہے لیکن ہم اہل مشرق سے اردو ادب میں اس سلسلے میں کوئی کام نہیں ہو رہا اور نہ ہی اس ضمن میں کوئی امید کی جا سکتی ہے اس لیے کہ انگریزی ادب پڑھنے والے مالا مال ہیں، جو اس قسم کی کہانیاں بطور اسٹنٹس پڑھتے ہیں۔ اور اردو زبان کی ترقی تو ہمارے ملک میں ویسے بھی نہیں اور ادب تو پہلے ہی دائرہ پر لگا ہوا ہے"

("داستان گوئی خیال یا حقیقت" روزنامہ جنگ کراچی میگزین 29 جولائی 2020)۔

☆☆☆☆

اشفاق حسین (کینیڈا)

خواہشیں!

ابھی میں
کم از کم دو نظمیں اور لکھنا چاہتا ہوں
ایک
محبت سے بھرپور انگڑائی لیتی ہوئی نظم
سرشاری کی لہروں میں ڈوبی ہوئی
رنگین خوابوں کی چادروں میں لپٹی ہوئی
بارش کے شفاف پانیوں میں بھیگی ہوئی
جل تھل کرتی
ایسی نظم کہ جس کو پڑھ کر
تجھے میرے سوا اور کچھ بھی یاد نہ آئے
اور دوسری وہ نظم
جو میری قبر کے کتبہ پہ
بجھے ہوئے چراغ کی یاد دلائے
اور اس کتبہ پہ لکھی نظم پڑھ کر
کسی کو تیرے سوا اور کچھ بھی یاد نہ آئے!!

☆☆☆☆

نجم الثاقب (جنوبی امریکہ)

فلوریڈا

میں نے سنا ہے
تم نے اپنی شامیں یہاں گزاری ہیں
Vivaldi کے Four Seasons میں سے گزرتے ہوئے
دور سے چاچاچا اور سامبا میں گم ہوتے شہر
اور سمالیکون سے آتی ہوئی ٹھنڈی میٹھی ہوا کے گیت
اور یوں تم نے اپنی کہانی کو موڑ دیتے ہوئے
شاید اولنڈ مین اینڈ سی کے پہلے باب پر سوچا ہو
میں یہاں صرف سگریٹ پی سکتا ہوں
تم نے شاید Wine کے ساتھ Pork بھی کھایا ہو
ریسٹورانٹ والے حیران ہیں
وہ جو ڈالر، بی یو اور سیاہی کی تھون میں گردش کر رہے ہیں
انھیں میرا یہاں بیٹھنا عجیب لگ رہا ہے
(میں نے پانی کی ایک بوتل آرڈر کر دی ہے)
ریسٹورانٹ کے باہر ایک شخص سے میں نے تمھارے بارے میں پوچھا
اُسے تم یاد ہو
اُس نے تمھارے بارے میں ایسی باتیں کیں
جیسے تم سے ابھی مل کر آیا ہو
میں نے سنا ہے

تم نے اپنی زندگی کے آخری برس جہیں کہیں بسر کیے
تمہارے گھر یا کردہ ناپ رائیٹر دیکھا
تمہارے گھر میں کون کون سی Celebrities آئی تھیں، پتا چلا
وہ کشتی ابھی تک تمہارے گھر کے پاس رکھی ہے
جس کو دیکھنے کے لیے تمہارے کتوں کی قبروں کو پار کر کے جانا پڑتا ہے
کیوبا کے بچوں کو آزادی کے گیت گاتے
میں نے دیکھا ہے
تمہارے باتھ روم میں پڑی Weighing Scale پہ آج بھی تمہارا وزن ہے
اور تمہارے ہاتھ سے لکھی ہوئی عبارتیں، تمہاری پُراسرار خاموشی کو
کوئی معانی دے رہی ہے
تمہاری تصویریں، چینی کے بنے برتنوں، پلیٹوں اور
Keychain میں
تمہارے گھر کے پاس، ایک چھوٹی سی میوزیم نما دکان میں
میں نے دیکھی ہیں

گائیڈ تمہاری بیوی کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا
بڑے آدمیوں کو اتنی چھوٹی بیویاں کیوں ملتی ہیں؟
گائیڈ تمہاری امریکہ میں موت کا قصہ سنا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا
بڑے آدمی سکون سے مر بھی نہیں سکتے؟
اتنی بڑی مچھلی کو، بوڑھے آدمی کے کمزور کندھوں نے اتنی دیر سنبھالا؟
یہ صرف کہانیوں میں ہوتا ہے

☆☆☆☆

یشب تمنا (لندن)

خوابوں سے دستبرداری کا موسم

تو کیا خوابوں سے
دست برداری کا موسم آگیا ہے؟
تو کیا ہم پھر
تہی داماں لیے
بازارِ دنیا میں
کسی قلاش کی طرح
ہوا کے وار کھائیں گے؟
بتاؤ تو!
اے زمیں زادو بتاؤ تو
ہمیں کس جرم میں تم نے
سزائے ذلت و رسوائی بخشی ہے؟

☆☆☆☆

غضنفر ہاشمی (امریکہ)

بس اک ذرا سا رنج ہے

جو تہہ بہ تہہ جما ہوا ہے دل کے فرشِ زرد پہ
ملال ہے
جو رُک گیا ہے ریشِ لہو کے ساتھ جسم میں
اے ربِ حرف و صوت کُن!
کھڑا ہوا ہوں
میں ترے جہاں میں، گُنگ ساعتوں کے شور میں
گھرا ہوا ہوں ہر طرف سے
گُلفتوں کی بھیڑ میں
سکوت ہے،
سکوت جسم و جان سے نکل نہیں رہا ابھی
میں بولتا ہوں
اور حرف ہونٹ سے پھسل نہیں رہا ابھی
نہ جانے کتنے ماہ و سال جان پہ گذر گئے،
ابھی تلک پڑا ہوں کوہِ وقت کی ڈھلان پہ
سوال ہیں، سوال رُک نہیں رہے
گمان ہے، گماں کی گہری دھند ہے
جو چھٹ نہیں رہی ابھی
یہ چادرِ طلسمِ غیب

سامنے سے ہٹ نہیں رہی ابھی
کہاں ہے تُو
بہت خلا ہے
تیرے میرے درمیاں
خلا یہ ختم ہو نہیں رہا ابھی
یہ رنج دل کے فرش سے اتر نہیں رہا ابھی
☆☆☆☆

ثروت زہرا (امریکہ)

خزاں آ رہی ہے

خزاں آ رہی ہے
فضا قرمزی سبز ئی
لاجوردی
تڑختے ہوئے
سوکھے پتوں کے بوجھ تلے
کچھ خنک
اور بھاری ہوئی جا رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

مئے ناک پی کر گھٹا
اک نئی سرمئی ارمغانی
نظر آ رہی ہے
خود میں مدہوش ہے
لڑکھڑاتی ہوئی
اپنے افلاک کی وسعتوں تک
اڑی جا رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

سرد و سبز ڈالی پہ ٹھہری ہوئی
صوفیانہ فضا
میرے ادراک تک
ہمکتی آ رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

خامشی
میگھ ملہار میں
کوکتے راگ سے
زخمی سینوں کو
برما رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

بے سُر دوڑتی ہوا
اپنے قدموں تلے
چرچراتے ہوئے
سوکھے پتوں کی
اس سرمئی موت سے
اک نئی زندگی
کھینچ کر لا رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

جنگلوں راستوں کی زمیں
تارکولی کسی راہ تک
چرمراتے ہوئے
پستی ہو گیا
زرد موسم کی
فوجِ ظفر کے تلے
یا نہیں کس طرف جاری ہے
خزاں آ رہی ہے

اے برہنہ شجر دیکھ تو
تیری خوں آشنا سرخی
شفق رنگ میں
خود سے شرمائے ہی جا رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

انہیں پیپلوں کے تلے
عاشقوں کے لیے
ٹھنڈی میٹھی پون
چھوٹے چھوٹے دنوں
لمبی لمبی شبوں کی
خبر لا رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

جھنڈ اور ٹولیوں میں
پرندوں کا رخت سفر
دیکھ کر
سطح دریا پر اک موج میں
درد تنہائی سے
اپنے اندر
بکھی جا رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

بیج کی پھر بوائی کرانے
اسے گدگدانے
نئی رت ابھی سے
کہاں تو چلی آ رہی ہے
خزاں آ رہی ہے

بتا تو بتا
مرے پیپل کی ٹہنی میں
جاگے ہوئے شوق رفتار
تیری نظر
کس طرف
اور کس کے لیے
جا رہی ہے خزاں آ رہی ہے

ڈاکٹر فریاد آزر (نئی دہلی، بھارت)

انتظار

آج بھی شام ہے اداس اداس
آج بھی دل بجھا بجھا سا ہے
آج بھی کوئی خط نہیں آیا
پھر بھی آئے گا وہ ضرور کبھی
پُرکشش ہے جو تیرے حسن سے بھی
میرے زخموں کا مداوا ہوگا
میرے شیشوں کا مسیحا ہوگا
خط نہیں ہوگا وہ مگر تیرا
وہ مری زندگی کا خط ہوگا
وہ مری نوکری کا خط ہوگا!!!!

☆☆☆☆

شہباز خواجہ (برطانیہ)

کیون کارٹر

تم پیڑوں، پرندوں
جھیلوں اور آبشاروں کی تصویریں بناتے تو بہتر تھا
جانے کون قاتل گھڑی تھی
جب تمھارے کیمرے کی آنکھ نے انسانی چہرہ دیکھ لیا
مارچ انیس سو ترانوے
سوڈان کی آگ اگلتی زمین
بے لباس، فاقہ زدہ
کم سن زندگی
چند قدم دور
اس کی ڈوبتی سانسیں گنتا ہوا
ایک مطمئن گدھ
تمھارے کیمرے کی بروقت کلک
تالیاں، پذیرائی........!!
پولٹزر پرائز........!!
ستائیس جولائی انیس سو چورانوے
تیس جمع تین کی عمر
عین اس جگہ جہاں تم بچپن میں کھیلا کرتے
یہ احساس بڑھتا ہوا

کہ تم بے لباس،
فاقہ زدہ اور بے بس وجود،
کھوکھلی تہذیب کا گدھ
تمھارے قریب منڈلاتا ہوا
تمھاری ڈوبتی سانسیں گنتا ہوا
تم جان گئے!
بڑے بڑے ایوانوں اور عبادت گاہوں میں بیٹھے
مطمئن گدھ
کبھی فاقہ نہیں کرتے
سو تم نے اپنے ہاتھوں
سانس کی آخری گرہیں بھی کھول دیں
تمھارا کیمرہ اس منظر کو تصویر نہ کر سکا

☆☆☆☆

سائے کی کہانی

سوتی جاگتی رات کا کوئی پچھلا پہر تھا
چاند کا روشن چہرہ کھڑکی کے شیشوں پہ جھکا ہوا تھا
نیند لرزتی پلکوں کی جھالر کے نیچے پھیل رہی تھی
خواب سرہانے اونگھ رہا تھا
آنے والا دن ہاتھوں میں
بادل، خوشبو، گیت لیے تیار کھڑا تھا
ایسے شانت سمے میں جانے کب اور کیسے
نرم ملائم بستر سے اک سایہ نکلا
روتا، چیختا، شور مچاتا
گرلاتا اور بین اٹھاتا
اور پھر اُس نے دیکھتے دیکھتے
ساری نظموں کے دل چیرے خون بہایا
آس امید کے ورق اڑائے
پھول مسل کر کانچ کی کشتی فرش پہ توڑی
میز الٹ کر دیواروں سے سر ٹکرایا
ایک قیامت کا گریہ تھا
خوف کے مارے
خواب زمیں کی تہہ میں اترا

چاند نے گھری بدلی اوڑھی
نیند کھڑی کونے میں تھر تھر کانپ رہی تھی
ایک پہر یا ایک صدی تھی
جیسے تیسے وقت کٹا تھا
رات کی چادر چیر کے روشن اور چمکیلا دن نکلا تھا
دھیرے دھیرے نظمیں ڈھونڈیں، ورق سمیٹے،
پھول اٹھائے، کرچی جوڑی
خواب کو اک پاتال سے ڈھونڈ کے آنکھ میں رکھا
اور کونے میں دیکھے، سہمے ہچکی بھرتے،
ہارے ہوئے سائے کو پھر سے
اپنے جی کا میت بنایا

☆☆☆

رخسار ناظم آبادی (بحرین)

محبت

یہ ہے کہانی پیار کی
خزاں کی اور بہار کی
سکون اور قرار کی
دلوں کے اضطرار کی

کہ ان دنوں جواں تھے ہم
حسین داستاں تھے ہم
سفر میں یوں رواں تھے ہم
خبر نہیں کہاں تھے ہم

وفاؤں کا وہ مان تھی
بہت ہی خوش بیان تھی
گلوں کی ترجمان تھی
وہ میری ہم زبان تھی

وفا کے سلسلے لیے
دلہن بنے سجے لیے
ہتھیلی پہ دیے لیے
چلی تھی وہ مرے لیے

وہ باعث قرار تھی
مہک رہی تھی زندگی
جب ایک راہ پہ نئی
چلے تھے ہم خوشی خوشی

ہر ایک سمت نور تھا
اندھیرا ہم سے دور تھا
وفاؤں پہ غرور تھا
یہی تو بس قصور تھا

ہوا تب اس کا یہ اثر
کسی کی لگ گئی نظر
وہ ایک چھوٹا سا نگر
بنے تھے ہم بڑی خبر

پھر اس کے بعد یوں ہُوا
انھیں بھی چل گیا پتہ
جو تھے زمانے کے خدا
ہُوا تب ایک فیصلہ

یہ فیصلہ عجیب تھا
وہ جو مرا نصیب تھا
کسی کے وہ قریب تھا
وہ یوں کہ میں غریب تھا

خوشی کے دن گزر گئے
نجانے وہ کدھر گئے
دلوں میں غم اتر گئے
جو خواب تھے بکھر گئے

سو پھر رہا ہوں در بہ در
گلی گلی، نگر نگر
کبھی اِدھر کبھی اُدھر
زمانے بھر سے بے خبر

پھر ایک دن وہیں اُدھر
وہی پرانی رہ گزر
مجھے وہ آئی تھی نظر
کسی کی بن کے ہمسفر

بچھڑ کے اب وہ دور ہے
وہ غیر کی ضرور ہے
تھکن سے چور چور ہے
مگر وہ بے قصور ہے

وہ اب کسی کے پاس ہے
بہت ہی خوش لباس ہے
نجانے کیوں اُداس ہے
خدا سے التماس ہے

سفر میں وہ رواں رہے
یہ حوصلہ جواں رہے
یوں سر پہ سائباں رہے
نصیب مہرباں رہے

وہ خوش رہے جہاں رہے
وہ خوش رہے جہاں رہے

☆☆☆☆

عتیق انظر (قطر)

قبر سے قبر تک کا سفر

منگنی صبح میں
اپنی آنکھوں میں خوابوں کی لاشیں لیے
قبر سے اپنی اٹھ جاتے ہیں
جلدی جلدی نہا کر
بدل کر کفن
دوڑتی بھاگتی قبر میں بیٹھ کر
جا پہنچتے ہیں ہم دوسری قبر میں
جس جگہ اور مردے ہماری طرح
کام کرتے ہیں قبروں میں بیٹھے ہوئے
چائے کی میز پر جمع ہوتے ہیں جب
چائے کے ذائقے میں ملاتے ہیں سب
غیبتوں چٹکلوں قہقہوں کا مزہ
کوئی صاحب کے کردار پہ بات کرتا نہیں
جبر سے ان کے انکار کرتا نہیں
پھر بھی صاحب کے جاسوس کتے
چلے آتے ہیں سونگھتے سونگھتے
ان کہی بات کی ٹوہ میں
"ان ہوئے" جرم کی کھوج میں

کون سمجھا ہے ان کو کہ مردے ہیں ہم
زندگی کے مسائل پہ ہم بات کرتے نہیں
سانولی شام ڈھلتی ہے جب
اپنی قبروں سے ہم سب نکل جاتے ہیں
دوڑتی بھاگتی قبر میں بیٹھ کر
لوٹ آتے ہیں پھر قبر میں
اور مر جاتے ہیں رات بھر کے لیے
پھر نئی مہنگی صبح میں
اپنی آنکھوں میں خوابوں کی لاشیں لیے
قبر سے اپنی اٹھ جاتے ہیں
قبر سے قبر تک کا سفر
جاری کب تک رہے کیا خبر!

☆☆☆

اقبال طارق (بحرین)

نجانے کیسے زندہ ہیں

وہی دھرتی ہماری ہے
وہی قصہ پرانا ہے
یہاں نفرت ہی نفرت ہے
محبت کا ترانہ ہے
وہی رم جھم ہے ساون کی
وہی پائل کی چھن چھن ہے
وہی سوہنی، وہی سسی
وہی ہے صاحباں اس میں
وہی کھیڑے، وہی کیدو
وہی حالات ہیں اس کے
کوئی بھی شے نہیں بدلی
ازل سے ہی
محبت ہم نے دفنائی
مگر نفرت نہ دفنائی
سو اس نفرت بھرے ماحول میں ہم اب بھی زندہ
مگر ہم کیسے زندہ ہیں
نہیں زندہ کہاں ہیں ہم
بس اتنا ہے فقط ہم سانس لیتے ہیں

پروفیسر مہ جبین غزال (بھارت)

سالِ نو

حسیں پھولوں کی خوشبو
رنگ کتنی ہی بہاروں کے رلیے دامن میں اپنے
سالِ نو پھر مسکرایا ہے
فضاؤں میں ہے آہٹ
مچلتی خوشیوں کے قدموں کی
غموں کے نقش پا پر
ریت صحراؤں کی سوئی ہے
میں چلتے چلتے یکس
شہرِ نو میں آ گئی ہوں آج
جہاں نغمہ ہے، مستی ہے
محبت ہے، مسرت ہے
یہ سب کچھ ہے مگر جب عقل پھر سے ہوش میں آئے
کہیں یہ کیفیت دل کی مری
مجھ سے وہ چھن جائے
مجھے مغموم پا کر
سالِ نو خود سے وہ شرمائے
لہٰذا اور کچھ پل عقل کو بے ہوش رہنے دو
مجھے اس شہرِ نو کی جان و دل سے سیر کرنے دو!

ڈاکٹر فرزانہ فرحت (لندن، برطانیہ)

نیا سال

کچھ جیت چلے کچھ ہار چلے
ہم نئے برس کے پار چلے

سوچو تو ادھورا خواب ہوا
دیکھو تو ایک سراب ہوا
اک دکھ سکھ کا مضراب ہوا
جو عمر کے سال گزار چلے
ہم نئے برس کے پار چلے

نہ کھلا وہ بھید نہ کھلنا ہے
یہاں ننگے پاؤں چلنا ہے
جانے کس آگ میں جلنا ہے
جب بچھڑ پرانے یار چلے
ہم نئے برس کے پار چلے

جب زیست کی برف پگھلتی ہے
جب ہاتھ سے دور پھسلتی ہے
یہ ہستی کہاں سنبھلتی ہے
سب دوست بھی غمخوار چلے
ہم نئے برس کے پار چلے

یہ خواب نہ ٹوٹے اب دیکھو
یہ ساتھ نہ چھوٹے اب دیکھو
یہ پیار نہ روٹھے اب دیکھو
کچھ کابل کچھ قندھار چلے
ہم ستے برس کے پار چلے

دنیا کا کھیل نرالا ہے
یہ رشتوں کی اک مالا ہے
ہر منظر دیکھا بھالا ہے
رنگوں کی ساتھ قطار چلے
ہم ستے برس کے پار چلے

یہ دل پہ کیسا گھاؤ ہے
اک اور بھنور میں ناؤ ہے
یہ کیسا چل چلاؤ ہے
میں کون یہاں جو ہار چلے
ہم ستے برس کے پار چلے

تجھے کسی نے دکھ کے خار چنے
سکھ کے تجھے کسی نے خواب بنے
ہر رنگ کے ہم نے گیت سنے
کچھ اپنے دلوں کو مار چلے
ہم ستے برس کے پار چلے

☆☆☆☆

ریاض شاہد (بحرین)

اے دسمبر تو مت آیا کر

تیرے آنے سے کئی زخم ہرے ہوتے ہیں
دلِ شکستہ سے اک ہوک مسلسل اٹھے
جب بھی ٹوٹے ہوئے بازو کی طرف دیکھتا ہوں
اشک آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں جب یاد آئیں
وہ تڑپتے ہوئے لاشے کہ جو مکتب میں گرے
پھول فردا کے مرے کھلنے سے پہلے پہلے
کس قدر دیدہ دلیری سے عمل کر بے گیا
دوست کی شکل میں دشمن ہے یقیناً میرا
سوچئے تو یہ بہت گہری سیاست ہے کوئی
جس پہ ہوتا ہے عمل دیدہ و ابہام کے ساتھ
اور اس دیدہ مبہم کا بھی سوچئے مت
نام لینا بھی منع، دیکھنا سننا بھی منع
کتنے پتوں کو ہواؤں میں اڑایا ہے گیا
کتنے اشجار کی شاخوں کو مٹایا ہے گیا
تا کہ اس دیدہ مبہم کو نہ جانے کوئی
تو بتا کیسے دسمبر! تجھے اچھا میں کہوں
جب مرے باغ کا مالی ہی مرا اپنا نہیں
گلشنِ عشق پہ پھر کیسے بہار آئے گی؟

سرفراز تبسم (برطانیہ)

ابھی کچھ پیار باقی ہے

لکھوں تاروں سے بھری اس شام کا منظر
مگر کیسے لکھوں؟
کہ ہر طرف رنگوں کی اک برسات کا موسم
مری آنکھوں میں گاتا ہے
میں سوچوں تو مری قلمی نگارش کا بانا
ہر سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا ہے
مگر یہ رات
مجھ پہ کتنی بھاری ہے
مرے مولا
مجھے اس رات کی برسات میں
زندہ تو کر پھر سے
مجھے آنکھوں میں سارے ناچتے گاتے
یہ منظر قید کرنے ہیں
اگر میں لکھنے بیٹھوں گا
ستارے جھلملائیں گے
ہوائیں برف کی چادر لیے ہی
جھوم جائیں گی
اگر سورج مجھے ایک آخری دیدار دے کر

چھپ چکا ہے تو

وہ بھی تو اس تحریر میں حق خاص رکھتا ہے

مگر میں سوچ میں ڈوبا ہوں اب کس کو لکھوں پہلے

ابھی میں منتظر ہوں کہ وہ شاید لوٹ کر آئے

جسے میں روز دل میں دفن کرتا ہوں، جگاتا ہوں

ابھی تتلی اڑی ہے پھول سے واپس بھی آئے گی

ابھی کھلتے ہوئے اس پھول کی خوشبو کو آنا ہے

ابھی سورج نہیں نکلا ابھی صبح نہیں آئی

ابھی الفاظ کا جادو نہیں پھیلا، ابھی رستے نہیں بدلے

ابھی آزاد ہیں پاؤں ابھی کچھ راہ نہیں بدلی

ابھی کچھ بھی نہیں بدلا، ابھی دستار باقی ہے

ابھی جذبات زندہ ہیں، ابھی کچھ خواب زندہ ہیں

ابھی اقرار باقی ہے، ابھی کچھ پیار باقی ہے

ابھی کچھ پیار باقی ہے!

☆☆☆☆

سعید نقوی (امریکہ)

درخت

پتوں کے ملبوس کی اب صرف افسردہ مہک سی باقی تھی۔ وہ دو پت جھڑ کے بعد برہنہ درخت سردی سے کانپ رہا تھا۔ آسمان سے اترتی سفید روئی سردی میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ جو چیز سینکڑوں کے لیے تسکین و تفریح کا باعث تھی، اس کا اثر ہر ایک پر یکساں نہیں ہوتا تھا۔ وہ درخت اپنا سر بلند کیے، اپنے تن کی کپکپاہٹ چھپائے مضبوطی سے ایستادہ تھا۔ اگر جڑیں گہرائی میں پیوست ہوں تو سر بلندی دشوار نہیں ہوتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ برف سے فرار اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ آسمان کی کارستانی تھی۔ اور آسمان کی کارستانی کا علاج صرف آسمان کے پاس ہی ہے۔ اگر کوئی اس کے تنے پر ہاتھ رکھتا تو یقیناً تنے کی خفیف سی سرسراہٹ ضرور محسوس کر لیتا۔ یہ سرسراہٹ شاید صرف خارجی برف کی وجہ سے ہی نہیں تھی، یہ اندر سے اٹھتی تنگی تھی۔ بخار کی تپش بھی وہی کپکپی طاری کر سکتی ہے جو برف کی تنگی۔ وہ اس کی نچلی شاخیں کاٹ کر لے گئے تھے۔ سردی جو آتی زیادہ تھی۔ وہ جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ برف گرنے کے بعد شاخیں کاٹیں تو گیلی ہوں گی۔ دھواں دیں گی۔ شعلے پیدا نہیں کر سکیں گی۔ اس لیے انھوں نے برف گرنے سے پہلے ہی سردی سے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا۔ اپنی گرمی کے لیے اسے برہنہ کر دیا تھا۔ یوں یہ کپکپاہٹ صرف سردی ہی سے نہیں تھی۔ یہ اس کے اندر سے کہیں اٹھتی مایوسی تھی۔ وہ اس کی نچلی شاخیں کاٹ کر لے گئے تھے۔ وہ سردی برداشت بھی کر سکتے تھے۔ بند گھر میں رہتے تھے۔ انھیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ یہ شاخیں اس کے تن سے کسی وجہ سے ہی اگی ہوئی ہیں۔ یہ درخت پھل دار نہیں تھا۔ ان کے لیے بیکار تھا۔ شکر ہے ان کی نگاہ اور ضرورت صرف نچلی شاخوں سے ہی پوری ہو گئی تھی۔ کیا معلوم یہ ختم ہونے پر وہ اونچی شاخوں کی طرف۔۔۔ اور پھر ان کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتے۔ ضرورت اشد ہو تو پہنچ کے دست بھی دراز ہو جاتے ہیں۔

یہ درخت بہت پرانا نہیں تھا۔ لوگوں کو یاد ہے کہ ابھی دو، تین سال پہلے ہی کی بات تھی جب کریم بابو کی نوکری کی معیاد ختم ہوئی تھی۔ جہاں تک لوگ یاد کرتے یہ درخت اس کے بعد ہی نمودار ہوا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں ریلوے کے چپراسی کی ملازمت کی مدت پوری ہو گئی۔ مٹھی بھر تنخواہ اور ایک ہفتہ چلتی۔ مہینے کے باقی تین ہفتوں کے لیے اوپری آمدنی کام آتی۔ کریم بابو ہمیشہ رات کی ڈیوٹی لگواتے۔ مال گاڑیوں میں رات کی حفاظتی نوکری ان کے خاندان کے تحفظ کے امکانات پیدا کرتی۔ گھر سے نکلتے تو ایک بجٹ ایک تھیلے میں دو چپاتیاں

اور کچھ سامان ایک ٹفن میں رکھ کر ان کے ساتھ کر دیتی۔ محلے سے نکل کر بڑی سڑک تک آتے، راہ میں بچے بڑے سب ہی سلام کرتے۔ کریم بابو اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ سب سے اچھی طرح ملتے تھے۔ کسی طرح انھوں نے سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ بڑی سڑک سے ایک بس انھیں ریلوے اسٹیشن تک لے جاتی۔ ایک چھوٹے ٹفن کے لیے بھلا اتنے بڑے تھیلے کی کیا ضرورت تھی، کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ اس محلے میں تقریباً سب ہی بڑے تھیلوں میں چھوٹے ٹفن کے ضرورت مند تھے۔ تھیلے کی ہیئت بدل جاتی لیکن فلسفہ وہی رہتا تو کوئی کیا پوچھتا۔ جس بات کا علم ہو اسے دریافت کرنا محض مخاطب کو شرمندہ کرنے کا امکان پیدا کرنا ہے۔ واپسی میں کریم بابو کا تھیلا زیادہ بھرا ہوتا۔ ان کی ڈیوٹی ہفتے کے پانچ دن ہوتی۔ یوں ہفتے کے پانچوں دن اس تھیلے میں کچھ نہ کچھ بھرا رہتا۔ اناج، غلہ، ضروریاتِ زندگی کا دوسرا سامان جو مال گاڑی کے ڈبے میں ایک قصبے سے دوسرے میں منتقل ہو رہا ہوتا۔ ورنہ کبھی تو تھیلے کی جگہ ان کی خاکی وردی کی جیب بھی کافی ہوتی۔ ضرورت مند تھے لالچی نہیں۔ بس اتنا کہ گھر میں چولہا جلتا رہے اور بچے پڑھتے رہیں۔ کبھی گھر میں شادی غمی کا موقع بھی آ جاتا۔ اوپر تلے کے پانچ بچے تھے، تین لڑکے اور دو بیٹیاں۔ جب وہ نیک بخت پورے پیٹ سے ہسپتال جاتی تو ان دنوں کریم بابو کے تھیلے کا وزن اور بڑھ جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک بیٹا اب میٹر ریڈر تھا۔ اور دوسرا انجینئرنگ کا ڈپلومہ کر رہا تھا۔ بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو چکے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا مرگی کا مریض، کسی کام کا نہیں تھا۔ ان کے ٹفن کے تھیلے کا وزن اتنا بھی نہیں تھا کہ مرگی کے کسی ماہر ڈاکٹر سے باقاعدہ علاج کراتے۔ ایک بار دکھایا بھی تو اس نے اتنی مہنگی دوائیں لکھ دیں جو ان کے ٹفن کے پیٹ سے زیادہ تھیں۔ سو اب یہ لڑکا کبھی گھر میں اور کبھی باہر اعصاب سمیٹ کر چیختا۔ اپنی گدی پکڑ لیتا۔ پورے بدن سے زمین پر گرتا اور تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ گھر والے تو کیا اب محلے والے بھی عادی ہو گئے تھے۔ اگر وہ باہر ہوتا تو کوئی بھاگ کر کریم بابو کے گھر پر اطلاع کر دیتا۔ کوئی چپل لے کر اس کی ناک کی جانب لپکتا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی غشی کے بعد بیٹا بیدار ہو کے کپڑے جھاڑتا اور زندگی پھر اپنے ڈگر پہ چل نکلتی۔

میٹر ریڈر بیٹا ٹفن تو دے جاتا۔ اس کے کام میں اناج کے بجائے نقد کا زیادہ دخل تھا۔ اس نے کبھی باپ سے پوچھا کہ سپاہی کی تنخواہ میں سات افراد کا اپنا کنبہ کیسے پال لیا اور نہ ہی کریم بابو نے اس سے کبھی میٹر ریڈر کی نوکری کے بارے میں سوال کیا۔ ناگزیر ضروریات معاشرے کی پابندیوں کی خلاف ورزی کا معقول عذر تھیں۔ گھر ایک خاموش سمجھوتے کے تحت چل رہا تھا۔ جس میں مالیات کے علاوہ ہر بات موضوعِ گفتگو بنتی۔ سیاست، مذہب، سماجیات، حکومت، تعلقات۔ لیکن آمدنی اور اخراجات کے بارے میں ایک سوچی سمجھی خاموشی اختیار کی جاتی۔ یعنی سب ہی یہ کرتے ہیں یہ کہہ کر ہر فرد خود کو سمجھا لیتا۔ یہ ایک خوش و خرم گھرانا تھا جو جرمِ زندگی کی سزا ہنس کر جھیل رہا تھا۔

ریٹائرمنٹ کی عمر ہونے تک بڑا بیٹا باقاعدگی سے کمانے لگا تھا، درمیانہ بیٹا بھی انجینئرنگ ڈپلومہ کے
درمیان جز وقتی ملازمت کر رہا تھا۔ بیٹیوں کی شادی سے دو افراد گھر میں کم ہوئے اور بڑی بہو گھر آگئی۔ میٹر ریڈر
کی اگر صنعتی علاقوں میں تعیناتی ہوتی تو وہ شاید اپنا ایک الگ گھر لے لیتا لیکن شہری صارفین کی تجاوزات میں
محض بغیر کنکشن کا ایئر کنڈیشنر، یا آہستہ چلتا میٹر ہی شامل ہوتا۔ جس سے اتنی آمدنی نہ ہو پاتی کہ وہ الگ گھر لے
سکے۔ لہٰذا بیٹا بہو فی الحال کریم بابو کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔

ریٹائرمنٹ پر سب ہی عزیز و اقارب نے مبارک باد دی کہ چلیے عزت سے ایک دور ختم ہوا۔ کریم بابو نے دل لگا
کر محنت سے نوکری کی، کبھی بلا ضرورت چھٹی نہیں کی، اور ایمانداری سے مدت ملازمت مکمل کی۔ یہ بات ان
کے ادراک سے اوجھل نہیں تھی کہ جس دن چھٹی لیتے اس دن ٹفن کا خالی تھیلا باورچی خانے کے کونے میں ایک
دیوار سے ٹکا نیک بخت کا منہ چڑا رہا ہوتا۔ سب کو معلوم ہو جاتا کہ آج غالباً گھر میں دال یا سبزی پکے گی۔ کئی دن
کی متواتر تعطیل سے گھر کے اقتصادی نظام میں ایک بھونچال آجاتا۔ نئے پرانے ٹوٹکے اور نسخے آزمائے
جاتے۔ اس بات کو یقینی بنایا جاتا کہ کریم بابو واقعی ملازمت پر جانے کے لائق نہیں، اور محض کسل مندی یا
تھکاوٹ ہی انہیں نہیں روک رہی۔ کیا عجب ہے کہ کئی بار کریم بابو ہلکے بخار میں بھی ملازمت پر حاضر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی زندگی کی رفتار وہی رہی، صرف رخ بدل گیا۔ جیسے کسی بیل کو رہٹ کی مشقت
سے نکال کر بیل گاڑی کے سامنے جوت دیا جائے۔ کریم بابو گھر کے کاموں میں دفتری کاموں سے زیادہ
مصروف ہو گئے۔ اب وہ گویا ان کاموں کے لیے مہیا تھے۔ گھر میں بلا وجہ کام نکلنے لگے۔ بابو یہ کر لیجیے گا، بابو وہ
لے آئیے گا۔ ابھی تک بڑے بیٹے کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی لہٰذا پوتے پوتیوں کی خدمت کی ذمہ داری سے
آزاد تھے۔ گھر کے کچھ کام جو پہلے دوسرے کرتے وہ اب ان کی ذمہ داری ہو گئے۔ اب غیر محسوس طریقے سے گھر
میں حاکمیت بھی بدل رہی تھی۔ بیٹوں کے لہجے میں زیادہ بے باکی آگئی تھی۔ آئینی طور پر وہ اب بھی گھر کے سربراہ
تھے لیکن اب آئین کے نفاذ میں اتنی سختی نہ برتی جاتی۔ انہیں لگتا اب وہ کسی شاہی جمہوریت میں نام کے بادشاہ
ہیں۔ تقریبات میں معزز نظر آنا بھی ان کی ذمہ داریوں میں سے ایک تھا۔ نیک بخت انہیں دیکھتی تو انہیں لگتا
جیسے اس کی نگاہوں میں کچھ تھا۔ انہیں وہ کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ کیا یہ ترحم تھا؟ جو بھی تھا انہیں نامنظور تھا۔ نیک
بخت کے روز و شب میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان کے درمیان بھی اب نئے اصول وضع ہو گئے تھے،
نئے خاموش معاہدے۔ یہ زندگی اپنے اطراف میں لوگوں سے خاموش معاہدوں ہی سے تو گزرتی ہے۔ یہ
معاہدے خود بخود ہی مرتب ہو جاتے ہیں، سرحدیں متعین ہو جاتی ہیں، کس کو کہاں تک جانے کی اجازت ہے،
کون سے فقرے منع ہیں اور کون سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ کبھی بیٹا کوئی ایسا فقرہ کہہ دیتا جس کی گونج کئی دنوں تک

گھر میں سنائی دیتی۔ بڑھتی عمر اور گھٹتے اقتدار کے ساتھ ان تعلقات کی روز نئی حدود متعین ہو رہی تھیں، جن میں کریم بابو کی زمین تنگ اور باقی افراد کا رقبہ بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی ہمسایہ غیر محسوس طریقے سے آپ کے علاقے میں تجاوز کرنے لگے۔ ایک اینٹ یہاں، ایک پودا وہاں۔

گھر میں تین کمرے تھے۔ سب سے بڑے اور زیادہ آرام دہ کمرے میں کریم بابو اور ان کی نیک بخت رہتے۔ یہ بھی ایسی باتوں کی مانند ہوتا ہے جو خود بخود تسلیم کی جاتی ہیں۔ ویسے بھی اس وقت وہ گھر میں واحد شادی شدہ جوڑا تھے۔ ایک کمرے میں لڑکے اور تیسرے میں دونوں بیٹیاں۔ پھر بیٹیاں بیاہ کر اپنے سسرال میں خود اپنے نئے کمروں میں چلی گئیں تو بڑے بیٹے کو شادی کے بعد ان کا کمرہ مل گیا اور باقی دونوں بیٹے سب سے چھوٹے کمرے میں رہتے رہے۔

وہ بھی ایسا ہی خنک دن تھا، سرد، بے رحم۔ شاید کریم بابو کے ریٹائر ہونے کے ایک سال بعد کی بات ہوگی جب بڑے بیٹے نے انھیں یاد دلایا کہ اس کے کمرے میں سردی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

'حیرت ہے، بیٹیوں نے کبھی بتایا ہی نہیں؟' کریم بابو خالی الذہنی سے بولے۔ یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ بہو جو بہت کم گو اور خاموش طبع تھی، اس نے یاد دلایا کہ خود بابو جی کے کمرے میں تو شدید سردیوں میں بھی اتنی ٹھنڈ نہیں ہوتی۔ اگر وہ کبھی کسی کام سے ان کے کمرے میں جاتی تھی تو سردی اسے اذیت نہ دیتی۔'

'کیا ہو سکتا ہے؟' بڑے بیٹے نے تاسف سے کہا۔ یہ 'کیا ہو سکتا ہے' جیسے فضا میں ٹھہر گیا۔ ایک لمحہ اس نے انتظار کیا کہ کوئی اس کا جواب دے، پھر یہ تبصرہ تیرتا ہوا زمین پر اتر گیا: 'جو ہے اسی میں گزارا کرو۔' بیٹے نے اپنی بیوی کو سمجھایا۔ اس رات واقعی بہت سردی تھی۔ کریم بابو کو بھی اپنے کمرے میں بجلی کا ہیٹر جلانا پڑا تھا۔

'میرے خیال میں کسی طرح بیٹے کے کمرے کے لیے بھی ایک اضافی ہیٹر لے لیا جائے۔' کریم بابو نے کمرے کی تنہائی میں نیک بخت سے کہا۔

'ہمیں اپنا یہ کمرہ بیٹے بہو کو دے کر چھوٹے کمرے میں منتقل ہو جانا چاہیے۔' یہ مشورہ دیتے ہوئے نیک بخت کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تھی۔

'ارے ہم اپنا کمرہ کیوں تبدیل کریں؟' کریم بابو بولے۔ 'کچھ جوڑ کر ان کے لیے بھی بجلی کا ایک اور ہیٹر منگوا لو۔ اس کے ہوتے ہوئے بجلی کے بل میں اضافہ تو ہونے سے رہا۔' انھوں نے بات میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔

'ہیٹر لانے سے تو صرف کمرے کا درجہ حرارت ہی بڑھ سکے گا۔' نیک بخت کو بعض اوقات کریم بابو پر بہت غصہ آتا۔ یہ یقیناً ان ہی لمحات میں سے ایک تھا۔ وہ مضطرب تھی، شوہر کا مزاج سمجھتی تھی۔ وہ کسی آنے والے

طوفان سے پہلے فضا میں تعطل دیکھ رہی تھی، جیسے فضا خود بے یقین ہو کہ کس کا ساتھ دے۔ کریم بابو شاید یہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ انھیں یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ کچھ بدل رہا ہے۔ اس رات وہ دیر سے سوئے۔ انھوں نے خواب میں خود کو ایک صحرا میں بھٹکتے پایا۔ ان کا قطب نما کھو چکا تھا اور راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ بس منہ اٹھائے صحرا میں کبھی اس طرف چل دیتے، کبھی اس طرف۔ سمت کے تعین کے بغیر صحرا کا یہ سفر انھیں جان لیوا لگ رہا تھا۔ اچانک ان کا پاؤں ریت کے ایک بھنور میں پڑا، پھر وہ اس سے نکل نہ سکے۔ اس نے ان کے دونوں پاؤں جکڑ لیے۔ ان کے پاؤں سے جڑیں نیچے کی جانب بڑھنے لگیں۔ ان کا بدن ایک تناور درخت بن گیا۔ اب وہ اپنی جگہ بدلنے سے قاصر تھے۔ شب گزر گئی لیکن ان کا خواب ختم نہ ہوا۔ اب وہ گھر میں صبح سے منسوب آوازیں سن رہے تھے۔ پتیلی میں چائے ابلنے کی آواز، توے پر چپاتی پلٹے جانے کی آواز، انڈا تلے جانے کی خوشبو۔ انھوں نے آواز دے کر نیک بخت کو پکارنا چاہا، مگر ناکام رہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں، کچھ بھی تو نہیں ہلا پا رہے تھے۔ وہ محض خواب ہی نہیں تھا۔ جاگنے پر وہ اس کی تعبیر بن گئے تھے۔ ایک انہونی سی بات ہو گئی تھی۔ خواب میں بھٹکتے جانے کس وقت وہ کمرے سے باہر آ گئے تھے، وہ ایک درخت بن گئے تھے۔ اگر سوچو تو اس میں بہت زیادہ حیرت کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔ حیوانات و نباتات دونوں ہی جاندار ہیں۔ سانس لیتے ہیں، بڑھتے ہیں، لباس بدلتے ہیں، غذا استعمال کرتے ہیں، بڑھاپا آتا ہے اور مر بھی جاتے ہیں۔ تو یہاں حیات نے محض اپنا روپ بدل لیا تھا۔ کریم بابو درخت بن گئے تھے۔ تصویر کا فریم اسی دیوار پر ٹنگا تھا لیکن اس میں لگی تصویر بدل گئی تھی۔

نیک بخت نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر یہ قد آور درخت دیکھا۔ پھر کریم بابو کی غیر موجودگی۔ درخت سے بہت مانوس خوش بو آ رہی تھی، جس سے صرف وہ ہی واقف تھی۔ ہر آدمی کی اپنی مخصوص بو ہوتی ہے لیکن یہ اس سے مختلف ہوتی ہے جو صرف اس کے ہم سفر کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ یہ اتنی خفیف ہوتی ہے کہ صرف لپٹنے والے کے مشام جاں کو ہی معطر کر سکے۔ ایک دوسرے کو شناخت کرنے کی خوشبو۔ اس درخت سے وہی مانوس خوش بو اٹھ رہی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ گھر میں ہونے والی کوئی تبدیلی اس سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ وہ یک بارگی بے ساختہ درخت سے لپٹ گئی، پھر چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کسی نے دیکھا تو نہیں۔

اگر کسی نے محسوس بھی کیا کہ کل تک تو یہ درخت موجود نہیں تھا، اب اچانک یہ کہاں سے نمودار ہو گیا تو وہ بولا نہیں۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ ہم مانوس منظر میں نئی چیز دیکھیں تو بے یقینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی پودا ہوتا تو شاید سوال اٹھتا۔ مگر پورا درخت، یہ کیسے ممکن ہے۔ یقیناً یہ یہیں موجود رہا ہوگا۔ میں نے ہی غور نہیں کیا۔ اگر کسی کو الجھن ہوئی بھی تب بھی وہ نہیں بولا کہ کہیں اس کا مذاق ہی نہ اڑایا جائے۔ بہت ہاہاکار بھی، اخباروں میں اشتہار دیے گئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے نے سب سے زیادہ اثر لیا۔ وہ دور دراز محلوں اور علاقوں میں نکل جاتا۔ جیسے اسے

امید ہو کہ باپ کبھی فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا مل جائے گا۔ رفتہ رفتہ اس سرگرمی میں کمی آ گئی۔ انھوں نے صبر کر لیا۔ اب بھی کبھی گفتگو میں حیرت سے سر ہلاتے: "اتنا بڑا آدمی کیسے اچانک غائب ہو گیا!"

سردیوں کے دنوں میں کھڑکی عموماً بند رہتی۔ درخت تنہا باہر کھڑا رہتا۔ گھر کے انتظامی دائرے سے باہر، وہ سب سن سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا، اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ کہ سوچ بھی سکتا تھا۔ مگر نہ ہی وہ بول سکتا تھا اور نہ ہی اپنی مرضی سے جگہ بدل لینا اس کے بس میں تھا۔

جب نیک بخت نے دانت میں درد کی شکایت کی تو بہو نے تجویز کیا کہ درخت کی ایک چھوٹی ٹہنی توڑ کر اس سے مسواک کیا کریں۔ خود اس کی خالہ کو یہی بیماری تھی۔ جو دن میں دو بار مسواک سے دور ہو گئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی جب اس کی ساس نے وہ مسواک توڑنے سے اتنی سختی سے منع کیا۔ کریم بابو کے اچانک غائب ہو جانے کے بعد سے اس کے اپنی ساس سے تعلقات عجیب سے ہو گئے تھے۔ اسے لگتا جیسے اس کی ساس کوشش کرتی کہ اس کی راہ میں آ جائے۔ ان کے درمیان خاموش معاہدے میں کچھ یک طرفہ ترمیمات ہو گئی تھیں۔

شام میں چھوٹا بیٹا مسواک توڑ لایا تو نیک بخت کا رنگ زرد پڑ گیا۔

'اماں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟' وہ تشویش سے بولا۔

وہ جواب نہ دے سکیں۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسواک کو دیکھتی رہیں۔ انھوں نے اسے ایسی احتیاط سے تھام رکھا تھا جیسے مسواک زمین پر گر گئی تو کوئی قیمتی چیز ٹوٹ جائے گی۔ انھوں نے اسے بہت احتیاط سے اپنے غسل خانے میں رکھ لیا، اور اس کے بعد کبھی دانت کے درد کی شکایت نہیں کی۔

موسم بدل گیا۔ کھڑکی سے لگا، بے فکر درخت ان کے کسی کام کا نہیں تھا۔

'اماں تو اس کی ایسی نگہداشت کرتی ہیں کہ بابو جی ہوتے تو حسد کرتے،' بہو نے ایک دن ہنس کر کہا۔

'بابو جی کی اچانک گمشدگی نے انھیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اگر درخت میں دل لگ رہا ہے تو لگا رہنے دو،' شوہر نے اسے سمجھایا۔

آم کے درختوں پر بور آیا تو جیسے پورے خاندان کی اجتماعی رال بہنے لگی۔ یہ پھل ہے بھی تو ایسا شاہانہ۔ گھر کے ہر فرد کو پسند تھا۔ جنگ دستی میں اس کی گٹھلی تک ایسے چوس لی جاتی کہ بچائی نہیں جاتی۔ آم آنے سے پہلے ہی اس کے بور کی تیکھی مہک آنے والے اچھے دنوں کا اعلان کرنے لگی۔ درخت کی جڑوں سے ایک ہوک سی اٹھی، اور حسرت بن کر اس کی شاخوں میں کہیں دم توڑ گئی۔ نیک بخت نے کھانے کے بعد سب میں ایک ایک آم تقسیم کیا تھا۔ شاید چار ہی آم تھے۔ درخت کے پتوں نے دم سادھ لیا جب بڑا بیٹا ایک پلیٹ میں تین آم اور چھری لیے دبے پاؤں بیوی کی طرف گیا۔

'مجھے معلوم ہے کہ تم نے دل بھر کر نہیں کھایا تھا' اس نے ایک آم کاٹ کر بیوی کی طرف بڑھایا۔

'چھپا کر لائے ہو؟'

'ارے کم تھے، پہلے نکالتا تو وہیں سب میں تقسیم ہو جاتے۔'

'ہاں یہ تو ہے، لیکن اگر تم مجھے وہاں سب کے سامنے ایک زیادہ آم دیتے تب بات تھی!' بیوی اٹھلا کر بولی۔

'تمہارے لیے آم کھانا زیادہ ضروری ہے، یا سب کے سامنے زیادہ وصول کرنا؟' بڑے بیٹے نے چڑ کر پوچھا تھا۔

'دونوں!' وہ بے تکلفانہ بولی تھی۔

یہ منظر نیا نہیں تھا۔ صرف کردار اور ڈائیلاگ بدل گئے تھے۔ نیک بخت کو یاد تھا جب کریم بابو اور وہ جلدی جلدی گھر سے باہر آم ختم کر کے پھر گھر میں داخل ہوئے تھے۔

گرمیوں میں کھڑکی کھل جاتی تو درخت کا بس نہ چلتا کہ اپنی شاخیں کمرے کے اندر بھیج دے۔ ایک بار پانی کی بالٹی اٹھائے، نیک بخت کا پاؤں ایسا رپٹا کہ گرتی پڑی۔ درخت کو ایسا لگا جیسے وہ خود ہی گر پڑا ہو۔ اسے یقین تھا کہ وہ چیخا تھا، 'ارے کوئی دیکھو نیک بخت کو!' لیکن خود اس کے علاوہ بہو بھی نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس نے جو دیکھا تھا اس پر یقین نہیں کر پایا تھا۔ اپنے قد کی اونچائی سے وہ کھڑکی کے بالائی حصے سے اندر کی جانب دیکھ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے بہو کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ شاید بالٹی کی سمت ہی آ رہی تھی۔ اس نے ساس کو گرا دیکھا تو ٹھٹکی اور پھر الٹے قدموں بے آواز واپس ہو گئی۔ یہ بہت حیرت کی بات تھی کیوں کہ اس چھوٹے سے گھر میں تو افراد ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی نیک بخت نے بھی گردن گھما کر بہو کو جاتے دیکھ لیا تھا! اس نے بہو کو نہیں پکارا تھا۔ وہیں زمین پر پڑی رہی اور کچھ دیر بعد بمشکل اپنے آپ کو اٹھایا۔ واقعی۔ کیا اس کی آنکھیں دھوکہ دے رہی تھیں۔ کیا نیک بخت نے بہو سے مدد لینے کے بجائے زمین پر گرے رہنے کو ترجیح دی تھی۔ یہ اس کے گھر کا ماحول تھا؟ اتنا اجنبی، وہ اس سے کیوں کر اتنا بے خبر تھا؟ کیا درخت انسانی رویوں کے بہتر گواہ ہوتے ہیں؟ خاموش ناظر، تمام واقعوں پر نظر رہتی ہے مگر منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ بے بسی سے اس کے آنسو نکلے بھی ہوں گے تو کہیں چھال میں ہی جذب ہو گئے ہوں گے۔

پیڑ کا حال اس کے ماضی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس درخت کے موجودہ کا اس کے ماضی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کاش اس کے ماضی و حال باہم کوئی ربط پیدا کر سکتے۔ لیکن وہ تو دو مختلف زبانیں بول رہے تھے۔ حال

ماضی سے بے خبر تھا۔ اور ماضی آئندہ کے ممکنات وحادثات سے بے پرواہ۔ اب وہ بڑا بیٹا اپنی تنخواہ سے زیادہ آمدنی لا کر بیوی کے ہاتھ پر رکھتا تو درخت کی سرسراہٹ بڑھ جاتی۔ لگتا جیسے کوئی شاخ بڑھ کر اس تجاوز کو روک دے گی۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

پت جھڑ کا موسم بہت دشوار ہوتا۔ اس کے تن کے سارے پتے جھڑ جاتے۔ نیک بخت انھیں پیار سے سمیٹتی، تھیلے میں جمع کر دیتی۔ ایک بار بہو نے اسے جمع کیے ہوئے پتے جلاتے دیکھا تو رات ایک خوف زدہ سرگوشی میں شوہر سے بولی 'اماں کا توازن جا رہا ہے۔'

ایک بار اماں پتے سمیٹتے ہوئے ان پر پھسل کر گریں تو طے ہو گیا کہ اب وہ پتے جمع نہیں کریں گی۔ بیٹے کی آواز میں ایسی قطعیت تھی کہ انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ بیٹے نے کچھ دن تو پتے اکٹھے کیے، مگر نوکری کے بعد آ کر پتے اکٹھے کرنا بہت دشوار تھا۔

'یہ بے ثمر کا درخت ہمارے کس کام کا ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اسے کٹوا دوں گا۔' اس نے اعلان کیا۔

'نہیں۔ میں اسے نہیں کٹنے دوں گی۔' اب ان کی آواز میں ایسا تحکم تھا کہ بچے چونک اٹھے۔

'نہیں اماں۔ میں بھائی کو اسے نہیں کٹوانے دوں گا۔ میں اٹھا لیا کروں گا پتے۔' چھوٹے بیٹے نے ماں کا زرد چہرہ دیکھ کر اسے لپٹا لیا۔ ماں کے لہجے کی شدت تو وہ بھی نہیں سمجھ سکا تھا لیکن اس شدت سے وہ ڈر گیا تھا۔ اس نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ باہر درخت سر اٹھائے اس تمام ماجرے کو دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا کوئی اس سے بھی پوچھ لے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ یوں درخت کٹنے سے تو بچ گیا مگر اب سردی سے بچاؤ کے لیے انھوں نے اس کی نچلی شاخیں کاٹ لی تھیں۔ اماں کو اس وقت ادراک ہوا جب وہ سوکھی ٹہنیاں اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ وہ بیتابانہ باہر گئیں اور تنے کے گرد ایک کمبل لپیٹ دیا۔

'پاگل سٹھیا گئی ہیں بے چاری۔' گھر کے اندر سے ہوتی تیز سرگوشی سنائی دی۔

درخت نے ایک جھرجھری لی۔ اب بنا پتوں کے اس میں کوئی سرسراہٹ بھی پیدا نہیں ہوتی۔ پتے گرنے کے بعد سے تو پرندوں نے بھی اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ صبح کے سورج نے شب کی مسافت ختم کی اور اپنے مقررہ استھان کی جانب بلند ہونے لگا۔ ستارے تیزی سے چھپنے لگے لیکن اس تیزی میں بھی ذرا دیر کو ٹھٹھک گئے۔ ایک چھوٹے سے مکان کے باہر ایک بڑا سا درخت اپنی جڑ سے اکھڑ کے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا بچا دھڑ جھکا ہوا تھا۔ صرف اوپری چند بنا پتوں کی شاخیں باقی تھیں۔

اب اس درخت کو ہٹوانے میں مزید خرچہ آنے کا، بڑے بیٹے کی بڑبڑاہٹ میں درخت گرنے کا کوئی تاسف نہیں تھا۔

فیصل نواز چوہدری (ناروے)

بابا خواجہ

میں ہر سال اپنے والدین سے ملنے پاکستان ضرور جاتا ہوں۔ بعض دفعہ سال میں دو چکر بھی لگ جاتے ہیں۔ اس مرتبہ جب ماں کا خط آیا تو اس نے چند دعاؤں کے بعد لکھا۔ پتر، میرا دل اداس رہتا ہے۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں چھوٹے بھائی کو ملے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ تمہیں اس کی بھی فکر ہونا چاہیے۔ پاکستان آنے سے پہلے اسے ضرور مل کر آنا۔

ماں نے ایک کڑی شرط میرے سامنے رکھ دی تھی۔

جب میں نے چھوٹے بھائی سے بیلجیم میں بات کی تو اسے والدہ کی اس شدید خواہش کا بتایا۔ وہ تو قطعاً ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کہنے لگا۔ یہاں آ کر کیا کرو گے۔ خوامخواہ مجھے ذلیل کرو گے اور خود کو بھی۔ یہ جگہ تمہارے لیے نہیں۔ میں خود پناہ گزینوں کے کیمپ میں رہتا ہوں تمہیں کہاں رکھوں گا۔

میں نے کہا۔ میں کسی ہوٹل میں رہوں گا۔ دو چار دن کی بات ہے۔ ماں کو بھی راضی رکھنا ہے۔

وہ کہنے لگا کہ کچھ بھی ہو یہاں مت آنا۔ تم ناروے میں خوش ہو یہاں کے حالات اچھے نہیں۔ ہم تو جنگی قیدی کی طرح دوزخ میں زندگی گزار رہے ہیں۔

وہ کسی صورت نہیں چاہتا تھا لیکن جوں جوں وہ انکار کرتا میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ اسے چیک کرنا چاہیے کہ واقعی سچ بول رہا ہے یا اس نے کوئی چکر چلا رکھا ہے۔ میں اسے ڈالر بھیج بھیج کر تھک گیا ہوں۔ مجھے پہلے شک تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے ورنہ اتنے ڈالر۔۔۔؟

وہ چار سال پہلے گھر سے نکلا تھا۔ دو سال استنبول میں رہ کر کئی ہزار ڈالر خرچ کر کے ایجنٹوں کے ذریعے کبھی یونان، کبھی سپین اور کبھی پرتگال۔۔۔ آخر میں دو سال پہلے وہ کہیں بیلجیم میں سیاسی پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ پناہ گزینوں کے کیمپ کے قصے سن سن کر میں نے فیصلہ کر ہی لیا کہ ماں بھی خوش ہو جائے گی اور بھائی کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ کہیں وہ کسی گوری کے چکر میں۔۔۔۔؟ یا وہ ہمیں الو بنا رہا ہے۔ کسی طرح میں نے اسے بھی راضی کر لیا اور امریکن ایئرلائن کا ٹکٹ لے لیا۔ بھائی سے کہا کہ تم فکر نہ کرو وہاں میرا کلاس فیلو اور لنگوٹیا یار مختار رہتا ہے اس نے وہاں کی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے۔ میں اس کے گھر رہوں گا۔ اس کو ملے بھی بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ کتنا مزہ آئے گا اس سے مل کر۔

میں نے ضروری سامان باندھا اور ائر پورٹ جا پہنچا۔ ضروری کارروائی کے بعد جب امریکن ائیر لائن کا طیارہ ہوا میں بلند ہوا تو میں بیس سال پیچھے بچپن کی یادوں میں کھو گیا۔ جب ہمارے سیاستدان اور فوجی مل کر مشرقی پاکستان کے جہاز سے کو تختہ دار سے کر بنگلہ دیش بنانے کے آخری مرحلے میں تھے۔ ہماری حکومت کو جنگی قیدیوں کی ضرورت تھی۔ میں اور میرا جگری یار غفار میٹرک میں تھے۔ کئی دوسرے لڑکوں کے ساتھ وہ بھی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ زیادہ تر طالبعلموں کو سکول سے بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ اور ان کا جذبہ حب الوطنی یہ کہہ کر ختم کر دیا گیا کہ ابھی تم سب چھوٹے ہو، اگلے سال تک انتظار کرو۔ میری اپنی حسرت بھی دل میں ہی رہ گئی۔ تین چار مہینے کی ٹریننگ کے بعد اسے مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا۔ لاہور سے میں نے آخری بار اسے جنگی جہاز میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کی ماں اکثر مجھ سے خط لکھوایا کرتی تھی۔ پھر میں بیرون ملک چلا آیا اور وہ میرے بعد اندرا گاندھی کی قید کاٹ کر واپس پاکستان آ گیا۔ فوج نے اسے واپس آتے ہی پکی چھٹی پر گھر بھیج دیا۔ اور ایک سال کے اندر اندر وہ یہیں سے ہوتا ہوا بیلجیم پہنچ گیا۔ اب ہمیں آپس میں ملے ہوئے بیس سال ہو گئے تھے۔ غفار پچھلے اٹھارہ سال سے بیلجیم میں ہی تھا۔ اس عرصہ میں وہ ایک دفعہ بھی پاکستان نہیں گیا تھا۔

جہاز کی کھڑکی سے میں نے نیچے جھانکا تو مجھے ایسا محسوس ہو جیسے وہ نیچے بانہیں پھیلائے میرا انتظار کر رہا ہے۔ اور آتے ہی مجھے بھینچ مارے گا۔ اپنے بازوؤں میں لے کر پورے بیس سال بچھڑنے کا کفارہ ادا کرے گا۔

بہت ساری باتیں ہوں گی ہمارے بچپن کے ایام خوشیوں سے معمور تھے۔ ہم سارے محلے کے لڑکے مل کر گلیوں میں کھیلتے اور شرارتیں کرتے چاندنی راتوں میں دیر تک کبڈی کھیلتے اور آدھی رات کو تھک ہار کر دھول میں اٹے ہوئے ہم دونوں حویلی، واڑے میں جا کر سوتے، صبح اٹھ کر گاؤں کے چھپڑ میں ڈھوروں ڈنگروں کے ساتھ اشنان کرتے۔

ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ چند منٹ بعد ہم اترنے والے ہیں۔ ایئرپورٹ سے نکلنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میری بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں بہت جلد اس کی بانہوں میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ہم بیس سال بعد مل کر خوشی سے پاگل نہ ہو جائیں گے۔ میں آدھ گھنٹہ کے بعد ایئرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ میرا بھائی اکیلا ہی میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ میرا لنگوٹیا یار کدھر ہے۔ تم نے اسے بتایا ہی نہیں ہوگا۔ میں نے اس کا جواب سنے بغیر ہی اس پر الزام تھوپ دیا۔

وہ کہنے لگا کہ تمہیں علم ہے کہ انگریز اپنے دور میں کمی کمین لوگوں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا کرتے تھے۔ جو پاکستان میں بھی کمین تھے وہ یورپ میں بھی آ کر بھی کمین ہی رہے۔

اپنے چھوٹے بھائی کا فلسفہ سن کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ میں نے بھائی سے کہا کہ کیا بکواس کر رہے ہو؟

یورپ میں آ کر بھی تمہاری چوہدراہٹ ذہنیت نہیں بدلی۔ اسی لیے تو آج ہم ان ملکوں میں ذلیل ہو رہے ہیں۔

اپنے بھائی کی باتیں سن کر مجھے فوراً اپنے والد کا دوست بابا خواجہ یاد آ گیا۔ وہ صبح سویرے اپنی بکریاں جنگل میں لے جاتا۔ جب شام ہونے لگتی تو پرندے قطار اندر قطار نیلے آسمان پر پرواز کرتے اپنے گھونسلوں کو واپس لوٹتے۔ شام کے ڈھلتے سائے کے ساتھ جب عورتیں اپنے گھروں سے نکل کر تندور روشن کرتیں۔ تو بابا خواجہ گاؤں سے باہر آسمان کی طرف بلند ہوتی دھوئیں کی چھوٹی چھوٹی لکیریں دیکھ کر اپنی بکریوں کا رخ گاؤں کی طرف موڑ لیتا۔

مجھے 16 دسمبر کی وہ شام کبھی نہیں بھولے گی۔ جب شام کو بابا خواجہ اپنی بکریاں چرا کر گھر آیا تو ایک بکری برآمدے میں چلی گئی۔ جہاں اس کی بڑی بیٹی دہیراں روٹیاں پکا رہی تھی۔ اور میں غفار کو مشرقی پاکستان میں اس کی ماں کی طرف سے خط لکھ رہا تھا۔ بکری کو بابے خواجہ نے ایسی کلہاڑی ماری کہ وہ میں میں کرتی لنگڑاتی ہوئی گر پڑی۔ ماسی دہیراں فوراً بولی کہ او بے کھوج مارے دیا مار دتی۔ آج تینوں کی ہو گیا اے۔

بابا خواجہ بغیر کسی سے بات کیے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ میں بھی تھوڑی دیر کے بعد اس کے پیچھے چھت پر چلا گیا۔ بابا خواجہ سخت غصے کی حالت میں کلہاڑی کے پھل کو کوٹھے پر مار رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا کہ نواز! ایسا نہیں ہو سکتا۔ آج میرے تینوں بیٹے میرے سامنے ہوتے تو میں خود انہیں کلہاڑی سے قتل کر دیتا۔ میرے بیٹے انڈین آرمی کے سامنے ہتھیار نہیں پھینک سکتے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

میری نظروں کے سامنے بابے خواجہ کی کلہاڑی چمک رہی تھی۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے جگری یار کو ضرور کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔ اچھا کوئی بات نہیں شام کو مل لیں گے۔

میرا بھائی مجھے ہوٹل میں لے گیا تو میں نے اسے کہا کہ غفار کے گھر چلے جاتے اس کو تو یہاں رہتے اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔

وہ کہنے لگا کہ آپ نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں شام کو غفار کے گھر چلیں گے۔

شام کو ہم غفار کے گھر پہنچ گئے۔ گھنٹی بجانے پر مسز ماریا غفار نے دروازہ کھولا۔ ہم نے اپنا مختصر تعارف کرایا تو کہنے لگی کہ آپ نیچے بار میں ڈرنک کریں تھوڑی دیر بعد غفار آ جائے گا وہ گھر میں نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو کلب میں ہی مل لے گا۔۔۔۔

میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ ہم اس کے لیے اجنبی تھے۔ یورپین لوگ اتنی جلدی پرائے لوگوں کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتے۔

میرا بھائی کہنے لگا کہ آپ کی یورپین خاتون میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ مجھے وہ پاتی ہے۔ میں پہلے بھی

ان کے گھر آیا ہوا ہوں۔ اور تمھارے آنے کی اطلاع ان کو ہے۔ تمھارا انگلینڈ کا گھر سے اس لیے غائب ہے کہ کہیں تم اس کے گھر دو چار دن کے لیے ڈیرا نہ ڈال لو۔

میں نے کہا کہ شاید ایسا ہی ہو لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ وہ مجھے ملنے کو بیقرار ہو گا۔ میں اسے وطن کی یاد دلاؤں گا۔ میرا پیار ایسا نہیں ہو سکتا۔ ویسے ہمیں بار میں بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔

ہم ایک گھنٹہ بار میں بیٹھ کر کوکا کولا ڈرنک کرتے رہے۔ آخر میرا انگریزی یار آ ہی گیا۔ میرے دل نے چاہا کہ دوڑ کر اسے جپھا مار لوں۔ وہ مجھے اپنی باہوں میں۔۔۔ لیکن شاید بار میں بیٹھے لوگوں کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ میں نے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سخت ٹھنڈے تھے ہاتھ اس کے۔۔۔

میں تو اسے جپھی مارنا چاہتا تھا لیکن اس نے۔۔۔ میرے سارے ارمان چکنا چور کر دیے۔ میرا بھائی غصے سے میری طرف دیکھنے لگا۔

'غفار آپ کے لیے کوکا کولا لاؤں۔ میں نے پوچھا۔

غفار کہنے لگا نہیں۔۔۔ میرے لیے بیئر کا گلاس لے کر آؤ۔ اور یہ کوئی پینے کی چیز ہے نواز۔ تم یورپ میں رہتے ہوئے بھی لسی پی رہے ہو۔

میں کیا کہتا۔ میں تو اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اور اپنے بھائی کی نظروں میں بھی گر چکا تھا۔ جو ہمیشہ چوہدرانہ انداز سے بات کرتا تھا۔ میرا آئیڈیل تو بابا خواجہ تھا۔ غفار نے تو بابے خواجہ کی ساری شخصیت پر پانی پھیر دیا۔ وہ بکریاں چرا کر بھی دنیا کی خبر رکھتا تھا۔ اور غفار یورپ میں رہ کر بھی۔۔۔۔۔

ہم آدھ گھنٹہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ غفار کہنے لگا کہ میں نے کل بڑی جلدی ڈیوٹی شروع کرنی ہے۔ لہذا کل کا ڈنر چھ بجے آپ ہمارے گھر کرنا۔

وہ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ اور میں ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ اس نے پوچھا تک نہیں کہ میں کہاں ٹھہرا ہوں۔ میرے بھائی نے ہوٹل پہنچنے تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اور سخت غصے میں کہنے لگا کہ کل تم خود ہی ٹیکسی لے کر غفار کے پاس چلے جانا۔ مجھے سیاسی پناہ والے کیمپ سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ بہانے کر رہا ہے۔ وہ غفار کے ہاں دعوت پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ آخر میں نے اسے یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ انسان وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ بدلتا ہے۔

دوسرے دن ہم دونوں بھائی سارا دن شہر کی سیر کرتے رہے۔ اور شام چھ بجے غفار کے گھر جا کر گھنٹی بجائی۔ ہمیں دیکھتے ہی غفار میرے بھائی سے کہنے لگا کہ تمھیں تو مہاجر کیمپ سے مفت میں کھانا ملتا ہے۔ اس کی

بیوی نے میز پر چار پلیٹیں اور چار گلاس سجا رکھے تھے۔ دو میاں بیوی، ایک ان کی دس سالہ بچی اور چوتھا میں۔ مختار کی بیوی ایک کرسی اور ایک پلیٹ اور لے آئی۔ میرا بھائی اس وقت کچھ نہ بولا لیکن مجھے اس کی چوہدرانہ ذہنیت کا علم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

ہم ڈنر کے درمیان باتیں بھی کرتے رہے۔ مختار کی بیوی بار بار مجھ سے ناروے اور پاکستان کے متعلق پوچھتی رہی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں تو ہر سال والدین سے ملنے پاکستان جاتا ہوں تو مارے مختار کہنے لگی کہ میں مختار سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ چلو پاکستان چلتے ہیں۔ میں اس کے خاندان سے ملنا چاہتی ہوں۔ لیکن یہ مانتا ہی نہیں۔ پتہ نہیں اسے کیا مسئلہ ہے۔ یہ پاکستانیوں سے کیوں چھپتا پھر رہا ہے۔

میں نے مختار سے کہا: 'یار! اٹھارہ سال گزر گئے ہیں۔ جس گاؤں میں ہم پیدا ہوئے ہیں۔ اور جن گلیوں میں ہم کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ اب تو وہ گلیاں بھی تمہیں نہیں پہچانیں گی۔ تمہیں وطن کی یاد نہیں ستاتی؟ تمہارا آدھے سے زیادہ خاندان اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ اتنے سالوں میں دنیا کتنی تبدیل ہو چکی ہے۔ یار! اپنے ماں باپ کا۔۔۔

مختار کہنے لگا کہ یہ پہاڑ بھی ایک دن مجھے توڑنا پڑے گا۔

میں نے کہا کہ مختار یاد رکھو جو لوگ اپنی دھرتی ماں کو بھلا دیتے ہیں، انہیں کوئی دوسری جگہ قبول نہیں کرتی۔ شہریت تو ہم نے بھی لے رکھی ہے، پتہ نہیں کیا وجہ تھی وہ اپنے ملک کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اسے گاؤں کی گلیوں اور وہاں کے لوگوں سے تو کافی دلچسپی رہتی تھی۔ میں نے اسے بچپن کی باتیں یاد دلائیں۔

کہنے لگا کہ دفع کرو۔۔۔۔ فضول باتوں میں کیا رکھا ہے۔ لیکن میرے لیے تو میرا بچپن ہی میرا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس کی بوڑھی ماں کے خط جو میں مشرقی پاکستان میں مختار کو لکھتا تھا۔ آج بھی میرے سینے پر نقش ہیں۔ خط لکھواتے وقت اس کی ماں کی بوڑھی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ اور اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلتیں۔ کہتی کہ پتہ نہیں میرا بیٹا پردیس میں کس حال میں ہے۔ ٹھوڑی پر آنسو ٹپکتے ہوئے لکھواتی کہ بیٹا اپنے ملک کی رکھوالی کرنا۔ اپنی دھرتی ماں کی حفاظت۔۔۔۔ میں بزدل کی ماں کہلوانے کی بجائے ایک شہید کی ماں کہلوانے میں فخر محسوس کروں گی۔

ایک ماں تھی جسے وطن سے محبت اور ہزاروں میل دور، اس کا بیٹا کس کی جنگ لڑ رہا تھا۔ میرا آئیڈیل تو مختار کی ماں اور باپ ہے کہ وہ عید بڑی تھی جو سولہ دسمبر کو شام اس نے بکری کو ماری تھی۔ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھے۔ لیکن مختار۔۔۔؟

میں نے اس کی بیوی کو پھول اور ایک تحفہ دیا۔ اس کی بچی کو گڑیا دیتے ہوئے کہا کہ میں تو کل ہی جا

رہا ہوں۔ میں نے سیٹ ریزرو کروالی ہے۔ میں نے جھوٹ بول کر غفار کو الوداع کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ٹوٹے ہوئے دل سے آخری بار غفار سے ملا تو اس نے پھر وہی اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ اور کہنے لگا کہ پاکستان سے میری بیٹی کے لیے دو پاراچگی فراکیں ضرور بھیجنا۔ اس کی بیوی نے اپنی کلائی سے گھڑی اتار کر دی کہ یہ میری ساس کو دے دینا اگر مجھے پہلے علم ہوتا تو میں ان کے لیے تحفے لے آتی۔

میں نے غفار سے کہا کہ شلوار قمیض بچوں کا خالص پاکستانی۔ وہ کہنے لگا کہ وہ یہاں کون پہنے گا؟۔

ہم اسے الوداع کہہ کر بلڈنگ سے باہر نکل آئے تو میرا بھائی کہنے لگا کہ اتنی جلدی واپسی۔۔۔لگتا ہے تمہیں اپنی بیوی یاد آرہی ہے۔ چند دن اور ٹھہر کر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میں دیکھتا تھا۔۔۔کہ یہاں۔۔۔

میں نے غصے سے کہا کہ شٹ اپ۔

وہ کہنے لگا کہ انگریزی میں غصہ کرنے کا کیا فائدہ۔ انگریزوں کے اصول بھی تو۔۔۔اس طرح کی کمین سے مل کر آپ نے میری بھی عزت۔۔۔

میں نے بھائی سے کہا کہ اس کی قیدی زندگی۔ اس کی جنگ۔ کیا کبھی ہم نے مل کر مشرقی پاکستان میں لڑی جانے والی جنگ کے متعلق سوچا ہے؟

میں واقعی دوسرے دن پیرس سے ہوتا ہوا پاکستان آگیا۔ میرے گاؤں کی گلیاں۔ میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اور شاید مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ اس مرتبہ ایک ہفتہ لیٹ کیوں ہو گئے۔

میرے آنے سے میرے گھر میں رونق آگئی۔ اور میری کوٹھی بھی شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ آئندہ لیٹ ہوا۔۔۔ نہیں تو میں بھی تم سے روٹھ جاؤں گی۔

جب بابے خواجہ کو پتہ چلا کہ نواز کیمپ میں اس کے بیٹے کو مل کر آیا ہے۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ جھکی ہوئی بوڑھی کمر کے ساتھ چھڑی لیے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا آرہا تھا۔ میں تو اسے چمکتی کلہاڑی کے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا لیکن بابا خواجہ کتنا کمزور ہو چکا تھا۔

ڈیوڑھی پار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ نواز تم میرے بیٹے سے مل کر آئے ہو۔ وہ تمہارا لنگوٹیا یار ہے تمہیں ضرور جپھا مار کر ملا ہوگا۔ مجھے بھی جپھا مار کر ملو۔ میرے سینے سے اپنا سینہ لگاؤ۔ اس کے سینے کی خوشبو میرے سینے سے لگے۔ بابے خواجے نے اپنے بوڑھے بازو میری گردن میں حمائل کرتے ہوئے میری پیشانی پر بوسہ دے کر مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ نکلا۔۔۔

پھر بابا خواجہ۔۔۔اور اس کا بوڑھا جسم ایک طرف لڑھک گیا۔۔۔ بابا خواجہ اپنے بیٹے سے ملے بغیر ہی اس دنیا سے چل بسا۔

ڈاکٹر نگہت نسیم (آسٹریلیا)

آلو قیمہ

سکینہ کو کراچی کے سب سے بڑے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل ہوئے تین دن گزر چکے تھے جہاں مجھے نفسیات کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے کوئی دسواں برس تھا۔ سکینہ جب سے آئی تھی اس وقت سے چپ تھی بلکہ وہ کئی دنوں سے چپ تھی اور کئی ڈاکٹروں سے علاج کے بعد ہی تو ہسپتال لائی گئی تھی۔ سکینہ دبلی پتلی گوری رنگت تیکھے نقش کی پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں صرف حیرانی تھی یا ویرانی۔ اس کے چہرے کی زردی میں یاسیت نمایاں تھی۔ خوبصورت کٹاؤ والے ہونٹ پپڑی کی جمی کی وجہ سے بے جان لگ رہے تھے۔ اس کے پہنے ہوئے شلوار قمیص کی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ کئی راتوں سے صرف کروٹیں بدلتی رہی ہے۔ سفید رنگ کے دوپٹے میں سے جھانکتے کالے بال اس کے چہرے سے اپنائیت سے ایسے لپٹ رہے تھے جیسے تسلی دے رہے ہوں۔ اس کے پاس ہر بات کے جواب میں صرف ایک چپ تھی۔ کچھ کھانے کو دیتے تو وہ مزید پتھر کی ہو جاتی جیسے نہ اس نے دیکھا ہو اور نہ ہی اس نے کچھ سنا ہو۔

تیسرے دن دوائی مقدار بھی بڑھائی جا چکی تھی اور ڈرپ بھی لگ چکی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ چپ کے سمندر کو کیسے عبور کروں۔ اگر کل تک سکینہ نے کچھ نہ کھایا اور نہ بولا تو الیکٹرک شاک (ای سی ٹی) دینا پڑ جائے گا۔ کاش سکینہ اس سے پہلے ہی بول پڑے، کچھ کھانے تاکہ ڈرپ کی رکھوالی نہ کرنی پڑے جو اس کے وجود کے اندر کو تر رکھنے کے لیے آج ہی لگائی گئی تھی۔

سکینہ کے گھر والوں میں اس کی ماں اور بہن کے ساتھ سسرال سے سکینہ کا شوہر اور اس کی ساس آفس کے باہر انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں آج بھی سکینہ سے ملاقات کے بعد اس کے گھر والوں کو کچھ نہ بتا پائی کہ اب آگے کیا ہوگا۔۔۔ وہ ہر بار کی طرح آج بھی وہی بات کہہ رہے تھے جو سکینہ کو ہسپتال ایڈمٹ کرواتے وقت بتائی تھی۔

سکینہ کی ماں روتے ہوئے لہجے میں بتا رہی تھی کہ سکینہ ٹھیک ٹھاک تھی۔۔ بڑی خوشی خوشی رہ رہی تھی اپنے گھر۔ جانے کیا ہوا ہے؟ پھر دوپٹے سے آنسو پونچھتی جاتیں اور کہتی جاتیں "ابھی عمر کیا ہے میری بچی کی۔۔۔ یہی کوئی چوبیس سال۔ یہ کوئی عمر ہے بیمار ہونے کی، دوائی کھانے کی، پھر ماتھا پیٹ لیتی اور کہتی۔۔ نظر کھا گئی میری بچی کو۔۔ کوئی پیر فقیر کرو جن بھوت کا سایہ ہی نہ ہو۔ جس پر سکینہ کی چھوٹی بہن تہمینہ اپنی ماں کو ٹوک

دیتی کہ آپ کریں ایسی جی کوئی جن بھوت نہیں ہے۔کسی پیر فقیر کی ضرورت نہیں پھر میری طرف متوجہ ہوتی اور کہتی
کہ سکینہ کو بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔اللہ نے اسے شادی کے دو برس بعد بیٹا دیا تھا۔مگر، وہ وہ ایک برس کا بھی
نہ ہونے پایا تھا کہ اللہ پاک نے اسے واپس لے لیا۔پھر اس کے بعد کوئی خوشخبری سکینہ کے دامن میں نہیں
آئی۔بہت محسوس کرتی ہے سکینہ اس بات کو۔شاید اسی لیے بیمار ہوگئی ہے۔

پھر خاموش سا سکینہ کا شوہر اعجاز آہستہ آہستہ بتاتا کہ جی ہماری طرف سے سکینہ پہ اولاد نہ ہونے کا
کوئی پریشر نہیں ہے۔سب اس کی دلجوئی کرتے ہیں۔خدا جانے کس کی بات کو دل پہ لے لیا ہے۔بھلا اس
سارے منظر میں سکینہ کی ساس کیوں نہ ہوتی وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھتیں اور نظروں ہی نظروں میں اسے
خاموش ہونے کا کہتیں اور خود سکینہ کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولتی جاتیں کہ ہائے، بہت علاج کروایا کہ اس کی
گود ہری ہو جائے۔کوئی پیر فقیر نہیں چھوڑا۔بس اللہ کی رحمت ہی ساتھ نہیں۔کتنی بار سمجھایا تھا کہ ملنے جلنے میں احتیاط
کیا کرو پر آج کل کی لڑکیاں جہاں منہ اٹھایا چل پڑتی ہیں۔آج کل تو نیا بھوت سوار تھا سکینہ پہ یتیم خانے جانے کا
اور ایک بچہ گود لینے کا۔پھر وہ خونخوار نظروں سے سکینہ کی ماں کی طرف ایسے دیکھتیں جیسے ایسا کرنے کو انھوں نے
ہی کہا ہو۔ان ہی آوازوں کے بیچ سکینہ چپ رہتی۔سر جھکائے زمین کی طرف ایسے دیکھتی رہتی جیسے اس کے ارد گرد
کوئی نہ رہتا ہو اور نہ بستا ہو۔کسی کے پاس اور کچھ نیا کہنے کو نہ رہتا۔ایک لمبی سی خاموشی چھا گئی جسے میں نے ہی توڑا
اور ایک نئی تجویز دوائی کے ساتھ سکینہ کے تمام گھر والوں کو واپس گھر جانے کو کہہ دیا اور خود پھر سکینہ میں الجھ گئی۔

سکینہ کو داخل ہوئے چوتھا روز تھا۔۔اور اس کی چپ کو کئی دن۔۔ایسا کب تک؟ آج میں نے
سوچ لیا تھا کہ مجھے اس یتیم خانے ضرور جانا ہے جہاں سکینہ چوری چوری جایا کرتی تھی۔۔۔اور اس بات کو اس
کی ساس نے باتوں باتوں میں بتایا بھی تھا۔یتیم خانے کی تفصیل بھی اعجاز سے مل گئی تھی جس کے بچوں کو اس
نے اپنی پیدائش پہ بلا کر خوشی منائی تھی۔فون پہ یتیم خانے کے منیجر سرمد سے سکینہ کے سلسلے میں ملاقات کا
وقت صبح کے دس بجے مقرر ہو چکا تھا۔میں نے کتابیں بند کیں اور یتیم خانہ جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔اعجاز
نے بہت کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے گا لیکن میں نے اسے منع کر دیا تھا۔میرے ذہن میں کئی سوال تھے جنھیں جاننا
بہت ضروری تھا پھر مجھے بہت کچھ سوچنا تھا۔مجھے سکینہ کو سمجھنا تھا۔مجھے تنہا وقت چاہیے تھا۔

میں اعجاز کے بتائے ہوئے پتے پہ یتیم خانہ پہنچ گئی تھی جو چھوٹی سی پیلے رنگ کی بلڈنگ تھی
جس کی دیواروں پہ جا بجا رنگ اتر چکا تھا۔عمارت کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے بغیر رنگ کے لوہے کے
دروازے تھے جو شاید آفس میں کام کرنے والوں کی گزرگاہ تھی۔عمارت کے بیچوں بیچ بڑا سا لوہے کا کالا گیٹ تھا
جس پہ بڑا سا کالے ہی رنگ کا تالا لگا ہوا تھا۔گیٹ سے باہر ایک باوردی چوکیدار کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا۔میں نے اپنا

تعارف کرواتے ہوئے سرمد صاحب سے دس بجے کی ملاقات کا طے ہونے کا بتایا۔ اس نے مجھے دائیں طرف لوہے کے بے رنگ چھوٹے سے گیٹ کی طرف اشارہ کیا اور اندر جانے کو کہا۔ میں چوکیدار کو شکریہ کہتے ہوئے دائیں طرف بڑھ گئی۔ سرمد صاحب جیسے میرے ہی منتظر تھے۔ درمیانی عمر کے خوش اخلاق سے سرمد صاحب بے حد احترام سے ملے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا یتیم خانہ بغیر کسی نام کے اس لیے ہے کہ ہر بچے کو اپنا گھر لگے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے یتیم خانے میں دو سو بچے ہیں جن کی عمریں پانچ سال سے لے کر اٹھارہ برس تک ہیں۔ انھیں قرآن پاک مدرسے میں پڑھایا جاتا ہے جو یتیم خانے کے اندر ہی ہے۔ یہیں پر ان کے لیے پرائمری اسکول اور ہائی اسکول کا بھی انتظام ہے۔ وہ بڑی دردمندی سے بتا رہے تھے۔ اسلام میں سب سے زیادہ یتیم کے حق کا ذکر ہے پر اسلامی ملکوں میں ہی یتیم سب سے زیادہ تکلیف سہتے ہیں۔ ان کے لیے فنڈ کم ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ کی سرپرستی نہیں ہوتی اور تو اور انھیں مدد کوئی اپناتا ہے اور مدد ہی اپنے بچوں کے ساتھ انھیں بیٹھتا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کے پاس زیادہ تر بچے ایسے تھے جو کشمیر اور کوئٹہ میں ظلم و ستم میں مرنے والے والوں کے تھے یا زلزلوں میں بچ جانے والے بچے۔ میں خاموشی سے سرمد صاحب کی باتیں سن رہی تھی۔۔ یتیم خانے کی دنیا ہماری دنیا سے کتنی الگ تھی۔ ہر رشتے سے عاری ایک دوسرے میں رشتے تلاش کرتے ہوئے کمسن بچے جن کا ہماری دنیا سے صرف صدقہ خیرات کا رشتہ تھا۔ پیاروں اور تحفوں کا رشتہ۔۔ مرگ و دری پر کا تحفہ کا رشتہ۔

آپ سکینہ صاحبہ کے بارے بتا رہی تھیں مجھے فون پر۔۔۔ میں نے چونک کر سرمد صاحب کو دیکھا جو اب چائے پانی کا مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ جسے شکریہ کہہ کر میں نے منع کر دیا اور سکینہ کی بابت ضروری معلومات انھیں پہنچائیں۔ انھوں نے بتایا کہ سکینہ انتہائی خوش اخلاق خاتون تھیں۔ کوئی دو برس سے یہاں آ رہی تھیں۔ وہ پہلے تو کبھی کبھار آتی تھیں پھر ہر پندرہ روز میں ایک بار یہاں ضرور آتیں۔ بچوں میں گھل مل جاتیں۔ ان کے ساتھ کھیلتی۔ انھیں کھانا کھلاتیں، کہانیاں سناتیں اور واپس چلی جاتیں۔ بچوں کو ان سے بے حد پیار تھا۔ کوئی ایک ماہ سے وہ نہیں آئی ہیں اور ہر بچہ انھیں پوچھ چکا ہے۔ سرمد صاحب نے یہ کہہ کر مجھے اور حیران کر دیا کہ وہ کبھی بھی کے ساتھ نہیں آتی تھیں لیکن آفس میں سب جانتے تھے کہ سکینہ، اعجاز صاحب کی بیوی ہیں اور احمر کی والدہ کیونکہ احمر کی پیدائش پر انھوں نے ہی خصوصی طور پر اس یتیم خانے کے بچوں کو اپنے گھر دعوت دی تھی۔ جو بچے آج بھی یاد کرتے ہیں۔ سرمد صاحب مجھے آگے بڑھنے کے لیے جگہ دیتے ہوئے آفس سے باہر آ گئے پر کسی فون پر انھیں پھر آفس کے اندر چلے گئے۔ آفس کا ایک دروازہ یتیم خانے کے اندر کی جانب بھی کھلتا تھا۔ وہاں سے تین سیڑھیاں اتر کر سیدھی ایک روش سی جا رہی تھی۔ میں اسی روش پر کھڑی دونوں جانب دیکھ رہی تھی جہاں گھاس کا فرشی قالین بچھا ہوا تھا جس پر بچوں کے لیے چھوٹے بڑے جھولے لگے ہوئے تھے۔ گھاس کے دائیں بائیں

چوڑی سبز بیلوں کے آخری جانب جہاں سے پکی اینٹوں والا برآمدہ شروع ہوتا تھا، وہاں دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے جن کی چھاؤں میں سنتے سے جوا ایک ایک واٹر کولر رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی ایک ایک بنچ تھی جہاں غالباً بچے بیٹھ کر پانی پیتے ہوں گے یا پڑھتے ہوں گے یا پھر باتیں کرتے ہوں گے اپنی قسمت کا سوچتے ہوں گے، اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہوں گے، اور اگر باہر کی دنیا کا سوچتے ہوں گے تو کیسے کیسے تڑپتے ہوں گے۔۔۔ پھر تڑپ کر اپنے کمروں کو لوٹ جاتے ہوں گے۔ وہ کمرے برآمدے کے سامنے ہی بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جن میں ہر کمرے میں چھوٹی بڑی کئی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں پر رنگ برنگے بستر بہت سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔

دل میں آیا کہ کمروں کے اندر جا کر دیکھوں کہ ان چار دیواریوں پر کونسے خوابوں کی فہرست کندہ تھی جو ہمارے خوابوں سے الگ تھی۔ میں نے ابھی چند قدم آگے ہی بڑھائے تھے کہ میں وہیں رک گئی۔ کسی نے میرا آنچل پیچھے سے کھینچا تھا۔ میں گھبرا کر پلٹی۔ ہلکے نیلے رنگ کی نیکر اور شرٹ پہنے سانولے سے رنگ کا صاف ستھرا سا بچہ بڑی معصومیت سے میرے آنچل کو تھامے مجھے تک رہا تھا۔ وہ بچہ شکل سے سات برس کا ہوگا لیکن اس کی آنکھوں میں سات قرنوں کے سوال پوشیدہ تھے۔ میں اس کے قد کے برابر آنے کے لیے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کی امید سے بھری چمکیلی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے دل کے اندر اتر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا کہ کیا نام ہے اتنے پیارے بیٹے کا۔۔۔

آلو قیمہ۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

کیا عمر ہے تمہاری۔

آلو قیمہ۔۔ اس نے پھر وہی جواب دیا تو بچے جانے کہاں چھپے ہوئے تھے، باہر نکل کر ہنس پڑے

تم یہاں کب سے ہو بیٹے۔۔؟

آلو قیمہ۔۔ بچے کے اسی جواب نے مجھے پریشان کر دیا پر بچوں کے بلند ہوتے قہقہے بھی اسے پریشان نہ کر سکے۔۔ وہ مسکرا رہا تھا۔۔ اس کے ہاتھ میں ابھی بھی میرا آنچل دبا ہوا تھا۔۔

بیٹا تم کونسی کلاس میں پڑھتے ہو۔۔

اس نے اپنا سر زور سے ہاں میں ہلایا اور کہا " آلو قیمہ"۔۔

معاف کیجیے گا آپ کو تکلیف ہوئی بہت ضروری فون آ گیا تھا۔ سرمد صاحب کی بات پر میں نے جلدی سے اس بچے کے ہاتھ سے اپنا آنچل چھڑایا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور حیرت سے پوچھا یہ بچہ کون تھا۔ سرمد صاحب مسکرا دیے۔ ڈاکٹر صاحبہ یہ بچہ یاسر بہت اسپیشل ہے۔ اس کی پیدائش کے سال بعد ہی اس کے ماں باپ

ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے اور اسے اس کے چچاؤں نے ہمارے ہاں داخل کروا دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن پھر پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ پر اس معصوم کو ماں چاہیے سرمد صاحب۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آٹھ سال سے کم عمر بچے لڑکیوں کے یتیم خانوں میں بھیجے جائیں تاکہ انھیں ماں کے لمس سے آشنائی رہے۔ میں بے اختیار کہہ گئی۔ جی جی آپ کی بات درست ہے پر ہم کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتے۔ سرمد صاحب کو شاید دفتری پالیسیاں یاد آ گئی تھیں جو جزوی طور پر پرائیویٹ اداروں کو کچھ زیادہ ہی درپیش رہتی ہیں۔ وہ بتا رہے تھے۔

آج سے کوئی تین سال قبل اعجاز اور سکینہ صاحبہ یہاں تشریف لائے تھے۔ ان کے ہاں بیٹا ہوا تھا اور وہ بچے کے عقیقے کے لیے یتیم خانے کے بچوں کو کھانے پر بلانا چاہتے تھے۔ اس دن سکینہ صاحبہ کی ملاقات یاسر سے ہوئی تھی۔ پانچ برس کا یاسر ان کے ساتھ جیسے جڑ سا گیا تھا۔ دراصل یتیم خانے اور مدرسوں کے بچوں کو لوگ یہاں خوشی کی تقاریب میں بلاتے ہیں۔ پر اصغر کے عقیقے پر پچیس بچے پہلی بار کسی خوشی کو منانے کسی کے گھر گئے تھے۔ انھیں یقین ہی نہ ہو رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ سرمد صاحب مسکرا رہے تھے جیسے اس واقعہ کا لطف لے رہے ہوں۔ انھوں نے بڑی محبت سے بتایا کہ جب بچوں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لیے وہاں جا کر پارے مانگے تو سکینہ صاحبہ نے ہنس کر سب کو باری باری گلے سے لگایا اور کہا کہ آج ہم سب لوگ مل کر اصغر کی زندگی اور خوشیوں کے لیے دعا کریں گے اور صرف خوشی منائیں گے۔ واپسی پر انھوں نے سب بچوں کو تحفے بھی دیے اور پچاس پچاس روپے بھی بانٹے۔

یاسر بچوں میں سب سے چھوٹا تھا، ساری رات خوشی سے سو یا نہیں۔ سکینہ صاحبہ نے اس دن بچوں کی فرمائش پر اپنے ہاتھ سے آلو قیمہ بنایا تھا۔ میری حیرانی قابلِ دید تھی۔ اب ہم ہائی کمروں کے سامنے سے گزر کر ملحقہ مدرسے کے سامنے کھڑے تھے جہاں بچے قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ سرمد صاحب آگے آگے تھے اور میں ایک معمول کی طرح ان کے ساتھ خاموش پر سب کچھ اپنے اندر جذب کرتے ہوئے۔ اب ہم یتیم خانے کے اسکول کے سامنے تھے جہاں دو کمروں میں پرائمری کی کلاس ہو رہی تھی اور تیسرے کمرے میں سیکنڈری کی کلاس۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ دو سو بچے سڑک پر ہوتے تو کیا ہوتا؟ سرمد صاحب کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یتیم خانوں اور مدرسوں میں جو بھی صدقے خیرات میں آتا ہے وہ زیادہ تر بریانی، دال ہی ہوتا ہے یا پھر قورمہ۔ ہمارے بچوں نے سن رکھا تھا کہ آلو قیمہ ایک ڈش ہے جو صرف ماں ہی اپنے بچوں کو بنا کر کھلاتی ہے۔ یاسر نے کبھی آلو قیمہ نہیں کھایا تھا۔ اس نے پہلی بار فرمائش کی تھی سکینہ صاحبہ سے اور انھوں نے اپنے وعدے کے مطابق آلو قیمہ بنایا بھی تھا۔ یاسر کو اتنا مزا آیا کہ اس دن سے ہر آنے جانے والے کو خوشی خوشی بتاتا ہے کہ اس نے بھی آلو قیمہ کھایا ہوا ہے۔ سکینہ صاحبہ جب بھی آتی یاسر کے لیے آلو قیمہ اپنے ہاتھ سے بنا کر لاتی

تھی اور اپنے ہاتھوں سے کھلایا کرتی تھیں۔ یاسر ان کی غیر موجودگی سہار نہیں سکا اور جب سے وہ ہر کسی کو اس کے سوال کے جواب میں آلو قیمہ کہہ دیتا ہے۔ آپ برا نہ منائیے گا۔

میں نے پلٹ کر اس معصوم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی اس کی خواہشیں، امید کا جھولا جھول رہی تھیں۔ میں یاسر کی معصومیت، محرومی اور ان گنت سوالوں کو اپنی آنکھوں میں لیے واپس مینٹل ہوسپٹل آگئی اور اب میں سکینہ کے روبرو تھی۔ وہی اداس مضمحل آنکھیں۔ دن بدن کمزور ہوتا جسم، سکوت کا نوحہ کہتی اس کی موجودگی۔

سکینہ آج میں اس یتیم خانے بھی گئی تھی جہاں تم جایا کرتی تھیں۔ اس نے میری بات پر بے چینی سے مجھے دیکھا پر پوچھا کچھ نہیں۔

میں نے بہت سارے بچوں سے ملاقات کی۔ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں بچے پر یاسر تمہارے بغیر بہت بہت اداس ہے۔ سکینہ کی آنکھوں میں اعتبار کا رنگ جھلکنے لگا۔ وہ کرسی پر بیٹھی بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ میں نے آہستگی سے کہا کہ تم بہت اچھی ہو تم درد کی زبان جانتی ہو تم دوسروں کی خواہشوں کو خوشبو کی طرح خود پر چھڑک لیتی ہو پھر ان خواہشوں کو اپنائیت و شفقت کا پیراہن دے دیتی ہو۔ ماں ہو جاتی ہو۔ سکینہ کی آنکھوں میں زندگی کے سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ میں نے اعتبار کے منظر میں ایک نیا رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے اسے زندگی کا تعارف نئے سرے سے کروانا چاہتی تھی۔ آلو قیمہ۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کیا عمر ہے تمہاری؟

آلو قیمہ۔ سکینہ نے سکون سے جواب دیا۔

تم یہاں کب سے ہو؟

آلو قیمہ۔۔ سکینہ کے جواب پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے مجھے لگا جیسے یاسر کے نرم ہتھیلیوں میں میرا آنچل دبا ہو۔۔

تمہیں یاد ہے بیمار ہونے سے پہلے تم نے یتیم خانے جانے کی ضد کی تھی اور تمہیں کمرے میں قید کر دیا گیا تھا۔

سکینہ نے اپنا سر زور سے ہاں میں ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ آلو قیمہ۔

اس کے جواب پر میرے کئی سوال سانس لینا بھول گئے۔ اعتبار کے منظر نے بے اعتبار رشتوں کے سارے بھید جو کھول دیئے تھے۔

☆☆☆☆

فہیم اختر (لندن، برطانیہ)

سرکل لائن

کام سے فارغ ہوتے ہی سیدھے لائبریری چلا جاتا۔ یہی میری معمول کی زندگی کا شغل تھا۔ میری لی بون لائبریری میں کتابوں کے علاوہ مختلف لوگوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ان دنوں میں لندن میں اکیلے رہا کرتا تھا اور ایجویر اسٹریٹ میں ہی میرا کام کاج تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی میری ملاقات مائیکل سے ہوئی۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص ہر وقت کوٹ بوٹ میں ملبوس، چہرے پہ مسکراہٹ مگر زندگی دکھوں سے بھری ہوئی۔ یہی تھا مائیکل کی زندگی کا سارا اثاثہ۔ ہم دونوں روزانہ ڈھلنے والی لمبی شام کے سیر سپاٹے سے لطف اندوز ہونے کے لیے لائبریری کے باہر بیٹھ جاتے اور مائیکل اپنی عمر اور تجربے سے وابستہ ڈھیر ساری باتیں سناتا۔

مائیکل کی پیدائش مانچسٹر میں ہوئی تھی جوانی میں دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے وہ بھی نہیں بچ سکا تھا۔ بہ حالت مجبوری اسے بھی اپنی نوکری چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہونا پڑ گیا تھا۔ مائیکل نے ہنستے ہوئے کہا۔ میری بیوی بہت خوبصورت تھی۔

میں نے مائیکل سے پوچھا کیا مطلب:

"تھی؟ اور اب وہ۔۔۔۔؟"

مائیکل کچھ دیر تک فکرمند سا ہوگیا کچھ خلا کو تکتے ہوئے کہنے لگا۔ اس کمبخت دوسری جنگ عظیم نے اسے بھی نہیں چھوڑا۔ تھوڑی دیر تک ایک عجب سی خاموشی طاری رہی پھر کچھ توقف کے بعد مائیکل نے اپنی کہانی کا آغاز کیا:

"جنگ کا اعلان ہوتے ہی برٹش گورنمنٹ نے مجھے برما (میاں مار) بھیج دیا۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب جینی نے روتے روتے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اور اس کا حسین چہرہ ۔۔۔ مائیکل کی یہ کہتے کہتے آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ مائیکل نے اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالا اور شراب کی بوتل نکال کر منہ سے لگالی۔"

"پیو گے؟"

"نہیں میں شراب نہیں پیتا"

"مائیکل نے برجستہ کہا تم ابھی بچے ہو۔"

اس کے بعد مائیکل نے پھر اپنی گزشتہ زندگی کی داستان کی ابتدائی۔ میرے باپ کا بہت بڑا اقدام تھا۔ بچپن سے لے کر شادی تک ہم نے کسی بات کی پرواہ کی نہ کسی بات کا غم کیا۔۔۔۔۔۔ باتوں باتوں میں رات کی سیاہی قدرے اور گہری ہوگئی۔ میں بھی تکان محسوس کرنے لگا تھا۔ مائیکل سے اجازت لی اور اپنے فلیٹ کی جانب چل دیا۔

اس طرح ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ میں روز شام لائبریری جاتا اور پھر مائیکل کے ساتھ باہر بیٹھ کر گپ شپ مارتا۔ کبھی مائیکل دوسری جنگ عظیم کا ساتھ بیان کرتا تو کبھی اپنی بیوی کی موت کا غم ناک ذکر کرتا تو کبھی زندگی کے تجربات بتاتا۔ اس طرح لندن کے موسم بہار کی لمبی شام مائیکل کی گپ شپ میں گزر جاتی۔

لندن کی ٹھنڈ سے جان نکلنے لگی تھی۔ موٹے موٹے کوٹ کے علاوہ ہاتھ اور پیر کو اچھی طرح کسی گرم کپڑے سے ڈھکنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اب مائیکل بھی کم نظر آتا۔ تین بجے کے بعد لندن اندھیرے میں ڈوبنا شروع ہو جاتا۔ میں بھی لائبریری سے نکلتا اور فلیٹ میں جا کر سب سے پہلے ہیٹنگ کا انتظام کرتا تاکہ باہر کی سردی سے کچھ راحت نصیب ہو۔

آج کئی ہفتے بعد مائیکل سے ملاقات ہوئی۔ وہی لمبے کوٹ میں ملبوس، چہرے پہ مسکراہٹ اور جھکے ہوئے کندھے۔ لگتا تھا کہ مائیکل دنیا کا سارے غموں کا لبادہ اوڑھے زندگی کے میدان میں سرگرم عمل ہے۔ میں نے لپک کر مائیکل کو مخاطب کیا۔

'مائیکل! تم اتنے دن کہاں غائب رہے؟'

مائیکل کو شاید یہ سوال پسند نہیں آیا۔

اس نے کہا: اس قدر ٹھنڈ ہے اس لیے اپنے آپ کو قدرت کے اس قہر سے چھپاتا پھر رہا ہوں۔

میں مائیکل کی اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے پوچھا: چھپاتا پھر رہا ہوں، کیا مطلب؟

مائیکل نے کہا: کیوں کہ میرے پاس رہنے کے لیے کوئی چھت نہیں ہے۔

میں مائیکل کی ذہنی حالت کو اب سمجھنے لگ گیا۔ اس کے بعد میں مائیکل کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور نہایت تجسس کے عالم میں یہ پوچھ بیٹھا۔

'مائیکل! تمہارا گھر؟۔۔۔ یعنی تم رہتے کہاں ہو؟'

اس نے سامنے ایک لمبی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا اور کہا: میں اسی عمارت کے باہر گلی ہوا میں فٹ پاتھ پر رات گزارا کرتا ہوں۔

'اور دن بھر؟' میں نے انتہائی تعجب سے دریافت کیا۔

'دن بھر میں سرکل لائن کی ٹرین میں!'

'میں سمجھا نہیں؟'

مائیکل نے تفصیل سے پھر اپنی کہانی سنائی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب میں برطانیہ واپس آیا تو بیٹی جرمنی کے بم دھماکے سے مر چکی تھی۔ میں اس غم کو برداشت نہ کر سکا اور حد سے زیادہ شراب پینے کی لت لگا بیٹھا۔ آخر کار رفتہ رفتہ میں اپنے گھر، کام کاج اور زندگی کی تمام راحتوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پچھلے بیس برسوں سے میں لندن کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہوں اور فٹ پاتھ پر رات بسر کر لیا کرتا ہوں۔ کم بخت یہ سردی اب اس عمر میں برداشت نہیں ہوتی چنانچہ ان دنوں میں سرکل لائن ٹرین میں اپنا سارا دن گزارا کرتا ہوں تاکہ ان کمزور ہڈیوں کو سردی سے کسی طور محفوظ رکھ سکوں۔ اس کے سوا میرے پاس اور کوئی سہارا ہے بھی کہاں؟

مائیکل نے مسکراتے ہوئے شب بخیر کہا اور بڑی بے یقینی سے اظہار کیا۔

شاید تم سے میری ملاقات کہیں کسی شام سرکل لائن میں ہو جائے۔

☆☆☆☆

نصیر اعظم (واشنگٹن ڈی سی، امریکہ)

چیخ

ابھی ٹی وی ڈرامے میں تھوڑی دیر تھی۔ دونوں بچیاں، رجو اور جھومرو رحمت بی بی کے کمرے میں براجمان تھے۔ یہی وہ وقت ہوتا کہ سب اپنے اپنے مسائل اور اختلافات بھول کر ایک خوبصورت دنیا میں پہنچ جاتے۔ نہ رجو کو ساس کے طعنے یاد رہتے، نہ رحمت بی بی کو بہو کی تیزی کا خیال رہتا، نہ جھومرو فیکٹری کی سیاست پر بات کرتا اور نہ بچوں کو اپنی ضدیں ہی یاد رہتیں۔

شہر کی ایک بہت بڑی کچی آبادی ترک کالونی میں دو کمروں، ایک کوٹھری اور محدود سے آنگن والے گھر میں یہ چھوٹا سا خاندان رہتا تھا۔ اس مختصر سے کمرے میں ایک طرف بان کی چارپائی تھی جس پر رحمت بی بی اپنی ایک پوتی کے ساتھ سوتی تھی۔ سامنے ایک تپائی پر ٹیلی ویژن تھا اور ایک طرف کونے میں ایک چھوٹا فریج تھا جسے رحمت بی بی الماری کی طرح استعمال کرتی تھی اور آنے جانے والوں کو فخر سے بتاتی تھی کہ اس کا چھوٹا بیٹا اصغر یہ سب دبئی سے لایا تھا۔

دادی! ڈرامہ کب شروع ہوگا؟ بڑی بیٹی بینا نے پوچھا۔

صبر کرو ابھی ہوگا، ذرا اشتہار تو ختم ہوں۔ رجو نے دلاسہ دیا۔

اچانک زور سے بجلی کڑکی اور دونوں بچیاں سہم کر ماں سے لپٹ گئیں۔

ارے میری بیٹیاں اور ڈرپوک؟

رجو زور سے ہنس پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے زور کی بارش شروع ہوگئی۔ رجو دوڑ کر مختصر سے آنگن سے بالٹی اٹھا لائی۔ اسے معلوم تھا کہ اب رحمت بی بی کا کمرہ ٹپکنے لگے گا۔ رجو ایک مضبوط بدن کی مستعد عورت تھی۔ اس کا سارا بچپن ڈیفنس سوسائٹی کے ایک سرونٹ کوارٹر میں گذرا تھا۔ اس کا باپ شہر کے ایک متمول گھرانے میں ڈرائیور تھا۔ رجو اپنے گھرانے کی واحد فرد تھی جسے مالک کے گھر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ ذہین تھی۔ محنتی تھی مگر بیگم صاحب کی کوشش کے باوجود نہ پڑھائی لکھائی میں اس کا دل لگا اور نہ ہی زبان کی درستی کی اسے فکر تھی۔ 16 سال کی عمر میں اس کی شادی کر دی گئی۔

چلو اب کل تو کام پر جانا نہیں ہوگا

جھومرو ماں کے پلنگ پر پسرتے ہوئے بولا۔

ہاں اس پانی میں کہاں جانا ہے۔ ماں نے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"لے اب ذرا سی بارش سے تو کام دھام بھی چھوڑ دیا؟ ارے اصغر جو لمبے پلاسٹک کے جوتے لایا تھا وہ پہن کر آرام سے چلے جانا اور باہر میں اینٹیں رکھ کر اسپر تختہ بھی رکھ دوں گی۔"

رجو نے تسلی دی۔

"تیرے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے"

وہ مسکرایا۔

کیوں نہ ہو؟ آخر کس کی لڑکی ہوں اور نام ہے رضیہ سلطانہ۔ رجو فخریہ لہجے میں بولی۔

"ہاں لگے ہے ٹھکے سے آئی ہے۔ سرونٹ میں تو تھی رضیہ سلطانہ"

ساس بھی کہاں چوکنے والی تھی اور ایک دم بگل تاب ہو گئی۔ چلو غارت ہو ادا رام۔۔۔ بھوندو کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس کا نام تو انور تھا لیکن کمزور ہونے کی وجہ سے بچپن میں محلے کے بچے بھوندو بھوندو کہہ کر اسے چھیڑتے تھے اور چھیڑا چھیڑی میں وہ انور سے جانے کب بھوندو بن کر رہ گیا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ سب اسے اسکے اپنے نام سے پکاریں مگر کبھی کسی کو روکنے کی ہمت نہ کر پایا۔ بس خواہش کر کے رہ جاتا۔ رجو اس کی یہ کمزوری جانتی تھی اور اس کو جب زیادہ پیار آتا یا کوئی کام کروانا ہوتا تو بڑے میٹھے لہجے میں اس طرح انور پکارتی کہ وہ پگھل کر رہ جاتا اور عجیب سا سرور بدن میں دوڑ جاتا اور وہ رجو کا جمہورا بن جاتا۔

رحمت بی بی کو خود پر بڑا ناز تھا کہ اس نے تین مردوں کو جنم دیا۔ اکبر، انور اور اصغر۔ اسے اگر کوئی دکھ تھا تو یہ کہ اس کا بھوندو اولاد نرینہ سے محروم تھا اور جب موقع ملتا وہ بہو کو لاولد ہونے کا طعنہ ضرور دیتی اور خاص طور سے جب کسی بات پر اس سے ناراض ہو۔ آج بھی یہی ہوا۔ گو بارش بند ہو چکی تھی اور موسم کھل چکا تھا مگر ماں مصر تھی کہ بیٹا کام پر نہ جائے لیکن رجو زبردستی بھیج رہی تھی۔

"اتنا تو کیچڑ ہوگا باہر دیکھ بیٹا۔۔۔"

ماں نے ایک کوشش اور کی "انور۔۔۔ کیچڑ ہونے سے کام تو نہیں بند ہوتے۔ یہ لے آج تیرے دن کے کھانے کے لیے پراٹھا اور آلو کی ترکاری بنائی ہے۔۔۔"

رجو نے کھانے کا ڈبہ اسے دیتے ہوئے کہا اور بھوندو اپنے نام اور بیوی کے خلوص بھرے لہجے میں سب کچھ بھول کر دھیمی مسکان لیے گھر سے نکل گیا۔

"اری نامراد اگر اسے کچھ ہو گیا؟؟" ساس تڑپی۔

کچھ نہیں ہوتا اسے اچھا سو رہ کر سوئے سے۔ میں دکان کھولنے جا رہی ہوں"۔

رجو کوٹھری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔"ہاں سب جانتی ہوں آج اتنی جلدی تجھے کیوں ہے دکان کھولنے کی جیادہ مردی آئیں گے۔" ساس نے ایک ٹھیک طعنہ دیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی یا اس کی بہو ہی تھی جس نے گھر میں ایک کوٹھری بازگلی میں کھڑکی کھلوائی تھی اور اسے کالونی دکان کا نام دے دیا تھا جس سے گھر کی معیشت پر اچھا اثر پڑا تھا۔ محلے کے لوگ جن میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی ہوتی، اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے اسی دکان کا رخ کرتے تھے اور رحمت بی بی یہ بھی جانتی تھی کہ اگر کبھی کوئی مرد سودا لینے آ جاتا تو اس سے کہتی بھائی جلدی بتا دیا لینا ہے آج جھمندو دیر سے کام پر جا رہا ہے یا کسی اور بہانے سے جتا دیتی کہ اس کا شوہر گھر پر ہی ہے۔

ارے رجو دن چڑھ چکا ہے کب سے کہہ رہی ہوں پانی گرم کر دے نہانے کو، رحمت بی بی کمرے سے نکل کر اسے آواز دیتی کوٹھری کی جانب چل پڑی۔

"جرا ان لوگوں سے تو نمٹ لوں، ابھی آتی ہوں۔"

اس نے ساس ہی کے لہجے میں جواب دیا۔۔۔"ہاں یہ لے موم بتی اور ماچس۔۔۔ کیا آج بھی بتی نہیں آئے گی؟" اس نے پٹھانی خالہ کی بہو کو سودا دیتے ہوئے پوچھا۔"ہاں وہ شیرو کا بابا بتاتا ہے آج کالونی میں تار ٹوٹا ہے۔۔۔

۔۔۔ پٹھانی کی بہو پھولے سانسوں سے بولی۔"

یہ کیا چار بچے بہت نہیں تھے۔۔۔ پانچ سال میں پانچواں بچہ۔۔۔ رجو کو اسکی حالت پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ بس کیا کرے ہم عورت لوگ۔۔۔۔ وہ خاموش ہو گئی۔ میرے پاس آنا تجھے بتاؤں گی بچہ روکنے کی ترکیب۔۔۔ رجو راز داری سے بولی۔ تم کوئی دوا کھاتی ہے؟ پٹھانی کی بہو نے پوچھا۔ نہیں اور بھی ترکیب ہے۔۔۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

رجو۔۔۔ رجو! ساس پھر چلائی۔۔۔ پتہ نہیں میرے جھمندو کو تجھ میں کیا نجر آ گیا تھا۔۔۔ کتنی لڑکیاں تھیں۔۔۔ وہ اب کوٹھری کے دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ خیر۔۔۔ خیر خالہ یہ تو ذرا مجھے سب خبر ہے یہ سادی جھمندو سے جیادہ تیری مرجی سے ہوئی تھی۔۔۔ میری اماں تو نہیں چاہتی تھی، وہ تو کسمیر میں اپنے بھتیجے سے میری سادی کرانا چاہتی تھیں، وہ آخری کا گیت بناتے ہوئے بولی اور دکان کی کھڑکی بند کر دی۔ میری مرجی سے؟ کھداد کرے جو میں تیری جیسی کو لاتی اور پھر ہم ترکستان کے لوگ اور تیرا کھاندان۔۔۔ رجو زور سے ہنس پڑی اور ساس کے سامنے جھک کر راز داری سے بولی خالہ سنا ہے تیرا ابا اور بابا کا جوروں کا مالک چلتا تھا اور مجھے تو یہ بھی پتہ ہے کہ تو ابا کے ساتھ بھاگنے کو تیار تھی مگر عین وقت پر تیرے ابا نے سب کام کھراب کر دیا اور یہ تو ترک تو کی

رث محلے کی عورتوں تک ہی رکھ میرے سامنے نہ بول ہم اور تم ایک ہی برادری سے ہیں۔ پیچھے جات ہندو تھے سڑ کر کہ تیرا ابا اور میرا دادا مسلمان ہو گئے تو آج ت کی روٹی مل رہی ہے ورنہ تو ابھی ہندوستان میں گؤ کی باتیاں سب ڈھور ہے ہوتے۔" کیسی بے سرم ہے کتنی تیج جبان ہے تیری۔۔۔۔" ساس کچھ کمزور پڑ گئی تھی۔۔ مجھے تو لگے کر ابا کے دماگ پہ تو ہی سوار تھی جبھی تو میری جبان بھی تیری ہی طرح ہے۔۔۔ وہ بے حیائی سے ہنستی ہوئی پانی میں بھرے بارش کے پانی کو چولہے پہ چڑھاتی ہوئی بولی۔" تجھے یہ الٹی سیدھی کون بتاتا ہے؟ یہ سب جھوٹ ہے۔" ساس بھنا گئی تھی" پتہ نہیں ابا ہی بتا رہا تھا۔۔۔" وہ چھوٹی بیٹی ہما کے رونے کی آواز پہ لپکتی ہوئی بولی۔" تو یہ ہے کیسی حرافہ ہے اپنا کسور چھپانے کے لیے سب پہ الجام لگا رہی ہے۔ ارے کھاندان کیسے چلے گا۔۔۔ ایک لڑکا تو جن نہیں پائی" ساس حلق کی پوری قوت سے چلائی۔

"تو اس میں میرا کیا کسور ہے؟" وہ بچی کو کمر پہ لادے کمرے سے نکلتی ہوئی بولی۔" تو اور کس کا؟ بچہ تو عورت ہی پیدا کرتی ہے۔ میں نے تین لڑکوں کو جنم دیا۔ اکبر کے بیٹوں کے علاوہ ماشااللہ دو بیٹے ہیں اور ایک میرا بھوندو۔۔۔"

"تو کھالہ اکبر بھائی سے میری سادی کرا دیتی تجھے پوتے مل جاتے۔"

وہ تڑخی۔ بدجبان سرم نہیں آتی بیٹھو کے لیے ایسا بولتی ہے؟ ساس نے ڈانٹا۔

"سچ بولنے میں کیا سرم اور ہاں تو کونسا اگلا کہتی ہوں۔ تیرے بھوندو میں مرد کا بیج ہی نہیں۔۔" رجو کے لہجے میں ایسا طنز تھا کہ ساس تڑپ گئی اور بلبلا کر بولی

"ارے میرے بچے پہ الجام لگا رہی ہے نامراد۔۔۔"

الجام نہیں" اصل بات" اور کھالہ نامراد تو تم ہو گئیں۔ عورت ہو کر عورت کو کوس رہی ہو۔ یہ لڑکیاں تیری ہی تو ہیں۔ وہ صحن کے کونے میں لگے نل سے بچی کا منہ دھلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں آکھر میرے بھوندو کی ہی اولاد ہیں۔۔۔۔"

وہ کچھ نرم پڑ گئی تھی۔۔

"میں تو بس یہ چاہوں کہ ایک لڑکا ہو جائے تو تیرے اور بھوندو کے بڑھاپے کا سہارا ہو جائے۔۔۔ آکھر لڑکیاں تو اپنے گھر کی ہو جاتیں ہیں لڑکیاں تو رحمت ہوتی ہیں کبھی کہتے ہیں۔

رجو ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔ "ہاں یہ بھی بارس کی طرح ہوویں پکے مکان والوں کے لیے تو رحمت، ہمارے جیسے کچے گھر والوں کے لیے ہو تو مصیبت" وہ چولہے پہ چڑھے پانی کی حرارت ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے بولی۔" کھالہ اب لڑکا لڑکی کی بات نہ کر۔ آجکل لڑکیاں جیادہ آگے ہیں۔ دیکھو ٹی وی پہ کتنی پیاری پیاری

لڑکیاں آتی ہیں۔ اور اس دن یاد نہیں ا کورنٹی کی لڑکیاں ہمارے محلے میں آئی تھیں ہم سے بات چیت کرنے کوئی بھی تو لڑکا ان میں نہیں تھا" اس نے یاد دلایا۔۔۔۔ "تو آ فکر کریں بھیا؟"

دماری دریا وسال باپ نے سوچا کہ شاید اسی طرح۔۔۔ ہائے بے چاریاں" رحمت بی بی کو ان پر بہت ترس آرہا تھا۔۔۔۔

"اور کھال بے خیر بھی تو عورت تھی۔ ملک کی وزیر اعظم بنی۔۔۔۔"

اس نے اپنے چلتے ایسا پانسہ پھینکا تھا جو ساس کو خاموش کرانے کو کافی تھا۔ مگر رحمت بی بی کا ترکش بھی خالی نہیں رہتا تھا۔

"ہاں بھی تو ماردی گئی۔ مرد ہوتا تو مجال تھی کسی کی؟۔۔۔"

اور رجو خاموش ہو گئی۔ مرد کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اچھا جرا یہ پانی نہانے کو رکھ دے بڑی دیر میں گرم ہوا۔ رحمت پوتی کو گود میں لیتی ہوئی بولی۔ "یہ بیٹا کہاں ہے؟" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑی پوتی کے بارے میں پوچھا۔ "اسے تو بھیجا تھا باجی کے پاس کران پڑھنے بھیجا ہے۔ اسکول کی چھٹیوں میں کھالی گھر بیٹھ کر کیا کریگی وہاں کران (قرآن) پڑھنے کے ساتھ سلائی کڑھائی بھی سیکھ لے گی۔" اس نے بتایا۔ "اور کتنا پیسہ لیگی بجا تھ؟" "دس روپے مہینہ۔" رجو معدوم سے غسلخانے میں پانی رکھتے ہوئی بولی۔

ساس کچھ بولی تو نہیں مگر اسے غصہ تھا کہ ایک تو لڑکی کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا دوسرے ایک اور خرچہ۔ اس کا خیال تھا کہ اسکولوں میں بھیجنے سے لڑکیاں بدزبان اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی کہ پوتی کو اسکول نہ بھیجیں لیکن رجو آڑے آ گئی تھی۔

"پتہ نہیں اس نے میرے بھوندو کو کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ اس کے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں۔"

وہ نہاتے میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

موسم میں خنکی اتر آئی تھی۔ اس روز بھوندو وقت سے تھوڑا پہلے گھر پہنچا تو گھر کی فضا بدلی بدلی سی لگی۔ رجو چند عورتوں میں گھری بیٹھی تھی اور اس کی ماں سب کی خاطر داری میں لگی تھی۔ "ارے بھوندو ادھر آ۔" جر اس ساس نے پکارا "کیر سے تو پھر باپ بننے والا ہے۔۔۔ اور اس بار تو کھدا ضرور بیٹے کا پوتا ہوگا پوتا۔" اور ماں کے منہ سے نکلے الفاظ جیسے گنگناتے رقص کرتے بھوندو کی روح میں ہلکورے لینے لگے۔ رحمت بی بی کو ایک طرف پوتے کی امید اور دوسری طرف اس بات کا اطمینان کہ یہ خبر کالونی کی ان عورتوں کے لیے تازیانہ تھی جو اکثر اسے اپنی بہوؤں کی کثیر الاولادی اور اولاد نرینہ کا فخر سے تذکرہ کرتیں اور اسے مشورے بھی دیتیں کہ کسی پیر فقیر کے پاس رجو کو لے جائیں۔

لڑکیاں آتی ہیں۔ اور اس دن یاد نہیں انور بھٹی کی لڑکیاں ہمارے محلے میں آئی تھیں ہم سے بات چیت کرنے کو کوئی بھی تو لڑکا لان میں نہیں تھا" اس نے یاد دلایا۔۔۔۔ "تو آخر کریں کیا؟"

دساوی دیا وہ ماں باپ نے سوچا کہ شاید اسی طرح۔۔۔ ہائے بے چاریاں" رحمت بی بی کو ان پر بہت ترس آرہا تھا۔۔۔۔۔

"اور کھالہ بے نظیر بھی تو عورت تھی۔ ملک کی وزیر اعظم جی۔۔۔۔

اس نے اپنے چلتے ایسا پانسہ پھینکا تھا جو ساس کو خاموش کرانے کو کافی تھا۔ مگر رحمت بی بی کا ترکش کبھی خالی نہیں رہتا تھا۔

"ہاں! بھی تو ماردی گئی۔ مرد ہوتا تو مجال تھی کسی کی؟۔۔۔"

اور بہو خاموش ہوگئی۔ مرد کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اچھا جا یہ پانی نہانے کو رکھ دے بڑی دیر میں گرم ہوا۔ رحمت پوتی کو گود میں لیتی ہوئی بولی۔ یہ چنا کہاں ہے؟" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑی پوتی کے بارے میں پوچھا۔ اسے تو پتا تھا بانی کے پاس کران پڑھنے بھیجا ہے۔ اسکول کی چھٹیوں میں خالی گھر بیٹھ کر کیا کریگی وہاں کران (قرآن) پڑھنے کے ساتھ سلائی کڑھائی بھی سیکھ لے گی۔ اس نے بتایا۔ اور کتنا پیسہ لیگی پھاتم؟" دس روپے مہینہ۔ بہو معدوم سے شکانے میں پانی رکھتے ہوئی بولی۔

ساس کچھ بولی تو نہیں مگر اسے غصہ تھا کہ ایک تو لڑکی کو اسکول میں داخل کرادیا گیا دوسرے ایک اور خرچہ۔ اس کا خیال تھا کہ اسکولوں میں بھیجنے سے لڑکیاں بدزبان اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی کہ پوتی کو اسکول نا بھیجے لیکن بہو آڑے آگئی تھی۔

"پتہ نہیں اس نے میرے بھوندو کو کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ اس کے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں۔"

وہ نہاتے میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

موسم میں خنکی اتر آئی تھی۔ اس روز بھوندو وقت سے تھوڑا پہلے گھر پہنچا تو گھر کی فضا بدلی بدلی سی لگی۔ بہو چند عورتوں میں گھری بیٹھی تھی اور اس کی ماں سب کی خاطر داری میں لگی تھی۔ ارے بھوندو ادھر آ۔ جراسن۔ ماں نے پکارا گھیر سے تو پھر باپ بننے والا ہے۔۔۔ اور اس بار تو کھدا ضرور بیٹے کا پوتا ہوگا پوتا۔" اور ماں کے منہ سے نکلے الفاظ جیسے گنگناتے، رقص کرتے بھوندو کی روح میں ہلکورے لینے لگے۔ رحمت بی بی کو ایک طرف پوتے کی امید اور دوسری طرف اس بات کا اطمینان کہ یہ خبر کالونی کی ان عورتوں کے لیے تازیانہ تھی جو اکثر اسے اپنی بہوؤں کی کثیر الاولادی اور اولاد نرینہ کا فخر سے تذکرہ کرتیں اور اسے مشورے بھی دیتیں کہ کسی پیر فقیر کے پاس بہو کو لے جائیں۔

"دیکھ رحمت، اس بار جو کو اسپتال نہ بھیج اس کا بچہ میں جنواؤں گی، دیکھنا لڑکا ہو گا، پٹھانی کی بہو کے
پہلے دو بچے میں نے جنوائے دونوں لڑکے ہوئے تیسری اور چوتھی بار اسپتال میں بچے ہوئے دونوں لڑکیاں"
جگن دائی نے وثوق سے کہا اور جون کر زور سے ہنس دی۔
"اچھا تو دائی کمالہ تیرے ہاتھ میں جادو ہے کہ ہاتھ لگا دیا تو لڑکی لڑکا بن جاتی ہے؟ چل میرے
پیٹ پہ ہاتھ پھیر دے اگر لڑکی ہوئی تو لڑکا بن جائے گی اور اگر لڑکا ہوا تو؟؟؟؟؟"
جوان ماتھی اس کی منطق پہ ہنس پڑیں دائی کے ماتھے پہ بل آ گئے تو تو باؤلی ہے اچھا اب میں
چلوں رحمت کھدا کھیر سے تجھے پوتے کا منہ دیکھنا نصیب کرے وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
'کیوں رجو تو نے بتایا نہیں، رات میں جب وہ سونے لیٹا تو بیوی سے شکوہ کیا۔
"لے مجھے کیا معلوم آج ہی تو سویرے کی طبیعت خراب ہوئی تو تیری اماں نے دائی کمالہ کو بلا لیا
تھا، اسی نے بتایا ہوں، اچھا ایک بات کہوں؟ محمود بولا۔ کہہ۔۔۔۔"
اس بار دائی کمالہ سے ہی کروا لے اپنے میکے نہ جا۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ ٹھیک ہے جیسا تو کہے
، وہ بولی۔ کتنا اچھا ہو کہ اس بار لڑکا ہو جائے، محمود کے دل کی بات کھل کر زبان پہ آ گئی تھی۔ ہاں جی تو میرا بھی
چاہتا ہے مگر میں نے ٹی وی پہ سنا تھا کہ عورت کے لڑکا ہو یا لڑکی سب مرد کی وجہ سے ہوتا ہے۔۔۔" وہ کچھ سوچتے
ہوئے بولی۔ "اچھا۔۔ چھار مارے حیرت کے محمود اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاں اور یہ بات تو ہماری بیگم صاحب نے بھی
بتائی تھی۔ جہاں ابا کام کرتا ہے تو تو جانتا ہے وہ ڈاکٹرنی ہے۔" رجو بولی۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا" اس کی
مردانگی تلملا اٹھی تھی۔ ہاں بیگم صاحب تو کہتی ہیں کہ عورت تو زمین کی طرح ہوتی ہے جیسا بیج بوئے گا ویسا ہی پودا
ہو گا۔ اس نے انجانے میں ایک اور گھونسا جڑ دیا تھا۔ میرا صاحب تو بتاتا ہے کہ زمین ٹھیک ہو تو پودا بھی اچھا ہوتا
ہے، وہ بولا۔ رجو اس کی یہ بات سن کر تھوڑا حیران ضرور ہوئی مگر مسکرا کر بولی" اب بھنڈی کے بیج سے ٹماٹر تو
نہیں ہوتے۔"

اماں شاید ٹھیک ہی کہتی ہے کہ رجو بڑے لوگوں میں رہنے سے ایسی ہو گئی ہے بالکل عجیب باتیں
کرتی ہے۔۔۔ وہ یہ سوچتا ہوا دوبارہ بستر پہ دراز ہو گیا۔۔۔ مگر ہے بہت اچھی۔۔۔ وہ مسکرا اٹھا۔ کیا سوچ کر
مسکرا رہے ہو؟؟ رجو نے پوچھا۔ کچھ نہیں بس تیرے ہی بارے میں سوچ رہا تھا کہ تو کتنی اچھی ہے۔۔۔ رجو!
اس بار تو مجھے بیٹا دے دے۔ اس کے لہجے میں لجاجت تھی۔ اور رجو نے اس کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہی
ہو تو رہا محمود کا محمود ہی!

رجو دو تین دنوں کے لیے میکے آئی ہوئی تھی اور اس وقت بنگلے میں بیگم صاحب کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ

چاہ رہی تھیں کہ رجو زچگی کے لیے ادھر ہی آ جائے لیکن اس نے بتایا کہ اس کا شوہر اور ساس اس بار دائی سے کیس کرانا چاہ رہے تھے اور جب بیگم صاحب نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اسکی ساس اور شوہر سمجھتے ہیں کہ دائی کے ہاتھوں لڑکا ہو سکتا ہے اور بیگم صاحب زور سے ہنس پڑیں تو رضیہ سلطانہ تم بھی یہی سمجھتی ہو؟؟؟ انھوں نے سوال کیا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اس بار بھی لڑکی ہی ہو گی۔"

اس نے ان کی بات پر ہنسی میں سر ہلاتے ہوئے یقین سے کہا۔ وہ کیسے؟ اس کی ماں جو بیگم صاحب کے پیر دبا رہی تھی بول اٹھی۔ ایسے اماں کہ لڑکا ہوتا تو پیٹ میں وہ اودھم مچاتا کہ پٹھانی کمالی کی ہوئی طرح بستر پہ پڑ جاتی اور بولی۔ خیر میرا مشورہ اب بھی یہی ہے کہ تم دائی کے چکر میں مت پڑو۔ تاریخ سے دو تین دن پہلے ادھر آ جانا۔ بیگم صاحب اٹھتے ہوئے بولیں۔ رجو خاموش رہی۔

بیٹے کی امید میں بھوندو اور اسکی ماں کی منائیں۔ رجو پر بہت بڑھ گئی تھیں۔ دونوں اس کی ہر ہر چیز کا خیال رکھتے۔ بھوندو نے تو اسے موبائل فون بھی لا کر دے دیا تھا۔ اگر کبھی بازار سے کچھ کھانے کو جی چاہے تو بس بٹن دبا دے اور اس کو بتا دے۔ بھوندو کو ہر سال کی طرح اس بار بھی گاؤں جانا تھا فیکٹری کے مالک کے آم کے باغ سے مال لدوا کر شہر لانا تھا۔ رجو ٹھیک سے کھانا پینا اور کوئی بات ہو تو مجھے سیل کر دینا۔ اس نے کہا۔ تو چنگی ہے کر مجھے سیل استعمال کرنا آتا ہے اور کھالو تو ہے ہی اور اماں بھی دو ایک دن میں ادھر آ جائے گی اس نے شوہر کو تسلی دی۔

اس بار بھی رجو کے بیٹی ہی ہوئی۔ گلابی سی پیاری سی۔ رجو تو اس کی شکل دیکھ کر اپنی سب تکلیف بھول گئی تھی اور دائی مرے لہجے میں رحمت کو مبارک باد دی

"جنتی دائی تو تو کہے تھی کہ لڑکا جنوائے گی۔۔۔"

رحمت نے تیز لہجے میں کہا۔ اب میں کیا کروں تیری کسمت میں ہی نہیں۔ وہ سارا الزام قسمت پر ڈال کر گھر سے باہر نکل آئی۔ دوسرے دن گلی کی عورتیں۔ کچھ مبارک باد دینے اور کچھ رحمت کا ردعمل دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ فاطمہ بائی بھی مٹھائی لے کر آئی۔ "لڑکا ہوتا تو۔۔ تو۔۔۔ خیر ہے تو میری ہی پوتی۔۔۔۔" رحمت نے دہانے کیا کہتے کہتے خود کو روک لیا مگر ایک اداسی اس پر چھا گئی تھی۔ اسی وقت بھوندو سامان سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوا۔ وہ خاموش بیٹھی عورتوں اور ماں کے اترے چہرے کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اماں سب ٹھیک تو ہے نا؟ رجو کیسی ہے؟؟ اس نے گھبرا کر ماں سے پوچھا۔ اسے کیا ہونا ہے۔ اس بار بھی اس نے لڑکی جنی ہے۔ ماں جیسے پھٹ پڑی اور وہ بے دم سا ہو کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے سارے خواب سب امیدیں تاک میں مل گئی تھیں۔ وہ کافی دیر تک اسی حال میں بیٹھا رہا۔ فاطمہ نے تسلی دی۔ دوسری عورتوں نے دلاسے دیے مگر

وہ جیسے بہرا ہو گیا تھا۔ارے سب ایسے بول رہے ہیں جیسے گھر میں خوشی نہیں موت آئی ہے؟ رجو دبانے کب
کمرے سے نکل کر آ گئی تھی۔۔۔۔ارے ابھی کل ہی تو بچی ہوئی ہو اور تو۔۔۔اس کی ماں نے کہنا چاہا۔

"اے اماں کچھ نہیں ہوتا مجھے وہ بولی اور شوہر کی طرف لپکی

"اور تو بھوندو بڑا مرد بنا پھرتا ہے ارے ایک لڑکا مجھے نہیں دے سکتا تھا؟ دفع ہو جا۔"

وہ بھوندو پہ برس پڑی تھی۔سب عورتیں منہ کھولے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔بزرگ خواتین کی
آنکھوں میں حیرانی تھی جبکہ جوان عورتوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔شاید اس تومند کمزوری کی
اچانک تباہی کی جو انہیں گھٹی میں ڈال کر چٹا دیا تھا۔

"ارے مرد ہے تو مردوں والا کام کر اور نکل جا یہاں سے اپنی صورت لے کر۔۔۔ہائے بھوندو تجھے
اپنے اور میرے بڑھاپے کا بھی خیال نہ آیا۔۔۔"

وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اور بھوندو گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

کئی برس بیت گئے رجو کی زندگی بدل چکی تھی۔رحمت بی بی گذر چکی تھیں۔اپنی زندگی بھر کی بچت
بھوندو اور بیٹیوں کی کمائی سے اس نے کچی آبادی سے بہت دور شہر کے ایک کھلے علاقے میں ایک فلیٹ لے
لیا تھا۔رجو اب بیگم رضیہ سلطانہ بن چکی تھی۔وہ اس وقت اپنے فلیٹ کی بالکونی میں آنکھیں بند کیے سکون سے بیٹھی
تھی آج ہی اس کی بڑی بیٹی ہما کا رشتہ اسی کی کمپنی کے مالک کے چھوٹے بھائی وقاص احمد سے طے ہوا تھا جو
اس کے شعبے کا انچارج تھا۔اسے یاد تھا جب ہما بچپن پار کر رہی تھی تو رجو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا

"دیکھ ہما تو کمپیوٹر میں بہت اچھی ہے مگر بس کمپیوٹر میں دلچسپی رکھنا۔اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔میں نہیں
چاہتی کہ تو کسی ترک کالونی یا سرونٹ میں بیاہی جائے۔"

اور بیٹی نے ماں کی ہدایت گرہ سے باندھ لی تھی۔دوسری بیٹی ثنا نے نرسنگ کی تربیت حاصل کر کے
عورتوں کے ایک مفت علاج کے اسپتال میں ملازمت کر لی تھی جہاں اس کی بیگم صاحب اور ان کی بیٹی بھی
کام کرتی تھیں۔تیسری بیٹی رعنا ابھی پڑھائی کر رہی تھی اور وہ بقول بیگم رضیہ سلطانہ:

"یہ ہمارے خاندان کی پہلی افسر ہوگی۔"

اس نے اپنے لیے کو سنوارنے میں بھی بہت محنت کی تھی کہ اس کی بیٹیوں کو کوئی شرمندگی نہ اٹھانا
پڑے۔مگر اکثر وہ یہ سوچتی ضرور تھی کہ اگر اس کے بھی ایک بیٹا ہو جاتا تو اس کی بیٹیوں کو اتنی محنت تو نہ کرنا
پڑتی۔مگر بات تو وہی تھی کہ بھنڈی کے بیج سے انار نہیں اگتے، زمین چاہے کتنی ہی زرخیز کیوں نہ ہو۔

☆☆☆☆

ہما فلک (جرمنی)

سرپرائز

کئی دنوں سے وہ سخت بوریت کا شکار تھی سوشل میڈیا پر بھی کوئی خاص موضوع نہیں چل رہا تھا۔ اس لیے اس کے پاس بھی لکھنے کے لیے فی الحال کچھ نہیں تھا۔ اس کی تحریریں لوگ شوق سے پڑھتے اور اسے بتاتے کہ ان سے ان میں کیا مثبت تبدیلی آئی۔ لوگوں کے تبصرے دوسرے لوگ بھی پڑھتے اور یوں صرف اس کی شخصیت کا رعب بڑھتا بلکہ وہ خود بھی عمل کرنے کا عہد کرتے مگر کئی دنوں سے ایسا کچھ نہیں تھا تو وہ اپنے اندر بے چینی سی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس دن بھی یوں ہی موبائل کی سکرین سے مختلف تحریروں پر نظر ڈالتے اس کی انگلیاں راحیلہ کے تبصرے پر رک گئیں۔

""دوستو! میں نے اسے بلاک کر دیا ہے"

اور کمنٹ کے سکرین شاٹ لے لیے گئے ہیں تاکہ کبھی شکایت ہو تو ان کو بتایا جا سکے کس وجہ سے ایسا کیا تھا۔ راحیلہ سوشل میڈیا پر اس کی اچھی دوستوں میں سے ایک تھی اس لیے تجسس سے مغلوب ہو کر اس نے اسے الگ سے پیغام بھیجا۔ تم نے نیل آنچل کو کیوں بلاک کیا؟ وہ فیک تو نہیں تھی بس اصل نام سے نہیں لکھتی تھی۔ راحیلہ نے فوراً ہی اس کا پیغام دیکھ لیا اور کچھ سکرین شاٹس اس کو بھیجے "خود دیکھ لو!"۔

پہلا سکرین شاٹ راحیلہ کی تحریر کا تھا جس میں مردوں کی دوسری شادی کے حق میں معاشی اور مذہبی حوالے سے دلائل دیے گئے تھے۔ پہلی بیوی کو کچھ نصیحتیں کی گئی تھیں اور مرد کی جسمانی ضرورت کا حوالہ دے کر کہا گیا تھا کہ اگر کوئی مرد ایسا چاہے تو اسے ادھر ادھر ناجائز تعلقات بنانے پر مجبور کرنے کی بجائے پہلی بیوی خوش دلی سے اس کی دوسری شادی کو قبول کرے۔

دوسرا سکرین شاٹ نیل آنچل کے تبصرے کا تھا۔

"اگر معاشی حوالے سے بہتری لانے کا واحد حل مرد کی دوسری شادی ہی ہے تو وہ حضرات کیا کریں جو معاشی طور پر کمزور ہیں؟ اور جن پر پورے پورے کنبے کا بوجھ ہے؟ اس کے علاوہ وہ خواتین جو عمر رسیدہ، بیوہ، طلاق یافتہ، بچوں والی ہیں جن کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں شکل صورت بھی معمولی ہے ان کو سہارا کیوں نہیں دیا جاتا؟"

تیسرا سکرین شاٹ بھی نیل آنچل کے ہی تبصرے کا تھا

"اور آپ مرد کی جسمانی ضرورت کا حوالہ دے کر اس کی دوسری شادی کو برحق قرار دیتی ہیں تو آپ خود بتائیں آپ کی نظر میں آپ کی اپنی حیثیت سیکس ٹوائے سے زیادہ کیا ہے کہ مرد کی محض جسمانی ضرورت پورا کرنے کے لیے اسے ایک کے بعد دوسری عورت پیش کی جائے؟"

پہلے تبصرے تک تو ٹھیک تھا کہ ہر ایک کو اپنی بات کہنے اور اختلاف کرنے کا حق ہے لیکن دوسرے سکرین شاٹ میں اس کی زبان دیکھو میں نے اسے اسی الفاظ کی وجہ سے بلاک کیا ہے۔ دیکھو نا میری وال پہ مرد بھی ہوتے ہیں اسے ایسا کمنٹ کرتے شرم بھی نہ آئی؟"

راحیلہ نے مزید کہا۔ ہاں مجھے بھی ایسی گھٹیا ذہنی بکواس کرنے والی عورتیں نہیں پسند تم نے اچھا کیا اسے بلاک کر دیا میں بھی کر دیتی ہوں۔ درنجف نے راحیلہ کو تسلی دی اور کچھ مزید گفتگو کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔ اب درنجف کو لکھنے کے لیے بہت اچھا موضوع ہاتھ آگیا تھا۔ اس نے یہ کام رات پہ ڈال دیا تاکہ مکمل یکسوئی کے ساتھ اس موضوع پہ لکھ سکے۔ اس نے راحیلہ کی تحریر اور اس پہ آئے تبصرے دو تین بار پڑھے اور اپنی تحریر لکھنا شروع کر دی۔ تحریر مکمل کر کے اس نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ ہر لحاظ سے ایک مکمل تحریر جس میں مرد کی دوسری شادی کے حوالے سے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا تھا۔ مذہبی، معاشی، معاشرتی مجبوریوں کا تذکرہ کر کے دوسری شادی پہ واویلا کرنے والی خواتین کو پیار بھری اور تیکھی نصیحت کی گئی تھی۔ مردوں کو بھی انصاف کرنے کے لیے زور دیا تھا۔ یوں جائزہ لینے پہ اس کی تحریر ایسی تھی کہ وہ جانتی تھی کہ مرد تو مرد خواتین بھی اس پہ کوئی اعتراض نہ کر سکیں گی یوں بھی اس کی فہرست دوستاں میں وہی خواتین شامل تھیں جو اس کے گھریلو ٹوٹکوں کی دلدادہ اور زندگی گزارنے کے بہتر پہلو بھی اس کی باتوں کی پیروکار تھیں۔ ساس، سسر اور نندوں کی خدمت کر کے شوہر کے دل میں گھر بنا کر کامیاب زندگی گزارنے کے گر سیکھتیں اور اسے آ کر بتاتیں کہ اس کی وجہ سے ان کی زندگی کتنی سہل ہے۔ اس نے دو تین بار اسے مزید پڑھا اور موبائل رکھ دیا۔ اس کا ارادہ فجر کے وقت اسے لگانے کا تھا جب عموماً لوگ اٹھ کر نماز پڑھتے ہیں اور دن کے معمول کے کام شروع کرنے سے پہلے سوشل میڈیا پہ فعال ہوتے ہیں۔ تازہ دم ہوں تو ان میں ذرا طویل تحریر پڑھنے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے۔ یوں تو اس کی تحریروں کو بہت پذیرائی ملتی تھی پھر بھی وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہ کرتی۔ تحریر لگی اور توقع سے بڑھ کر اس پہ تبصروں، دل والے ایموجیز اور لائکس کی بوچھاڑ ہو گئی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی اس کی تحریر کو بہت پسند کیا اور بہت متوازن سلجھی ہوئی تحریر قرار دیا۔ بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ وہ اپنے شوہروں کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دے رہی تھیں مگر اس کی تحریر پڑھ کر دل میں شرمندگی محسوس کر رہی ہیں۔ معاشی حوالے سے اس کے دلائل خاصے زوردار تھے اور جب مذہبی حوالے سے بات کی گئی تو کہنے کو کچھ باقی ہی

نیس بجایا۔ لائکس کمنٹس اور شیئر کے بڑھتے ہوئے ہندسے اس کی دلی تسکین کا سامان کر رہے تھے اس کی ساری پوسٹ وائرل ہو چکی تھی۔ پیسے گننے کا تجربہ ہی اتنا اچھا ہوا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر موبائل رکھا اور اپنے دن بھر کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ اتنا بڑا گھر دو نوکروں کے باوجود وہ سب کام اپنی نگرانی میں کروانا پسند کرتی تھی۔ شام تک کام نپٹانے کے دوران وہ کئی بار موبائل میں بھی جھانک چکی تھی جہاں لائکس کا ہندسہ تین ہزار پار کر چکا تھا۔ لاتعداد تبصرے جن کے ابھی جواب دینا باقی تھے اور ہزار سے اوپر شیئر کی تعداد دیکھ کر وہ طمانیت سے مسکرائی۔ دروازے کی گھنٹی بجی تو وہی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

"سفیان وقت کے بہت پابند ہیں!"۔

وہ سوچتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولا تو مسکراتے ہوئے سفیان کو دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔ سفیان نے ہاتھ پیچھے کر کے ایک جیتے جاگتے نسوانی وجود کو اس کے سامنے کیا "سرپرائز!!!" شادی تو میں کئی مہینے پہلے ہی کر چکا تھا مگر تمہاری آج صبح کی تحریر پڑھ کر تمہاری اعلیٰ ظرفی کا قائل ہو گیا ہوں۔

☆☆☆☆

عشرت معین سیما (جرمنی)

بوئے قفس

اف! یہ کون سی اتنی تیز خوشبو تم نے لگائی ہے؟۔۔۔خوشبو کم کیڑے مار دوا زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔
میں نے ناک سکوڑتے ہوئے اپنے شوہر کو خود سے دور کر کے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔
تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے میں تمہارے ساتھ نہیں سونا چاہتا۔
ضمیر نے ایک جھٹکے سے میری کلائی چھوڑتے ہوئے جواب دیا اور مہمان خانے میں جا کر صوفے پہ دراز ہو گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ میں اپنی تیز حس شامہ کی وجہ سے اپنی ازدواجی زندگی خراب کر رہی تھی۔ ایک تو ضمیر کی رات کی شفٹ کی نوکری اور دوسرا ان میں اپنی ساس کے سامنے احتراماً ایک دوسرے سے دور رہنا ہماری مجبوری تھی۔ ہمیں خلوت کے لمحے کم ہی میسر آتے تھے اگر کبھی اچانک ضمیر کا موڈ رومانٹک ہونے بھی لگتا تو مجھے اس کے جسم سے پھوٹتی پسینے کی بو یا کوئی گھٹیا قسم کی پرفیوم کی خوشبو اس سے دور رہنے پر مجبور کر دیتی۔ اس کا خوشبو کے معاملے میں ذوق بہت ہی برا تھا۔ میں کوشش کے باوجود ایسی تیز بو برداشت نہ کر پاتی اور عین خلوت کے وقت مجھے الٹی آ جاتی۔ یہ سلسلہ شادی کے ابتدائی دنوں ہی سے تھا اور اب تو تین چار سال سے اس میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اکثر ایک طرف ایسی بو سونگھنے سے مجھے بار بار قے ہو جاتی جس کی وجہ سے میری صحت خراب ہوتی جا رہی تھی اور دوسری جانب ضمیر نے بھی رفتہ رفتہ میرے قریب آنا کم کر دیا تھا۔ شاید اسی کمزوری اور مجبوری کی وجہ سے میں اب تک ماں بننے کے رتبے سے بھی محروم تھی۔ اب ضمیر بھی ہفتے میں ساتوں راتیں فیکٹری کی ڈیوٹی پہ رہتا اور دن میں کبھی اپنی اماں کے کمرے میں، کبھی دیوان خانے کے صوفے پہ اور کبھی کبھی تو دن بھر پچھلی گلی میں اپنی بڑی بہن صغریٰ کے گھر دن جاگ اور سو کر گزار دیتا۔

آج کئی مہینوں کے بعد وہ نہا دھو کر خوشبو لگا کر میرے پاس آیا تھا لیکن خوشبو ایسی تھی مجھے ایسا لگا کہ جیسے گلاب کے دستے میں کسی نے کچی مچھلی لپیٹ دی ہو۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور اسی وقت مجھے قے آ گئی میں بھاگ کر غسل خانے میں گھس گئی۔ ضمیر نے جھنجھلا کر اپنا تکیہ اٹھایا اور دیوان خانے میں چلا گیا۔

اگلے روز صبح میں اپنی خفگی مٹانے کے لیے ضمیر کے پاس دیوان خانے میں چائے لے کر گئی تو اس نے میری طرف توجہ دیے بغیر کہا

تمھاری طبیعت ہر وقت خراب رہتی ہے۔ دن بہ دن یہ الٹیاں اور قے کی تکلیف بڑھتی جاری ہے۔ تم کوئی نوکرانی رکھ لو گھر کے کام کاج کے لیے۔

ہاں! پوچھوں گی محلے میں کسی نوکرانی یا ماسی کے لیے۔۔۔ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ضمیر نے گرم گرم چائے تیزی سے پیتے ہوئے کہا

تم اماں سے پوچھ لینا وہ بتا دیں گی۔ ویسے صغرا آپا کے گھر کام کاج کرنے والی ایک دو عورتیں آتی ہیں شاید۔۔۔ ان ہی میں سے کوئی آجائے۔۔۔ آج کل کے حالات کی وجہ سے جان پہچان والوں کو ہی گھر پہ ملازم رکھنا ضروری ہے۔ کسی انجان کو رکھنے میں خطرہ ہی ہے۔

ضمیر نے کل رات کے واقعے کو یکسر نظرانداز کر کے اپنی بات ختم کی اور اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا۔ مجھے اس صوفے پر سے بھی اسی گلاب اور چمیلی کی ملی جلی پرفیوم کی عجیب سی بو آرہی تھی جو اس نے رات جسم پہ انڈیل دیا تھا۔ میں ناک پہ دوپٹے کا کونا رکھتی ہوئی چائے کی خالی پیالی اٹھائی اور واپس کچن کی طرف چل دی۔

اماں! صغرا آپا کے یہاں جو کام کرنے والی آتی ہے کیا وہ ہمارے یہاں بھی جھاڑو پوچا کرنے آسکتی ہے؟ ضمیر کہہ رہے تھے کہ ملازمہ رکھ لوں۔۔۔ اب میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔

میں نے دن میں اماں کے کمرے میں پلنگ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

رکھ لو بھئی! تمھارا میاں کماتا ہے تم ہی تنخواہ دوگی۔۔۔ صحت تو تمھاری شروع ہی سے خراب ہے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔۔۔ علاج کرواؤ۔۔۔ تمھاری صحت اچھی ہوتی تو اب تک میرا بیٹا دو چار بچوں کا باپ ہوتا اور گھر گرہستی بھی تم سے سنبھلتی۔

اماں نے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے کہا۔

تو آپ بات کریں آپا صغرا سے کہ وہ اپنی ایک نوکرانی ہمارے یہاں بھیج دیں۔ جتنی تنخواہ وہ دیتی ہیں میں بھی دے دوں گی۔

میں نے اماں کی باتیں سن کر کڑھتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد ہی اماں نے مجھے اپنے کمرے سے آواز لگا کر بلایا۔

نسیم! ادھر آؤ ذرا!۔۔۔ میں نے ابھی صغرا سے نوکرانی کی بات کی تھی۔ اس کے یہاں برتن کپڑے دھونے والی کی ایک نوکرانی ہی آج کل کام پہ ہے اور اس پہ سارے کام کا بوجھ ہے۔ دوسری کے یہاں بچہ ہوا ہے ابھی۔۔۔ وہ چلّے کے بعد کام پہ آئے گی۔۔۔ لگتا ہے کہ اب ماسی کی تلاش کے لیے محلے میں یا کہیں اور پوچھنا ہوگا۔

اماں نے کچھ دیر بعد اپنے موبائل کو پلنگ کے کنارے رکھتے ہوئے مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر ساری تفصیل بتائی۔

نہیں اماں! ضمیر کہہ رہے تھے کہ آج کل حالات اچھے نہیں ہیں کسی جاننے والے کو ہی گھریلو ملازم رکھنا ہے۔۔۔آپ رہنے دیں۔میں سنبھال لوں گی سب کچھ۔۔۔

میں نے اماں کی بات سن کر کہا اور باورچی خانے کی طرف چلی شاید ہنڈیا پہ رکھی دال جلنے کی بو مجھے محسوس ہوئی تھی۔اماں بھی اپنی عینک سنبھال کر اپنے موبائل کو دوبارہ دیکھنے میں لگ گئیں۔

اگلے روز ضمیر تک کام سے واپسی پر اماں کے کمرے ہی میں سو گیا تھا۔جب میں ناشتے کی تیاری کے لیے اٹھی تو دیکھا کہ صغرا آپا اپنی ملازمہ کے ساتھ اماں کے کمرے میں بیٹھی ہیں۔ملازمہ کی گود میں ننھا سا بچہ بھی تھا اور ضمیر بڑے اشتیاق سے بچے کو چٹکی بجا بجا کر متوجہ کر رہا تھا۔

ارے نسیم! لو تمہارا کام ہو گیا۔۔۔اب یہ نسرین چوبیس گھنٹے تمہاری مدد کرائے گی گھر کے کام کاج میں ۔۔۔اور اسٹور کے برابر والے کمرے میں رہے گی۔اب تم ذرا اپنا علاج وعلاج کرواؤ۔۔۔اپنی صحت پہ توجہ دو۔

اماں نے مجھے کمرے میں آتا دیکھ کر ملازمہ کی گود میں بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

مگر اس کا تو بچہ ابھی سوا مہینے کا بھی نہیں ہوا۔۔۔یہ کیا کام کروا سکے گی؟

میں نے اس کمزور سی ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ضمیر مسلسل بچے اور اس کی ماں کو دیکھ رہا تھا۔اس کی نگاہیں بچے کے چہرے پہ بار بار رک سی جاتی تھیں۔میرے دل کو جیسے ایک دھکا سا لگا۔زندگی کی سب سے بڑی نعمت کی کمی کا احساس میری آنکھوں میں چبھنے لگا تھا کہ صغرا آپا بولیں۔

دس پندرہ دن کا ہو چکا ہے اس کا بچہ۔۔۔یہ خود بھی کام کی تلاش میں ہے۔۔۔شوہر بھاگ گیا ہے اس کا۔۔۔سر چھپانے کو ٹھکانہ اور دو وقت کی روٹی چاہیے اسے۔۔۔بہت ضرورت مند ہے بیچاری۔۔۔ہو سکتا ہے کہ اس کی دعاؤں سے تمہاری خالی گود بھی بھر جائے۔۔۔اور پھر تھوڑے بہت اوپر کے کام کاج ہی تو فی الحال کرنے ہیں کرے گی یہ۔۔۔بہت محنتی ہے نسرین۔۔۔تم دیکھنا بعد میں سارا گھر سنبھال لے گی۔۔۔مجھے بھی بہت آرام دیا ہے اس نے۔

صغرا آپا نے ملازمہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو میں خاموش ہو گئی۔ان کی بات یوں بھی جب منہ سے نکل جائے تو خود کو منوا کر ہی رہتی ہے۔ضمیر نے نسرین سے کہا

ابھی تم جاؤ اپنے کمرے میں دوپہر کو بیگم صاحبہ کام سمجھا دیں گی تمہیں۔۔۔اور اس بچے کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیگم صاحبہ کو بتا دینا یا اماں سے کہہ دینا۔

نسرین نے سر جھکا کر اچھا کہا اور اپنا سامان اٹھا کر اماں کے پیچھے اسٹور روم کے برابر والے کمرے کی طرف چل دی۔

میں نے ناشتہ تیار کیا صغرا آپا چائے پینے کے بعد اپنے گھر چلی گئیں اماں اور ضمیر کمرے میں بات چیت کرنے لگے۔ میں گھر کے دوسرے کام نمٹانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔ مجھے بار بار ضمیر کی نگاہ میں بچے کا وہ اشتیاق اور اماں و صغرا آپا کی بے جا طرف داری بار بار اپنی ذلی گو وکا احساس بن کر چبھ رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بھی ضمیر اپنے کمرے میں نہیں آیا اور اماں ہی کے کمرے میں لیٹا رہا پھر شام ہوتے ہی تیار ہو کر کام پہ چلا گیا۔ اماں بھی رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بتی بجھا کر لیٹ گئیں۔ اسٹور کے برابر والے کمرے سے بچے کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آج دن بھر نسرین اپنے کمرے ہی میں تھی کل سے اس کو میں کچھ ہلکے پھلکے کام کہا تھا اور بتانا پڑ رہی تھی۔ اس وقت بچے کے رونے کی آواز نے مجھے اس کے کمرے میں جانے پہ مجبور کر دیا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ بچہ پلنگ پہ ایک طرف لیٹا ہوا چلا چلا کر رو رہا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب طرح کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کچا گوشت یا تازہ خون کی مہک میں کوئی اور بو بھی مل گئی ہو۔ شاید بچے کے پوتڑے بدلنے کے بعد نسرین انھیں دھونے کے لیے غسل خانے میں تھی۔ مجھے اس ملی جلی بو سے ابکائیاں آنے لگیں اور میں تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے کے ملحق واش روم میں جا کر قے کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد حالت سنبھلی تو دیر تک بستر پہ نقاہت سے لیٹی ہی رہی اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اگلے روز صبح نسرین میرے کمرے میں دستک دے کر داخل ہوئی۔ میں نے اس کی جانب دیکھ کر اسے دروازے پہ ہی روک دیا اور پوچھا "کیا ہوا؟۔۔۔کیا بات ہے؟

میں پوچھنے آئی تھی کہ ناشتہ بنا دوں؟ صاحب آتے ہی ہوں گے۔۔۔ بڑی بیگم صاحبہ بھی جاگ گئی ہیں۔

نہیں! میں بنا لوں گی۔۔۔ تم اپنے بچے کو دیکھو۔۔۔ پہلے نہا دھو کر صاف ستھری ہو جاؤ پھر کچن کے کام کرنا۔۔۔ میرے لیے صفائی سے کام کرنا اتنا ہی اہم ہے جتنا خود صاف رہنا۔۔۔ بچے کے پوتڑے پچھلے صحن میں باہر لگے نل پہ دھویا کرو یا پیچھے والے غسل خانے میں۔۔۔ اور اپنے کمرے کی کھڑکی بھی دن کو کھولا کرو تا کہ صاف ہوا کمرے میں آئے۔۔۔ کل رات میں تمھارے کمرے میں آئی تھی تمھارے کمرے میں بہت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔۔۔ میں اس طرح کی تیز بو بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔ میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور کل رات بھی ایسا ہی ہوا۔۔۔

میں نے دو ٹوک اس کو اپنے تحفظات کے بارے میں بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولی۔ جی! مجھے بڑی بیگم صاحبہ نے بتایا تھا آپ کی بیماری کے بارے میں۔۔۔ اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی میں صفائی کا خاص خیال رکھوں گی۔۔۔ اگر اجازت دیں تو ابھی نہا کر کپڑے بدل کر گھر کے کام دیکھ لوں۔۔۔ آپ آرام کریں۔۔۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔

میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر نقاہت سے اٹھا نہیں گیا۔ ایک لمبی سانس بھر کر میں نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی صبح کے نو بجنے والے تھے۔ ضمیر کے آنے اور اماں کے جاگنے کا وقت ہونے کو تھا۔ میں نے نقاہت سے نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

ٹھیک ہے بنا لو ناشتہ۔۔۔ وہیں کچن میں اور فرج میں سامان رکھا ہے ٹوسٹ اور آملیٹ بنا دو اور ساتھ چائے بھی۔۔۔ لیکن پہلے خود صاف ستھری ہو جاؤ۔۔۔ کپڑے بدل لو۔

نسرین سر ہلا کر آمادگی ظاہر کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں بستر پہ ہی آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ضمیر کی کمرے میں آمد نے مجھے بستر سے اٹھنے پہ مجبور کر دیا۔

ارے تم سوئی رہو۔۔۔۔ میں تو بس کپڑے بدلنے آیا تھا۔۔۔ اماں کے کمرے میں سو جاؤں گا۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ضمیر اپنے کپڑے بدل کر کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھ کر کمرے سے باہر گئی تو گھر کا ماحول ہی بدلا پایا۔ ضمیر بچے کو اماں کے بستر پہ لٹائے اس کے ساتھ کھیل رہا تھا اور نسرین اماں کے سر میں تیل ڈال کر مساج کر رہی تھی۔ کمرے میں کھیلی کے تیل کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں وہاں سے باورچی خانے میں آ گئی۔ ناشتہ ختم ہو کر کچن سمیٹ دیا گیا تھا۔ فریزر سے نکالا گوشت ایک پلیٹ میں رکھا ہوا تھا اور پیاز لہسن اور ادرک بھی کٹی رکھی ہوئی تھی۔ دوپہر کے کھانے کی اتنی تیاری دیکھ کر میں فرج سے ایک جوس کا گلاس لیتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر پہ لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

شام کو نسرین کے کمرے سے بچے کے رونے کی آوازیں پھر آ رہی تھیں۔ نسرین نہ جانے کہاں غائب تھی اماں نے نماز پڑھ کر سلام پھیرا تو میں نے پوچھا

نسرین کہاں ہے؟۔۔۔ بچہ رو رو کے ہلکان ہو رہا ہے اس کا۔۔۔

وہ دروازے کی کنڈی لگانے گئی ہے شاید صحن میں ہوگی۔۔۔ ضمیر گیا ہے تو ابھی کام پہ۔

اماں نے جواب دیا۔ میں نے دیوار پہ لگی گھڑی پہ دیکھا شام کے پانچ بجے تھے۔

ابھی سے چلے گئے ضمیر!۔۔۔ کھانا کھایا انھوں نے یا ٹفن لے کر گئے ہیں؟

میں نے اماں سے پوچھا۔

ہاں ہاں! نسرین نے دے دیا تھا ساتھ۔۔۔ اماں نے جائے نماز تہہ کر کے ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جواب دیا۔ بچے کے رونے کی آواز یں تیز ہو رہی تھی۔ میں نسرین کے کمرے کی طرف بڑھی۔ چند ہی قدم بعد میں ٹھٹھک گئی ضمیر نسرین کے کمرے سے نکل کر گھر کے مرکزی دروازے کی طرف تیزی سے جا رہا تھا۔ چند لمحے میں وہاں ساکت ہی کھڑی رہی پھر ہمت کر کے آگے بڑھی، اتنی دیر میں ضمیر گیٹ کھول کر باہر نکل چکا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور نسرین کے کمرے کے پاس رک کر دروازے سے کمرے کے اندر جھانکا۔۔۔ بچہ بستر کے کنارے لیٹا ہوا بدستور رو رہا تھا۔ نسرین بستر پہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنے کھلے بالوں کا جوڑا بنا رہی تھی۔ وہ آہستہ سے بچے کو گود میں اٹھانے کے لیے جھکی۔۔۔ جیسے ہی دروازے کے پاس مجھ پہ اس کی نگاہ پڑی تو گھبرا کر پوچھا۔

بیگم صاحبہ آپ یہاں!!ان چند ہی لمحوں میں مجھے لگا کر نسرین کے کمرے سے اٹھتی گلاب اور مٹی کی ملی جلی تیز بو میرے دماغ پہ چڑھنے لگی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب کی بار تے میں میرا دل ہی باہر نکل کر آجائے گا۔ میں دوپٹہ ناک پہ رکھتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے کے ملحقہ غسل خانے کی جانب بھاگی۔

☆☆☆☆

حنا خراسانی رضوی (سویڈن)

سیر کو سوا سیر

کیا ہو گیا بھائی! کہاں غائب ہو گئے تھے؟ دو دن سے تمھیں کال پہ کال کیے جا رہا ہوں۔ اٹھاتے ہی نہیں ہو تم۔ سب خیریت تو ہے نا؟ کیفے ٹیریا میں بیٹھے تنویر نے حماد کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

ہاں یار! دیکھی تو تھیں تمھاری کالیں مگر بس کچھ مصروفیت ہی ایسی تھی کہ جواب نہ دے سکا۔ حماد باری باری وہاں موجود لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

اب ایسی بھی کیا مصروفیت کہ بندہ پلٹ کے خبر بھی نہ لے کسی کی۔ ویسے پچھلے ہفتے تمھارا میچ تھا امامت نمبر والے شاکر سے۔ شرط بھی تم نے خود لگائی تھی اور پھر آئے نہیں۔ ہماری تو بات خراب ہو گئی ولن کے سامنے۔ شفیق ابو (کیرم) کی گوٹیاں بجاتے ہوئے حماد پہ برس پڑا۔

ہاں تو میں تمھاری طرح فارغ تھوڑی ہوں اور نہ ہی میرے ابا کی ملیں چلتی ہیں شہر میں تمھارے ابا کی طرح۔ نوکری پیشہ ہیں ہم اور تم کیا جانو نوکری کیا بلا ہے؟ کبھی کی ہو تو پتہ ہو۔ غلامی کا دوسرا نام ہے نوکری۔ حماد تیز لہجے میں شفیق کو گھورتے ہوئے بولا۔

اس بات سے کیا مطلب ہے تمھارا؟ کہیں اور کا غصہ یہاں نکال رہے ہو شاید۔ شفیق نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں دیر نہ لگائی۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں کے درمیان بات تو تو میں میں سے آگے بڑھتی سامنے بیٹھے ضیا نے شفیق کو آنکھ کے اشارے سے چپ ہو جانے کا کہا اور حماد کو ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے ساتھ لیکر نسبتاً دور رکھی ایک میز کی جانب بڑھ گیا۔

اوئے کاکے! دو چائے لاؤ ملائی والی کڑک۔ ضیا نے وہاں کام کرنے والے لڑکے سے کہا اور پھر حماد کو کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ کیوں آگ بگولا ہو رہا ہے بھائی؟ دوستوں کی باتوں کا برا نہیں مناتے۔ مانا کہ ہماری ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر ہم سب تمھیں اپنا پرانا دوست ہی سمجھتے ہیں۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟ اگر پیسوں ویسوں کی ضرورت کا کوئی معاملہ ہے تو فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم دوست کس دن کے لیے ہیں۔ بے فکر ہو جا۔

حماد نے گہری سانس بھر کر ضیا کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے یار! میں بھی تم لوگوں کی خاطر ہی تو یہاں آتا ہوں اور رہی بات پیسوں کی۔ تو بھائی ہم جیسے طبقے کے لوگوں کو تو ہر وقت ہی پیسوں کی تنگی کا سامنا رہتا ہے۔ کوئی ایک دن کی بات ہو تو آدمی بولے بھی۔

تو پھر کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟ گھر والوں کی طرف سے کوئی پریشانی ہے کیا؟ ضیا نے بصد اصرار کہا۔

بس یار کیا بتاؤں! ایک ذرا سی بات پر باس سے تلخ کلامی ہو گئی اور اس نے کھڑے کھڑے نوکری سے ہی نکال دیا۔ میں پوری دل جمعی اور دیانت داری سے کام کرتا ہوں۔ آج تک کبھی بھی کام کے لیے باس کو منع نہیں کیا۔ آندھی آئے طوفان آئے، کبھی ایک دن کی بھی چھٹی نہیں کی دفتر سے اور اس وفاداری کا یہ صلہ ملا ہے مجھے۔

ایسی کیا بات ہوئی کہ باس اتنا بھڑک اٹھا؟ ضیاء نے سوال کیا۔

اصل میں امی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ان کو ہسپتال لے جانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اب مجھے کیا پتہ تھا کہ ان کو ہیضہ ہو گیا ہے اور احتیاطاً ایک دن ہسپتال میں روک لیں گے۔ اس صورتحال میں میں دفتر جا ہی نہیں سکا۔ ایک کولیگ کے ذریعے پیغام بھجوا دیا تھا مگر وہ صاحب بتانا بھول گئے۔ اگلے دن جب دفتر پہنچا تو ذرا سی دیر ہو گئی اور جب صفائی دینے کی کوشش کرنے لگا تو باس کو غصہ آ گیا اور چھٹی کر دی میری۔ اب بتاؤ گھر والوں سے کیا کہوں؟ گھر میں بوڑھے اور بیمار والدین ہیں۔ چھوٹے بہن بھائی ہیں جو ابھی پڑھ رہے ہیں۔ کیسے گزارا ہوگا؟ کمانے والا تو ایک میں ہی ہوں۔ ابا کی پنشن تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ جمع پونجی بھی کچھ نہیں کہ اسی کے آسرے پر بیٹھا رہوں۔ نوکری کی تلاش میں ہی مارا مارا پھر رہا ہوں کئی دنوں سے۔ اسی لیے نہیں آ پا رہا تھا یہاں۔ یہ سب کہتے کہتے حماد روہانسا ہو گیا۔

ضیاء نے حماد کا شانہ تھپتھپایا اور دلاسہ دیتے ہوئے بولا! پریشان نہ ہو کچھ سوچتے ہیں! اچھا کیا تم نے بتا دیا مجھے۔ میرے کچھ جاننے والے ہیں بات کرتا ہوں ان سے تمہارے بارے میں۔ فکر نہ کرو کہیں نہ کہیں تو کام بن ہی جائے گا۔ پھر دونوں کے پاس کھڑے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا! چلو وہاں چلتے ہیں سب ہمارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔

دو چار دن ہی گزرے تھے کہ حماد کے پاس ضیا کا فون آیا اور اس نے اسے سہ پہر چار بجے صدر کے علاقے میں جہانگیر پارک کے قریب بنے رحیم چائے خانے میں ملنے کو کہا۔ حماد جب مقررہ جگہ پر پہنچا تو ضیا کو وہاں اپنا منتظر پایا۔ علیک سلیک کے بعد ضیاء نے حماد سے نوکری ملنے کی بات پوچھی۔ جواب میں حماد نے مایوسی

سے گلی میں گردن ہلائی اور ضیاء کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ کر بولا! تم نے کہا تھا کہ بات کرو گے اپنے کسی جاننے والے سے؟

ہاں ہاں! میں نے اسی سلسلے میں یہاں بلایا ہے تم کو۔ وہاں کیفے میں سب کے درمیان بات نہیں ہو پاتی کھل کر۔ ضیاء گلا کھنکھارتے ہوئے بولا پھر حماد کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا! اچھا یہ بتاؤ! تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟

'میں! مجھے بہت زیادہ تو نہیں پتا تمھارے بارے میں۔ البتہ ان چھ مہینے کے عرصے میں جب سے کیفے میں آنا جانا شروع ہوا ہے، اتنا تو جانتا ہوں کہ تم لانڈراریا میں تنویر کے گھر کے پاس ہی رہتے ہو اور حیدرآباد میں اچھی خاصی تنخواہ والی نوکری کرتے ہو۔ میری تم سے پہلی ملاقات کیفے میں تنویر کے توسط سے ہی ہوئی تھی تمھیں یاد ہوگا۔ اس نے بتایا تھا کہ خوب رونق لگتی ہے وہاں ہر ہفتے کے اختتام پر چھٹی والے دن یار دوستوں کے ساتھ۔ اسی تجسس میں میں اس کے ساتھ چلا آیا تھا اور واقعی اب تو میں خود بھی چھٹی کے دن کا انتظار کرتا ہوں کیفے جانے کے لیے۔ مگر ان سب باتوں کا میری نوکری سے کیا تعلق ہے؟' حماد نے تفصیل بتاتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

'تعلق ہے اور بہت گہرا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ میں حیدرآباد میں کام کرتا ہوں اور وہ بھی ہفتے میں پانچ دن۔ پیسے بھی اچھے خاصے کما لیتا ہوں۔ خرچے کے بعد اچھی خاصی بچت بھی ہو جاتی ہے۔ ضیاء نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاں بھائی! خوش قسمت ہو تم جو ایسی نوکری ملی ہوئی ہے تمھیں آج کل کے دور میں۔ حماد رشک سے ضیاء کو دیکھتے ہوئے بولا

'اب تم یہ سمجھو کہ خوش قسمتی کی یہ دیوی تمھارے دروازے پہ دستک دے رہی ہے۔ اب یہ تمھاری مرضی ہے کہ دروازہ کھول کر اسے خوش آمدید کہتے ہو یا دھتکار کر یہ موقع گنوا دیتے ہو۔ ضیاء نے پراسرار انداز سے مسکرا کر بولا۔

'میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟' حماد نے الجھی ہوئی نظروں سے ضیاء کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'میں تفصیل سے تمھیں سب بتاتا ہوں مگر اس سے پہلے تمھیں ایک وعدہ کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ اگر تمھیں میری پیشکش قبول نہیں تو اس بات کو یہیں دفن کر دو گے ہمیشہ کے لیے۔ ضیاء، چائے کا آخری گھونٹ لیکر پیالی طشتری میں رکھتے ہوئے بولا۔

'ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر ایسی کیا بات ہے؟۔۔۔ حماد نے حیرانی سے پوچھا

ضیا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا۔ کبھی میں بھی تمھاری طرح دربدر نوکری کے لیے خوار ہوتا پھرتا تھا۔ ایم ایس سی کی ڈگری ہوتے ہوئے بھی کہیں ڈھنگ کی نوکری نہیں مل رہی تھی کیونکہ میرے پاس سفارشی پرچی جو نہیں تھی۔ کنبہ بڑا تھا۔ چھ بہنیں اور بوڑھے ماں باپ۔ باپ کینسر کا مریض جس کا ٹیوشن کی معمولی کمائی میں علاج کرانا ممکن ہی نہیں تھا میرے لیے۔ ایک دن دوا ختم ہونے کی وجہ سے ابا کی طبیعت کافی خراب ہوگئی۔ جیب میں چند روپے ہی بچے تھے جو ان کی دوا کے لیے ناکافی تھے۔ تب میں نے پہلی مرتبہ شفیق سے کچھ پیسے ادھار مانگے جو ہمارے پرانے محلے میں رہتا تھا۔ اس نے فوراً ہی پیسے لا کر میری ہتھیلی پر رکھ دیے اور کہنے لگا کہ اگر مزید کی ضرورت ہو تو بلاتکلف مانگ لینا۔ میں نے اس سے کہا کہ تھوڑی مدت میں واپس کر دوں گا، نوکری تلاش کر رہا ہوں جیسے ہی ملے گی سب سے پہلے اسی کے پیسے ادا کروں گا۔ نوکری تو نہ ملی اور گھر میں نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ابا کا علاج بھی ضروری تھا۔ مجبور ہو کر پھر شفیق سے ادھار مانگنے اس کے گھر گیا تو وہاں اس نے مجھے اپنے چچا قادر سے ملوایا کہ ان کو اپنے کاروبار کے لیے کچھ نئے لڑکوں کی ضرورت ہے۔ قادر چچا نے مجھے اپنے کاروبار میں شراکت داری کی دعوت دی۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پاس تو زہر کھانے کے بھی پیسے نہیں، کاروبار میں شراکت داری کیسے کر سکتا ہوں۔ میری بات سن کر انھوں نے قہقہہ لگایا اور بولے! میاں اس کاروبار کو شروع کرنے کے لیے پیسوں کی نہیں صلاحیت کی ضرورت ہے جو کہ تم میں شفیق پہلے ہی کھوج چکا ہے۔ میں نے حیران ہو کر شفیق کی طرف دیکھا تو اس نے بتایا کہ قادر چچا کا گداگری کا کاروبار ہے۔ انھوں نے سو ڈیڑھ سو لوگوں کو مختلف علاقوں میں نوکری پر رکھا ہوا ہے۔ جن میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل ہیں۔ یہ لوگ صبح سے رات تک بھیک مانگتے ہیں اور دن بھر میں جو کچھ کماتے ہیں اس میں اپنا کمیشن لیکر باقی قادر چچا کو دیتے ہیں۔ قادر چچا کے کارندے ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں اور ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں خاص کر پولیس سے۔ شفیق نے بتایا کہ وہ خود بھی اس کاروبار میں ملوث ہے اور مہینے میں ستر اسی ہزار تک کما لیتا ہے۔

اس انوکھے کاروبار اور ہر ماہ اتنی بڑی رقم ملنے کا سن کر میں تو حیران رہ گیا۔ تنگدستی کے مارے ہوئے میرے گھر والوں کے چہرے میری نگاہوں کے سامنے آ گئے اور میں نے حامی بھر لی مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ گھر والوں سے کیا کہوں گا؟ دنیا کا سامنا کیسے کروں گا؟ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ شفیق نے یہ بتا کر یہ خوف بھی دور کر دیا کہ قادر چچا اپنا کاروبار خفیہ رکھتے ہیں۔ نہ دنیا والوں کو خبر ہوتی ہے اور نہ گھر والوں کو کچھ پتہ چلتا ہے۔ ایک شہر کے لوگ دوسرے شہر میں جا کر بھی کام کرتے ہیں۔ آس پاس کے شہروں میں بھی ان کے کارندے موجود ہیں۔ کچھ لوگ میک اپ کے ذریعے شکل بدل کر اپنے شہر میں بھی کام کرتے ہیں۔ کراچی میں ہمارے اپنے

میک اپ پارلر میں جو ایسا میک اپ کرتے ہیں کہ اپنے گھر والے بھی نہیں پہچان پاتے۔ یہ سب بیان کرتے کرتے ضیا نے حماد سے پوچھا: تم نے نیل روڈ پہ آدھا چہرہ، بگڑی ہوئی بچی کو دیکھا ہی ہوگا جس پہ ہر گزرنے والا ترس کھا کر کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ وہ ہماری ہی کارندہ ہے اور مزے کی بات بتاؤں تم کو میں خود ہی مارکیٹ میں ہوتا ہوں اپاہج کے روپ میں اور گھر والوں کو بتا رکھا ہے کہ حیدرآباد میں نوکری ہے۔ تم کو یہ راز اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم بھی ضرورت مند ہو اور جو تمھارے اوپر بیت رہی ہے وہ میرے اوپر گزر چکی ہے۔ ہم جیسے ٹھگنے والوں کے پاس زیادہ پیسے کمانے کا اور اپنی خواہشات پوری کرنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ تم راضی ہو تو بتاؤ؟ اپنی بڑی بات ہے قادر چچا کے یہاں۔ امید سے زیادہ دلواؤں گا تم کو۔

حماد جو اب تک بڑی خاموشی سے بیٹھا ضیا کی روداد سن رہا تھا اس کے پوچھنے پر بولا! ہاں یار! تم صحیح کہہ رہے ہو۔ اب تو میں بھی اس غربت اور در در کی ٹھوکریں کھانے سے تھک سا گیا ہوں۔ تم تو ایم ایس سی پاس ہو میری تو ڈگری بھی معمولی ہے۔ نوکری اگر مل بھی گئی تو کتنا کماؤں گا۔ اتنے پیسے تو پھر بھی نہیں کما سکوں گا جتنے تم بتا رہے ہو۔ اب اس طرف قسمت آزماتے ہیں۔ میری طرف سے ہاں ہی ہے۔ بس اگر اپنے شہر میں ہی ہو تو اچھا ہے۔

یہ ہوئی نا بات! سمجھو کہ تمھاری مشکلات اب دور ہونے والی ہیں۔ بے فکر ہو جاؤ۔ اپنے آس پاس ہی کی بات کرتا ہوں۔ بڑی کمائی والا علاقہ ہے۔ بڑے یا دھیرے کی بچائی کی آمدنی الگ ہو جاتی ہے وہاں۔ قادر چچا سے بات کرتا ہوں پھر تمھیں بتاتا ہوں کہ ان سے کب ملنے جانا ہے۔ اصل میں ان کے شہر میں بھی کئی گھر ہیں تو معلوم کرنا پڑے گا کہ کہاں چلیں گے۔ ضیا نے حماد کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور رخصت کے لیے کرسی سے اٹھ گیا۔

تین چار روز گزرنے کے بعد ایک دن شام کو حماد کے پاس ضیاء کا فون آیا کہ قادر چچا سے بات ہو گئی ہے اور انھوں نے دو دن کے بعد بدھ کو رات دس بجے اپنے تین بتی والے گھر پہ بلایا ہے۔ حماد نے ضیا سے مکان کا پتا پوچھا کہ وہاں پہنچ جائے گا مگر ضیاء نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔

دو دن کے بعد مقررہ وقت پہ حماد ضیا کے ساتھ قادر چچا کے گھر پہنچا۔ یہ تین بتی کے پل کے قریب اشرف کالونی میں بنا ہی گھر کا ایک دو منزلہ مکان تھا جس کی اوپری منزل مکمل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی جبکہ نچلی منزل پہ صدر دروازے پہ ایک مدھم سا پیلا بلب روشن تھا۔ ضیا کے مخصوص انداز میں دروازہ کھٹکھٹانے پہ ایک لمبا تڑنگا شخص باہر آیا اور ضیا کو سلام کر کے دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر چھوٹے سے صحن سے گزر کر دونوں ایک بیٹھک میں پہنچے جہاں صوفے پہ ایک ساٹھ پینسٹھ برس کا آدمی اطمینان سے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ حماد

سمجھ گیا کہ یہی قادر چچا ہے۔ ضیا نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور پھر حماد کا تعارف کرایا۔ قادر چچا نے حماد کو غور سے دیکھتے ہوئے ضیا سے پوچھا!! اپنے کام کے متعلق سب سمجھا دیا ہے بالے؟

جی جی! سب بتا دیا ہے۔ بس اب آپ کی رضامندی چاہیے۔ ضیا نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

تم ہمارے بھروسے کے آدمی ہو۔ تم لائے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم نئے آدمی پر اتنے جلدی بھروسہ نہیں کرتا ہوں میں۔ قادر چچا نے ضیا کو اپنے برابر میں ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا پھر کونے میں کھڑے ایک دبلے پتلے سے آدمی سے بولا! اے بھئی کمالے! تیرے لیے ایک نیا شاگرد آگیا ہے۔ اسے سب اچھی طرح سکھانا اور پھر کام پر لگانا۔ پھر حماد سے کہنے لگا! دیکھو میاں! دل لگا کر کام کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ہمارے کام میں دیانت داری اور بھروسہ بہت اہم ہے۔ یاد رکھنا!! اگر ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ ہم سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں پاؤ گے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں ہمارے۔

حماد جلدی سے آگے بڑھ کر قادر چچا کے قدموں میں بیٹھ گیا اور مسکین انداز میں کہنے لگا! جی میں سب سمجھ گیا ہوں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا ابھی آپ میری صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں۔

اچھا اچھا ٹھیک ہے دیکھتے۔۔۔۔ قادر چچا ابھی اپنی بات مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ بیٹھک کا بند دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور صدر دروازے پر آنے والا لمبا تڑنگا آدمی اور ایک نو عمر دیہاتی سا لڑکا ہاتھ اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پولیس کے پانچ چھ جوان تھے جن کے ہاتھ میں جدید ساخت کا اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں موجود قادر چچا سمیت تمام افراد بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ قادر چچا نے صورتحال بھانپ کر آن کی آن میں صوفے کے بائیں طرف بنے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی جو شاید کوئی خفیہ راستہ تھا مگر اسی اثنا میں حماد نے پھرتی سے چھلانگ لگا کر قادر چچا کو دبوچ کر اپنے قابو میں کر لیا۔ ایک سپاہی فوراً ہتھکڑی لیکر آگے بڑھا اور حماد کو سلیوٹ کر کے کہنے لگا! ٹھیک ہے سر! اسے اب میرے حوالے کر دیں۔

حماد کو یوں مخاطب کیے جانے پر ضیا کا منہ حیرت سے کھل گیا اور وہ خونخوار نظروں سے حماد کو دیکھتے ہوئے بولا!! اچھا!! تو تم پولیس کے مخبر ہو۔ اس سے پہلے کہ حماد کچھ کہتا چہرے پر نقاب لگائے ایک سپاہی آگے بڑھا اور چہرے سے نقاب ہٹا کر ضیاء کی طرف دیکھ کر مسکرا کے بولا!! پولیس کے مخبر نہیں کرمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ کے اسپیشل یونٹ کے اے ایس پی، حماد علی خان اور میں، ان کا سہولت کار انسپکٹر تنویر ملک عرف کھوجی۔ ہم نے تم لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے یہ بھیس بدلا تھا۔ پھر قادر چچا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا!! ہم بہت عرصے سے تمہاری تاک میں تھے جو لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں معاشرے کے لیے

ناسور بنا دیتے ہیں۔

حماد نے وہاں موجود ڈیوٹی انسپکٹر ہی کو سامان کو سیل کرنے اور ان سب مجرموں کو تھانے لے جانے کا کہہ کر عزیز کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور وہاں سے رخصت ہو کر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے راستے میں سڑک سے ہٹ کر ایک نیم تاریک جگہ رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور کسی تیسرے کی موجودگی نہ ہونے کا اطمینان کرنے کے بعد عزیز سے بولا "لیجئے جناب کھوجی صاحب! اس کیس کا بھی اختتام کرتے ہیں۔" دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنے اپنے سروں پر لگی بالوں کی وگ اور چہرے پر چڑھے ماسک کو کھینچ کر اتار کر ایک تھیلی میں رکھ کر پاس پڑے کوڑے دان میں ڈال کر آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆☆

محمد عثمان (برطانیہ)

زخمی پھول

بے موسم کی بارش مسلسل برسے جا رہی ہے۔ مارچ کا مہینہ تو بہار کی آمد کا مژدہ سناتا ہے لیکن اس سال فروری سوا خشک اور گرم رہا اور مارچ اپریل میں کھلنے والے پھول جلدی کھل گئے۔ لیکن اس مسلسل بارش نے اوائل بہار میں کھلے ہوئے نرگس اور لالے کے پھولوں کو کس بے دردی سے بھگو بھگو کر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

میں ہمیشہ تجسس میں رہتا ہوں ان پھولوں کے بارے میں جو ٹھنڈی برفیلی زمین سے نمو پا کر کھلتے ہیں۔ پھر آلودہ سبزوں میں نکھرتے ہوئے پتوں کے بیچ میں سے دھیرے دھیرے یوں سر ابھارتے ہیں۔ یوں رنگوں کی قوس وقزح بکھیرتے ہیں جیسے سردی کے موسم میں الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے کانپتے ہوئے جسموں کے چہروں پر ہولے ہولے آگ کی تپش سے سرخی سی بکھر جائے۔ پھولوں کے بارے میں یہ تجسس کب سے ہے یاد نہیں البتہ پھولوں کے مختلف رنگوں کے حوالے سے تمہارا خوبصورت چہرہ ایک عرصے تک مجھے محصور کیے رہا۔ گہرے گلابی اور سرخ پھول اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں جب تم خوشی سے تمتمایا چہرہ لیے خوشبوئیں بکھیرتی میرے ارد گرد رہا کرتی تھیں۔

اس شام دو اتفاقات ساتھ ساتھ نہ ہوتے تو شاید میرا تم سے اچانک یوں ملنا نہ ہوتا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کی پچھلی گلی میں ایک کلائنٹ سے چار بجے ملنا تھا جلدی

فراغت ہوئی تو سوچا۔ جان لوئیس کا چکر لگاؤں۔ رفیعہ کے لیے پرفیوم خریدنی تھی۔ اسٹور تک پہنچتے پہنچتے موسلا دھار بارش نے آلیا۔ اندر گھسا تو سامنے ہی تم کھڑی نظر آگئیں۔ اپنے چہرے اور بالوں کو رومال سے صاف کر رہی تھیں۔ بہت سے لوگ بارش سے بچنے کے لیے اسٹور میں آگئے تھے اور وقت گزاری کے لیے گراؤنڈ فلور کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تھے۔

تم سے بچھڑے اتنا عرصہ بیت گیا تھا۔ دس یا شاید بارہ برس۔ کہ اب تم سے ملنے کے امکان کے بارے میں سوچنا بیکار سا لگتا تھا۔ ملنا اور بچھڑنا تو مقدر کی بات ہے اور بچھڑنے کے بعد ملنے کی خواہش شاید اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ تمہیں دیکھا تو دل میں کسی پرانے درد نے جاگ کر انگڑائی لی۔ نہ چوٹ لگی نہ ٹیس اٹھی مگر ایک ان جانی سی بے چینی رگ و جاں میں پھیل گئی۔ مجھے لگتا تھا کہ ساری دنیا میں میرے سوا کوئی تمہیں اتنا نہیں چاہ سکتا۔ کیسی انوکھی چاہت تھی۔ کیسی محبت تھی۔۔۔ میں ہر گھڑی تمہارے ساتھ۔۔ تمہارے سامنے رہتے

ہوئے بھی تنگی محسوس کرتا تھا۔ بچپن سے جوانی کی سرحدوں کو چھونے تک ہم ایک جان دو قالب رہے۔ گھر میں سب چھیڑتے تھے۔۔ فراز کی شادی شاہ سے کر دیں۔ ہر وقت دونوں ساتھ رہتے ہیں اور یہ کبھی سے ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ہمارے خاندان کے بزرگوں نے ہماری نسبت کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ ابو اور تایا ابا اس فیصلے پر بہت مطمئن تھے۔۔ میری اس چاہت اور دیوانگی کا تم نے ہمیشہ مذاق اڑایا۔ جہاں میں نے ذرا سا رومانٹک ہونے کی کوشش کی وہیں تم نے لاابالی پن سے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں چڑ کر کہتا۔ پلیز شاہ! کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔ تم خوش دلی سے جواب دیتیں۔ جناب آپ بھی تو بچوں جیسی باتیں کیا کریں۔ تمھیں شاید ان جذبوں کی صداقت کی پہچان تھی جو میری خاموشی اور آنکھیں بیاں کیا کرتی تھیں لیکن اس پہچان کا تم نے کبھی اعتراف نہیں کیا۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح گھنٹوں باتیں کرتے۔ ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے رشتے ناطوں کی ان مٹ گتھیاں تھیں جنھیں سلجھانے کا ہمیں شعور تھا نہ احساس۔ تم پڑھائی میں بہت تیز تھیں اور بی اے آنرز تک پہنچ گئیں۔۔ میری ہر پڑھائی کی کتاب میں اور حروف کی جگہ تمھارا نام مجھے نظر آتا تھا۔ نتیجتاً میں انٹر میں دو بار فیل ہوا تو ابو اور تایا کے پیروں پر سوچ کی لکیریں کھنچتی چلی گئیں۔ ان لکیروں میں، میرے اور تمھارے مستقبل کے لیے جگہ جگہ سوالیہ نشان تھے۔

میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا کہ جہاں میں تمھارے سامنے بڑھ چڑھ کے اپنی محبت کا اعتراف کرتا رہا وہیں ابو اور تایا کے آگے میری زبان پر تالے لگ جاتے۔ ان ہی دنوں تمھارے لیے رشتوں کی لائن سی لگ گئی۔ کہنے والے، ملنے جلنے والے اپنے اپنے ہونہار کماؤ پوت۔ تایا کی فرزندی کے لیے پیش کرنے لگے۔ اس دن بھی ایک نیا رشتہ آیا تھا اور لڑکا امریکہ میں ڈاکٹر تھا۔ تم مجھ سے پوچھنے لگیں۔ کیا خیال ہے فراز! امریکہ چلی جاؤں؟ میں تڑپ اٹھا۔

کیا واقعی تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔۔ اور میری محبت۔۔۔؟ میں جملہ پورا نہ کر سکا۔ گلے میں جیسے کچھ اٹکنے لگا۔

تو تم مجھے روک لو۔۔۔ نہیں جاؤں گی۔ تم رسانیت سے مسکرا کر بولیں۔

میرے اختیار میں کیا تھا سوائے لفظوں کے گٹھ جوڑ کے۔ اور میرے یوں جذباتی ہونے پر تم اپنے ہلکے پھلکے موڈ میں آ گئیں۔

بس دیکھ لی تمھاری چاہت۔۔ تمھارے سامنے ہی سب کچھ ہو گا۔ اور تم مزے سے تماشا دیکھو گے کیونکہ تم صرف لفظوں کے بادشاہ ہو۔ اور لفظ صرف جذبوں کو تسکین دے سکتے ہیں۔

لفظ سچے جذبات کا اظہار بھی تو ہیں۔ میں الجھنے لگا۔

اسٹڈی میرا اور تمہارا مستقبل تو نہیں سنوار سکتے۔ تم نے یہ کہہ کر میری دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

میں واقعی لفظوں کے گٹھ جوڑ میں مصروف رہا اور تایا کے اچانک ہارٹ فیل نے ہم دونوں کے مستقبل کے دروازے پہ ایک ایسے فیصلے کی صلیب گاڑ دی جس پہ ہم دونوں کے ارمانوں کا خون جما ہوا تھا۔

تم شادی ہو کر امریکہ چلی گئیں۔ جاتے جاتے بھی تمہاری خوش دلی اسی طرح قائم تھی۔ اندر سے تم کتنی اداس تھیں میں اس کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ میں یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکا کہ اتنے برسوں میں۔۔ تم میری محبت اور چاہت کو کتنا سمجھ پائی تھیں۔ میں تو بس دیوانہ وار تمہیں اپنی اٹوٹ محبت کا یقین دلاتا رہا۔ شاید میں نے خودکشی کی بھی دھمکی دی تھی۔

اس دن تمہاری آنکھوں میں اداسی تھی۔۔ کہ شکایت تھی۔۔۔ یا صرف آنے والی جدائی کا کرب۔۔۔
تمہاری آنکھوں کا رنگ ان تمام جذبات سے گھل مل کے عجیب سا ہو گیا تھا۔۔ اور ان میں نمی اور سرخی کا انوکھا حسین امتزاج تھا۔

تم سے بچھڑے ہوئے اتنے برس بیت گئے۔ میں نے خودکشی تو نہیں کی۔ دل لگا کر پڑھا۔ تمہارے عشق کو بھلانے کے لیے ایک اور عشق کر بیٹھا۔ رفیعہ سے محبت اور شادی جلدی جلدی ہوئے۔ میں دوبئی چلا آیا۔۔ اچھی نوکری۔۔ خوبصورت بیوی۔۔ دو پیارے پیارے بچے۔ میرا مستقبل تابناک بن چکا تھا۔ بزنس کے سلسلے میں امریکہ اور لندن کا چکر بھی لگتا تھا۔ اس دفعہ خاص طور سے رفیعہ اور بچوں کو لے کر لندن آیا تھا تاکہ گھومنا پھرنا اور شاپنگ ہو سکے۔ تم سے اچانک اس طرح ملاقات ہوگی۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب جان لیمس کے گراؤنڈ فلور پہ تمہیں سامنے پایا۔ تم اپنے چہرے سے پانی پونچھ رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے یادوں کی حسین تصویر پہ سے برسوں کی پڑی ہوئی گرد صاف ہو رہی ہو۔ تم نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مسکرا کر آگے بڑھیں۔

فراز! یہاں کہاں؟ کیسے ہو۔۔ بیوی بچے کہاں ہیں؟ تم نے ایک ہی سانس میں سوال کر ڈالے۔

میں نے بتایا۔ کام کے سلسلے میں آیا ہوں اور فیملی بھی ساتھ ہے۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے مین انٹرنس کے سامنے آ گئے۔

مجھے خیال آیا کہ تمہارے بارے میں بھی تو پوچھوں کیونکہ تمہاری شادی کے بعد میں تمہاری طرف سے بالکل انجان بن گیا تھا۔ کوئی تمہارا ذکر بھی کرتا تو میں کان بند کر لیتا تھا۔ اب میں بڑے مہذب طریقے سے تمہارا حال احوال پوچھ رہا تھا۔

'اور سناؤ!! تمہارے ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے۔ بچے کتنے ہیں؟'

تمہارے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرا گیا۔ سب اچھے ہیں۔۔ ٹھیک ہیں۔۔۔ ہم آج کل لندن آئے

ہوئے ہیں۔ ان کو کسی کانفرنس میں شرکت کرنی ہے۔

ایک ہفتے میں واپس چلے جائیں گے۔

مجھے لگا تم اپنے بارے میں تفصیل بتانے سے ہچکچا رہی ہو۔ میں نے تمہارے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ چہرہ۔۔۔ وہ آنکھیں۔۔ جنہیں میں دیوانہ وار چاہتا تھا۔ گزرتے ہوئے وقت کی سنگین چھاپ سے کتنے بدل گئے تھے۔ چہرے کی رنگت ہلدی جیسی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ وہ سرخ گلاب جیسا چہرہ حالات کی تپتی دھوپ میں کملا کر رہ گیا تھا۔ آج جب میں تیار ہو کر نکل رہا تھا تو رفیعہ نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا اس کالے سوٹ میں تم کتنے ہینڈسم اور ینگ لگ رہے ہو۔ بچ کے رہنا کسی میم کی نظر نہ لگ جائے۔ میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ اور اترا سا گیا تھا۔

پھر تمہارے روشن مستقبل کو کس کی نظر لگ گئی۔ مجھے اچانک محسوس ہوا تم دکھی ہو۔ بے حد دکھی۔۔۔

تم۔۔ تم خوش ہو نا اپنی زندگی میں۔۔۔۔۔؟ میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

مطمئن ہونے کی حد تک خوش۔ تمہارا مختصر جواب مجھے اور وسوسوں میں مبتلا کر گیا۔

تم مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔ اور تم؟ مجھے تو خوش ہی نظر آ رہے ہو۔ دیکھو۔ خود کشی نہیں کی تو فائدے ہی میں رہے۔۔

مجھے اپنی دیوانگی۔۔ محبت۔۔ خودکشی کی دھمکی۔۔ سب باتیں یاد آنے لگیں۔

'بس زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سو گزار رہا ہوں۔ مجھے خود اپنے کہے ہوئے الفاظ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بیوی۔۔ بچے۔۔ نوکری۔ سب کچھ ہے۔۔ پھر بھی زندگی گھسٹ رہی ہے۔۔ میں نے خودکشی تو نہیں کی مگر خوشی کے ہر جذبے کا وقت سے پہلے ہی گلا گھونٹ دیا۔ تمہارے بغیر شنا! یہ زندگی۔۔ زندگی نہیں رہی۔۔۔ سب بیکار ہے۔ میں اپنی جذباتی تقریر پر خود بھی حیران تھا۔

تمہاری آنکھوں میں اچانک وحشت سی عود آئی۔۔ اور تم لڑکھڑا کر گرنے سی لگیں۔۔ میں نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو تم نے قریبی دیوار کے ساتھ ٹکتے ہوئے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔

'تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔

نو۔۔ نو۔۔۔ نو۔۔؟ تم اتنی زور سے چلائیں کہ آس پاس کے لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

کیا بات ہے شنا؟ اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

سوری فراز! تم نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ آئی ایم سوری۔۔ مجھ سے وعدہ کرو تم نہ تو میرے گھر آؤ گے اور نہ مجھ سے ملنے کی کوشش کرو گے۔

مگر کیوں؟ میں اب بھی حیران تھا۔ آخر میں تمہارا کزن ہوں۔ رشتہ دار ہوں۔

او میرے خدا! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم نے باہر نظر ڈالی۔ بارش اب بھی تواتر سے ہو رہی تھی۔

اگر تم جلدی میں نہیں ہو تو یہاں کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھ سے اب کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔

ہم ہال وے ان کے ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں چائے لے آیا۔ تم چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتی رہیں اور میں تمہیں دیکھتا رہا۔ ہم چائے پر کتنا شور مچاتے تھے۔ بے سرو پا باتیں۔ لڑائی جھگڑے۔۔۔ روٹھنا۔ منانا۔ چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں یادیں ہلکورے لینے لگیں۔

پھر تم نے خاموشی کا قفل توڑا۔ ڈاکٹر رفیق بہت اچھے انسان ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کے دو رخ ہیں۔۔ شادی کے شروع کے تین سالوں میں ان کی زندگی کا اچھا رخ دیکھا۔۔ نیک۔۔ پرخلوص بے انتہا considerate۔ انھوں نے مجھے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ امریکہ میں ان کے کئی ناکام معاشقے رہے۔ ایک لڑکی سے تو منگنی تک ہو گئی تھی لیکن کسی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ کیا وجہ تھی؟ انھوں نے بتایا نہ میں نے پوچھا۔ میں بھی تو بچپن سے تمہاری مانگ تھی اور گھر والوں نے انھیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے بھی اپنی زندگی کی بچی کھچی باتیں انھیں سنا دیں۔ ہماری بچپن کی نسبت۔ تم پڑھ لکھ جاتے ابا جان کا یوں اچانک انتقال نہ ہوتا تو ہماری شادی ہو جاتی۔ اس وقت۔ رفیق مجھے بہت liberal آدمی لگے۔ کبھی تمہارا ذکر ہوتا تو چھیڑتے۔ نہ جانے فراز صاحب کا کیا حال ہوگا۔

اور ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو؟ میری بے چینی میرے سوال میں مترشح تھی۔

تم جواب دینے کے بجائے مجھ سے پوچھنے لگیں۔ فراز! تمہیں ممو ماما کا بڑا لڑکا شاہد تو یاد ہوگا؟؟

ہاں۔ وہ اچکا سا بدتمیز لونڈا۔ جس نے خاندان کی ہر لڑکی کو چھیڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ بس تم سے بہت ڈرتا تھا۔

وہ امریکہ گرین کارڈ کے چکر میں آیا تھا۔ کاش وہ ہمارے گھر نہ آتا۔ اس نے رفیق سے میرے اور تمہارے لیے ایسی ایسی من گھڑت باتیں کہیں کہ انھیں دہراتے ہوئے بھی مجھے گھن اور شرم آتی ہے۔ وہ چند روز رہا اور ہماری زندگی میں زہر گھول کے چلا گیا۔۔۔ پھر۔۔۔ میں نے رفیق کی شخصیت کا دوسرا اور بھیانک روپ دیکھا۔ شک۔۔ حسد۔۔ اور جلن یکجا ہو جائیں تو انسان کے سوچنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔

اس روز انھوں نے بے تحاشہ شراب پی رکھی تھی حالانکہ وہ صرف پارٹی وغیرہ میں ڈرنک کرتے ہیں۔ وہ شاہد کی کہی ہوئی باتیں دہراتے رہے۔ میں کبھی ہنس کر۔۔ کبھی غصے سے ان باتوں کو ٹالتی رہی۔ پھر

اچانک ان پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی ۔اور ۔۔اور ۔۔۔تم نے بات ادھوری چھوڑ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔اس نے تم پر ہاتھ اٹھایا؟ ۔میں ساری جان سے لرز اٹھا۔

میں تو پہلے ہی ادھ موئی ہو چکی تھی ۔الفاظ کے برچھے ۔۔الزامات کے تیر میرے ذہن و دل اور جسم کو چھلنی کر چکے تھے ۔میں اب سوچتی ہوں ۔کاش!اس دن وہ میرا گلا گھونٹ دیتے ۔لیکن موت کا خوف انسان کو بہت کمزور اور ڈرپوک بنا دیتا ہے ۔۔میری آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑ رہی تھیں۔

ان کے ہر الزام کے جواب پر نہیں ۔نہیں کے بجائے ہاں ۔ہاں نکلنے لگا ۔۔وہ رات میری زندگی کی سیاہ ترین رات تھی ۔میں نے زخموں سے چور بدن کو گھسیٹا اور بھاگ کر ننھی بچی کے کمرے میں پناہ لی ۔وہ شاید اس کا بھی گلا گھونٹ دیتے اگر میں اندر سے دروازہ لاک نہ کر لیتی ۔

.میں غصے سے کانپنے لگا ۔تم پر اتنی قیامت گزر گئی اور تم نے کسی کو کچھ نہیں بتایا ۔۔چلو میرے ساتھ ۔۔ابھی لے چلو ۔اس ڈاکٹر کے پاس ۔

میں کھڑا ہو گیا۔

پھر وہی جذباتیت ۔۔بچوں والی باتیں ۔۔۔بیٹھ جاؤ فراز ۔تم اب کافی نارمل نظر آ رہی تھیں ۔

رفیق کی لغت میں محبت کے ہر جذبے کی ابتدا جسمانی کشش سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام جسمانی آسودگی پر ہوتا ہے ۔روحانی جذبے ،پاک محبت ان کے نزدیک بے معنی الفاظ ہیں کیونکہ ان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ کچھ اور کہتا ہے ۔ہم جسے وحشت کا نام دیتے ہیں وہ ان کے نزدیک زندگی کا فطری تقاضہ ہے ۔

محبت کی اتنی تذلیل ۔۔ایسا گھناؤنا الزام ۔۔۔میں تڑپ کر رہ گیا ۔یہ سب تم نے کیوں برداشت کیا ؟اور تمہاری بیٹی ؟

فرح بہت پیاری بچی ہے ۔مغربی ممالک میں طلاق یافتہ ایشین عورت اور ایک بچی کی ماں کو سو طرح کے مسئلے ہیں ،تنہا زندگی گزارنا بہت مشکل ہے ۔پھر فرح کے مستقبل کا بھی سوال ہے ۔

'کیا اب بھی مار پیٹ کرتا ہے ؟'میرے ہونٹوں پر یہ سوال دیر سے مچل رہا تھا۔

'اس سیاہ رات کے بعد انھوں نے کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا ۔میں نے طلاق نہیں لی لیکن ان کو اپنی دنیا سے بے دخل ضرور کر دیا ۔ہمارے درمیان ایک سرد جنگ جاری ہے ۔ایک خاموش محاذ ہے ۔وہ اپنے ہوسپٹل ،مریضوں اور طب کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور میری توجہ کا مرکز فرح ہے ۔

تم بولتے بولتے رک گئیں۔

ارے فراز !تم رو رہے ہو ؟مرد ہو کر ۔۔؟مرے ہوؤں کا ماتم کرتے ہیں ابھی تو میں زندہ ہوں ۔۔

اچانک تمہارے لہجے میں تلخی آ گئی۔ یہی تو میری زندگی کا المیہ ہے۔ تم نے اپنی بزدلی اور کمزوری کا یوں مظاہرہ کیا کہ مجھے اور میری محبت کو کسی اور کے حوالے کر دیا۔ رفیق کی بزدلی کی انتہا یہ ہے کہ ایک بے بس اور کمزور عورت کو جبر و تشدد کی اس منزل تک پہنچا دیا جہاں سچ بھی خوف زدہ ہو کر جھوٹ بن جاتا ہے۔ تم دو بزدلوں کے بیچ میری بے لوث اور سچی محبت کا دم گھٹ گیا۔

اور تم اب بھی میرے ساتھ جانا چاہتے ہو۔

تم نے اسٹور سے باہر نظر دوڑائی۔ دیکھو۔۔ کتنی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ پھر سے بادل آئے۔ جی کھول کر برسے اور نہ جانے کس سمت اڑ گئے۔

تم نے جان لوئیس سے باہر نکل کر اپنی چھتری کھول لی۔ بارش اب ہلکی ہو چلی تھی۔

مجھے اب گھر جانا چاہیے۔ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب تم بھی جاؤ۔

تم تیزی سے آگے بڑھیں اور بہتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں کھو گئیں۔

میں تیز بارش کے شور میں اپنے اندر کے شور کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ آج مجھے معلوم ہوا۔ تمہارے دل میں میرے لیے محبت کا جذبہ کتنا گہرا تھا۔ اور میں نے اس جذبے کو خود بھی مجروح کیا اور دوسرے بھی اسے لہولہان کرتے رہے۔ ہم دونوں کے پیار کی پیمائش کو میں نے خود پر شروع کیا اور خود پر ہی ختم کر دیا۔ اور اس پیمائش کے جھوٹ سچ کے میزان پر صرف تمہاری محبت تولی گئی اور جانتے بوجھتے ہوئے جھوٹ کے بھاری وزن کے نیچے کچلی گئی۔۔۔ کیا یہ سب باتیں میں رفیعہ کو بتا سکوں گا۔۔؟ کیا میں تمہاری طرح سچ بولنے کی ہمت رکھتا ہوں؟

میری بزدلی کا المیہ تو یہ ہے کہ جب میں واقعی محبت کے جذبوں میں محصور تمہارا دیوانہ تھا تو تم میرے سچ کو جھوٹ سمجھتی رہیں۔۔۔ اور آج نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے تم سے جھوٹ کہا اور تم نے اسے سچ سمجھ لیا۔

بارش تیز ہو چلی ہے۔ نرگس اور لالے کے پھولوں کی نرم و نازک پتیاں بھیگی ہوئی زمین پر بکھری پڑی ہیں۔

☆☆☆☆

طارق محمود مرزا (سڈنی، آسٹریلیا)

سوق الوقف، لذت اور ذائقہ

سوق الوقف دوحہ کا قدیم ترین اور روایتی تاریخی بازار ہے۔ سوق کے معنی بازار اور وقف کا مطلب رُکنا ہے۔ اس بازار کا ذکر قطر کی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ سوق الوقف میں داخل ہوئے تو جیسے قدیم دور میں آ گئے۔ تنگ گلیاں، چھوٹی چھوٹی دکانیں، انواع و اقسام کی اشیائے فروخت، ریستوران، قہوہ خانے، گاؤ تکیہ والے چائے خانے جس میں حقہ، کھجوریں اور روایتی عربی قہوے کے ساتھ دیگر اشیائے خورد و نوش دستیاب تھیں۔ ہم نے اپنے بیگ باہر کے واقف کار ایک پشتون دکان دار کے پاس رکھ دیے اور خود ان تنگ اور پیچ دار گلیوں میں گھومنا پھرنا شروع ہو گئے۔ گرمی کافی تھی مگر ہم نے برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ بازار کے اندر چھوٹی سی مسجد نظر آئی تو ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ دوپہر کے ان گرم اوقات میں گاہک خال خال تھے۔ دکان دار بھی سستا رہے تھے۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میں تو صدیوں قدیم اس تاریخی بازار میں قطریوں کا روایتی طرز حیات اور قدیمی طرز تجارت دیکھنے کا متمنی تھا۔ یہ بازار اور یہ گلیاں جو صدیوں پرانی قطری تہذیب کی عکاسی کر رہے تھے۔ جب قرب و جوار سے اونٹوں پر بیٹھ کر لوگ اس بازار میں خریداری کی غرض سے آتے تھے۔ سمندر کے قرب کی وجہ سے یہ بین الاقوامی تاجروں اور سیاحوں کا بھی مرکز تھا۔

بظاہر یہ بازار دو تین سو سال قدیم ہے مگر یہ چند برس قبل بنایا گیا ہے۔ تاہم سوق الوقف صدیوں سے دوحہ میں موجود تھا اور اسی شکل میں تھا۔ اصل اور قدیم سوق الوقف یہاں سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ نئے مقام اور نئے سرے سے بنانے میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا کہ اس کے روایتی خدوخال اور تاریخی ہیئت متاثر نہ ہو۔ پھر بھی اس میں کچھ جدید سہولیات جیسے ایئر کنڈیشنڈ [illegible] اور زیر زمین پارکنگ کا اضافہ کیا گیا۔ اس کی گلیاں تنگ اور زیادہ تر چھتی ہوئی ہیں جو اس جھلساتی دھوپ میں ہمارے لیے بہترین سائبان ثابت ہوئیں۔

سوق الوقف سمیت یہ علاقہ تفریحی اور سیاحتی مرکز ہے۔ سامنے سمندر کے کنارے خوبصورت و دلکش پارک ہے۔ یہ سب سے مقبول ساحلی پارک ہے جو شام اور رات کے وقت عوام الناس سے بھرا ہوتا ہے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مشہور اسلامک میوزیم ہے۔ اسی وجہ سے سوق الوقف یہاں بنایا گیا۔ بتایا گیا، قدیم سوق الوقف جسے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا۔ اس میں کوئی ظاہری تبدیلی نہیں کی گئی۔ ویسی ہی تنگ، تاریک اور

قدرے ٹھنڈی گلیوں میں گھومتے گھومتے ہم ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھے۔ اس میں روایتی عربی قالین اور گاؤ تکیے تھے۔ پتلون قمیص میں ہونے کے باوجود یہاں بیٹھنے میں راحت محسوس ہوئی۔ گوہر نے مٹی کی ایک صراحی سے مٹی کے پیالے میں پانی انڈیلا اور میرے آگے رکھا۔ پانی ٹھنڈا اور شیریں تھا۔ ایک مرتبان میں کھجوریں تھیں ایک تھرماس میں قہوہ تھا۔ ہم نے چند کھجوریں کھائیں۔ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں سیاہ قہوہ انڈیلا۔ قہوہ اگرچہ کڑوا تھا مگر میرے لیے نیا نہیں تھا۔ قیام عمان کے دوران میں اکثر نوش جان کرتا رہتا تھا۔ اس لیے چند گھونٹ کی پیالی ختم کرنے میں دقت نہ ہوئی۔

اس قہوہ خانے میں ایئر کنڈیشنر نہیں تھا مگر پھر بھی گرمی نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی اس کی چھت مٹی اور گھاس پھونس سے بنی تھی اور در و دیوار پر سبز بیلیں تھیں۔ اس بازار کی جملہ دکانیں اسی قدیم طور سے بنی ہیں۔ یہ حکومت قطر کی قابل ستائش کوشش ہے کہ انھوں نے اس روایتی طرز تعمیر اور تاریخی ورثے کو قائم رکھا ہے۔

ہمارے علاوہ دو قطری کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ ایک نے عربی میں کچھ کہا۔ گوہر نے بتایا۔ وہ پوچھ رہا ہے آپ کچھ کھائیں گے؟

میں نے کہا۔ آپ کی مرضی ہے تو کچھ لے لیتے ہیں۔ ویسے مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں نے صبح جتنے انڈے اور پراٹھے کھائے تھے وہ اتنی جلدی ہضم ہونے والے نہیں تھے۔ گوہر نے کہا۔ میں بھی کھانا کھا کر آیا ہوں۔

ہم نے قطری دکاندار کو منع کر دیا۔ وہ پھر گفتگو میں منہمک ہو گئے۔ ادھر گوہر نے سگریٹ سلگائی اور تکیے سے ٹیک لگا کر مزے سے دھواں اڑانے لگا۔ میں حیران ہوا کیونکہ عرصہ ہوا کسی کو کمرے کے اندر سگریٹ نوشی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ آسٹریلیا اور یورپ میں ریستوران، دفتر، اسٹیشن، حتیٰ کہ کسی بھی عمارت کے اندر سگریٹ نوشی کی مکمل ممانعت ہے۔ حتیٰ کہ کھلی جگہ پر بھی جہاں لوگ موجود ہوں سگریٹ نہیں پی سکتے۔ قہوہ خانے میں حقہ اور شیشہ بھی موجود تھا۔ بلکہ تمام ریستورانوں میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ ہم بہرحال ان سے دور رہے۔ قہوہ خانے سے اُٹھے تو میں کاؤنٹر پر گیا اور بل طلب کیا۔ قطری میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں سمجھا اُسے انگریزی سمجھ نہیں آئی لہٰذا عربی میں کہا۔ کم ریال (کتنے ریال)۔ اس کی حیرت بدستور قائم تھی۔ اتنی دیر میں گوہر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ سر چلیں۔ میں نے کہا۔ مگر ہم نے کھجوروں اور قہوے کا بل ادا نہیں کیا۔

وہ پھر بولا سر چلیں۔ میں حیران ہو کر چل پڑا۔ باہر نکل کر گوہر نے بتایا۔ اس طرح کے قہوہ خانوں میں کھجوریں اور قہوہ مفت ہوتا ہے۔ یہ عربوں کی روایت ہے۔ اپنے مہمان کی کم از کم ان دو چیزوں سے تواضع ضرور کرتے ہیں۔

ان کی مہمان نوازی کی روایت سے میں بھی آشنا تھا۔ میری حیرت اس وجہ سے تھی کہ یہ گھر نہیں قہوہ

قدرے ٹھنڈی گلیوں میں گھومتے گھومتے ہم ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھے۔ اس میں روایتی عربی قالین اور گاؤ تکیے تھے۔ باہر کی تپش میں ہونے کے باوجود یہاں بیٹھنے میں راحت محسوس ہوئی۔ گوہر نے مٹی کی ایک صراحی سے مٹی کے پیالے میں پانی انڈیلا اور میرے آگے رکھا۔ پانی ٹھنڈا اور شیریں تھا۔ ایک مرتبان میں کھجوریں تھیں ایک تھرماس میں قہوہ تھا۔ ہم نے چند کھجوریں کھائیں۔ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں سیاہ قہوہ انڈیلا۔ قہوہ اگرچہ کڑوا تھا مگر میرے لیے نیا نہیں تھا۔ قیام عمان کے دوران میں اکثر نوش جان کرتا رہتا تھا۔ اس لیے چند گھونٹ کی پیالی ختم کرنے میں دقت نہ ہوئی۔

اس قہوہ خانے میں ایئرکنڈیشنر نہیں تھا مگر پھر بھی گرمی نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی اس کی چھت مٹی اور گھاس پھونس سے بنی تھی اور در و دیوار پر سبز بیلیں تھیں۔ اس بازار کی تمام دکانیں اسی قدیم طور سے بنی ہیں۔ یہ حکومت قطر کی قابل ستائش کوشش ہے کہ انھوں نے اس روایتی طرز تعمیر اور تاریخی ورثے کو قائم رکھا ہے۔
ہمارے علاوہ دو قطری کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ ایک نے عربی میں کچھ کہا۔ گوہر نے بتایا، وہ پوچھ رہا ہے آپ کچھ کھائیں گے؟
میں نے کہا۔ آپ کی مرضی ہے تو کچھ لے لیتے ہیں۔ ویسے مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں نے صبح جتنے انڈے اور پراٹھے کھائے تھے وہ اتنی جلدی ہضم ہونے والے نہیں تھے۔ گوہر نے کہا۔ میں بھی کھانا کھا کر آیا ہوں۔
ہم نے قطری دکاندار کو منع کر دیا۔ وہ پھر گفتگو میں منہمک ہو گئے۔ ادھر گوہر نے سگریٹ سلگائی اور تکیے سے ٹیک لگا کر مزے سے دھواں اڑانے لگا۔ میں حیران ہوا کیونکہ عرصہ ہوا کسی کو کمرے کے اندر سگریٹ نوشی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ آسٹریلیا اور یورپ میں ریستوران، دفتر، اسٹیشن، غرضیکہ کسی بھی عمارت کے اندر سگریٹ نوشی کی مکمل ممانعت ہے۔ حتیٰ کہ کھلی جگہ پر بھی جہاں لوگ موجود ہوں سگریٹ نہیں پی سکتے۔ قہوہ خانے میں حقہ اور شیشہ بھی موجود تھا۔ بلکہ تمام ریستورانوں میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ ہم بہر حال ان سے دور رہے۔ قہوہ خانے سے اٹھے تو میں کاؤنٹر پر گیا اور بل طلب کیا۔ قطری میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں سمجھا اسے انگریزی سمجھ نہیں آئی لہٰذا عربی میں کہا۔ کم ریال (کتنے ریال)۔ اس کی حیرت بدستور قائم تھی۔ اتنی دیر میں گوہر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ سر چلیں۔ میں نے کہا۔ مگر ہم نے کھجوروں اور قہوے کا بل ادا نہیں کیا۔
وہ پھر بولا سر چلیں۔ میں حیران ہو کر چل پڑا۔ باہر نکل کر گوہر نے بتایا۔ اس طرح کے قہوہ خانوں میں کھجوریں اور قہوہ مفت ہوتا ہے۔ یہ عربوں کی روایت ہے۔ اپنے مہمان کی کم از کم ان دو چیزوں سے تواضع ضرور کرتے ہیں۔
ان کی مہمان نوازی کی روایت سے میں بھی آشنا تھا۔ میری حیرت اس وجہ سے تھی کہ یہ گھر نہیں قہوہ

جانا تھا۔ قیامِ عمان کے دوران میں نے بہت کھجوریں کھائی تھیں اور کڑوا قہوہ پیا تھا۔ دراصل ہمارے ساتھ کام کرنے والے عمانی گھر سے کھجوریں اور قہوہ ضرور لاتے تھے۔ ہر دو چار گھنٹے بعد زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھتے، اردگرد موجود ہر فرد کو با اصرار بلاتے، کھجوریں نکالتے، چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں قہوہ انڈیلتے اور قہوہ نوشی کے ساتھ اپنے گھروں میں غیر ملکی ملازماؤں کے بارے میں چٹکلے لے لے کر باتیں کرتے۔ جس طرح کھجوریں اور قہوہ ان کے لیے ضروری تھا اسی طرح حرمہ (عورت) کا ذکر بھی لازم تھا۔ دوسری شادی کی خواہش اور کوششوں کا تذکرہ کرتے۔ جس کی پہلے سے دو بیویاں ہوتیں وہ تیسری کی تگ و دو میں ہوتا اور جس کی تین ہوتیں وہ چوتھی کے ارمان میں ہوتا۔ عمان میں شادی کرنے کے لیے مرد کے پاس اتنا پیسہ ہونا چاہیے کہ وہ عورت خرید سکے۔ جس کے پاس وافر پیسہ ہوتا اس کی لازماً چار بیویاں ہوتیں۔ بیویوں کے علاوہ انھوں نے فلپائن، سری لنکا اور بھارت سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو گھروں میں ملازم رکھا ہوا ہے۔ بعض ملکوں میں تقریباً ہر صاحب حیثیت نے ایسی ملازمائیں رکھی ہیں جو دراصل ان کی داشتائیں ہوتی ہیں۔ یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ صرف قطر میں لاکھوں عورتیں اس کام پر مامور ہیں۔

جہاں تک شادی کا تعلق ہے اس میں عمر کا خیال بالکل نہیں رکھا جاتا۔ بس مرد کے پاس پیسا ہونا چاہیے۔ اس کی جو بھی عمر ہو وہ جوان لڑکی سے شادی رچا سکتا ہے۔ میں نے ساٹھ ستر سال کے بڈھوں کو دس بارہ سال کی کم سن لڑکی سے شادی رچاتے دیکھا ہے۔ جن کے پاس اتنا پیسا نہیں ہوتا کہ وہ دوسری اور تیسری شادی کر سکیں وہ اپنی عمر کے بوڑھوں کے ساتھ بیٹیوں کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے ایک عمانی ڈرائیور کی عمر پچپن برس تھی۔ اس نے ایک دوست کے ساتھ سودا کیا۔ دوست کے ہاتھ میں اپنی تیرہ برس کی بیٹی کا ہاتھ دیا اور بدلے میں اس کی بارہ برس کی بیٹی بیاہ لایا۔ وٹے سٹے کی شادی تو دیکھتے اور سنتے آئے تھے مگر یہ ادلا بدلا میرے لیے نیا تھا۔

ہم سوق الواقف کی ٹیڑھی میڑھی، تنگ، چھتی ہوئی گلیوں میں آگے سے آگے جا رہے تھے۔ یہاں رنگ برنگی اشیا فروخت ہو رہی تھیں۔ ان میں قطر کے سووینئر، سجاوٹی اشیا، عربی رومال، قندورے، مصنوعی زیورات، مقامی و غیر مقامی ملبوسات، قسم قسم کے تحائف، طرح طرح کے نوادرات، نقشین ظروف، قہوے اور چائے کی دلکش پیالیاں، قرآنی طغرے، خواتین کی سجاوٹ کی اشیا اور ملبوسات، بناوٹی پھول، گھروں کی سجاوٹ کی بے شمار چیزیں موجود تھیں۔ پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی، فلپائنی، نیپالی دکانوں میں ان کے ملک اور تہذیب و تمدن کی مناسبت سے دلکش اشیائے سجاوٹ و تحائف موجود تھے۔ علاوہ ازیں خشک میوہ جات، اشیائے خورد و نوش، پھل، قسم قسم کی کھجوریں اور ظروف کی دکانیں اس بازار کا حصہ تھیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں اتنی بھی سجی اور

رنگین تھیں کہ رنگ ہی رنگ بکھرے نظر آتے تھے۔

آگے چل کر ہم نے جیتے جاگتے، بولتے اور چہکتے ہوئے رنگوں کی دنیا دیکھی۔ یہ انواع و اقسام کی رنگین چڑیاں تھیں۔ سیکڑوں، ہزاروں چڑیاں پنجروں میں بند اس طرح چہک رہی تھیں کہ طیور سے بھرے جنگل کا گمان ہوتا تھا۔ ان پنجروں میں نیلا، سبز، جامنی، سفید، خاکستری، تیتری، سیاہ، بھورا، نارنجی، سرخ، پیلا، سنہرا ہر رنگ نظر آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ قدرت نے اپنی اس ننھی اور نازک مخلوق کے ذریعے کارخانۂ قدرت کے تمام رنگ فضاؤں میں بکھیر دیے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت انسان نے فضاؤں میں بکھری چہکتی چہکار قفس میں بند کر دی ہے۔

اگلی دکانوں میں بے شمار اقسام اور رنگوں کے طوطے تھے۔ جو دنیا کے مختلف ملکوں سے لائے گئے تھے۔ مختلف شکلوں کے نیلے، سبز، جامنی، سرخ اور زرد رنگ کے یہ طوطے پنجروں میں بند گلی میں گزرنے والے افراد کو حسرت و یاس سے دیکھتے تھے۔ کئی طوطے ہیلو، مرحبا، سلام اور دیگر الفاظ بولتے تھے۔ طوطوں کی کئی دکانیں سوق الوقف کا حصہ ہیں۔ چند دکانیں کچھوؤں کی بھی تھیں جہاں چھوٹے چھوٹے سیکڑوں کچھوے رینگ رہے تھے۔ ایک دکان میں باز اور عقاب بھی تھے۔ گول گول آنکھوں، مضبوط پنجوں اور خاکستری رنگت کے یہ عقاب لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے۔ کئی قطری اور دیگر لوگ کھڑے ان کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ دو ایک دکان دار سے ایک باز کا سودا کر رہے تھے۔

ایک پاکستانی دکان میں پاکستان کی خصوصی مصنوعات جیسے رنگ برنگے ازار بند، موتیوں سے سجے پراندے، رنگین چوڑیاں، خواتین کے میک اپ کی اشیا، تبت کریم، ناظم پوڈر، نسوار، تمباکو، حقہ، روح افزا، ہاتھ سے بنی سویاں، سوہن حلوہ، پاکستان کے معروف مقامات کے دھاتی مجسمے، تصاویر، بچوں اور خواتین کے ملبوسات، پشاوری چپل اور دیگر بے شمار پاکستانی مصنوعات برائے فروخت تھیں۔ دکان دار کا تعلق خیبر پختون خواہ سے تھا اور گوہر کا واقف کار تھا۔ اس نے فوراً چائے منگوائی اور ساتھ پاکستان کے بنے بسکٹ پیش کیے۔

پاکستان کے بسکٹ تو لذیذ تھے ہی مگر چائے گرم، خوشبودار اور مزے دار تھی۔ لیکن چھوٹی سی پیالی میں اور صرف چند گھونٹ تھی۔ دکان دار شام کے کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے شکریے کے ساتھ معذرت کر لی کیونکہ آج شام کچھ ادبی احباب سے ملاقات طے تھی۔ سوق الوقف بہت بڑا، دلچسپ اور رنگینیوں سے عبارت بازار ہے۔ ہم نے کئی گھنٹے یہاں گزار دیے پھر بھی دل نہیں بھرا۔ مگر کئی گھنٹے چلنے اور کھڑے رہنے کے بعد میں تھک چکا تھا۔ اس لیے گوہر چشتی سے کہا کہیں چل کر بیٹھتے ہیں اور اگر ایسی چائے کی ایک ایک پیالی اور مل جائے تو کیا بات ہے۔

وہ چھوٹا سا چائے خانہ پاس ہی تھا جہاں سے ہمارے پٹھان دوست نے چائے منگوائی تھی۔ اس کے اندر بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ گوہر نے چائے کا آرڈر دیا اور مجھے لے کر باہر ایک وسیع احاطے میں آ گیا۔ اس صاف ستھرے پختہ صحن میں جگہ جگہ بنچ رکھے تھے۔ جہاں سیاح بیٹھے سستا رہے تھے۔ ان میں یورپین مرد و زن کا ایک گروپ تھا۔ صحن میں انسانوں کے ساتھ ساتھ درجنوں کبوتر بھی موجود تھے۔ لوگ انھیں دانہ ڈالتے تو وہ دانہ ڈالنے والے شخص کے سر اور کاندھوں پر آ بیٹھتے۔ ٹریفالگر اسکوائر لندن کی طرح یہ کبوتر انسانوں سے گھلے ملے تھے۔ تھوڑی دیر میں چائے خانے کا ملازم جو ٹی شرٹ اور لنگی میں ملبوس تھا چائے کی چینک، دو پیالیاں اور ساتھ دودھ اور انڈے کی آمیزش کے ساتھ فرائی کیے گئے فرنچ ٹوسٹ لے آیا۔ گوہر نے بتایا۔ اس دکان کی چائے اور ٹوسٹ پورے دوحہ میں مشہور ہے۔

دن بھر کی گرمی اور تھکاوٹ کے بعد سہ پہر کے ان خوشگوار لمحات میں اور اس دلکش سیاحتی مقام پر چائے جب پیالی میں انڈیلی تو اس کی بھاپ اور خوشبو سارے صحن میں پھیل گئی۔ ہمارے ارد گرد بیٹھے یورپی سیاح یہ خوشبو سونگھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ستائش و طلب تھی۔ چائے کا ایک ایک جرعہ جسم و روح کو فرحت پہنچا رہا تھا۔ گرم اور شیریں سیال دہن سے حلق میں اتر جاتا اور ایک انوکھے ذائقے سے آشنا کرتا جاتا تھا۔ ایک ایک گھونٹ سے حرارت، خوشبو اور توانائی کی لہریں جسم و جاں میں اترتی محسوس ہوتی۔ چائے، پتی اور دودھ کی فن کارانہ آمیزش سے فرحت، ذائقے اور خوشبو کی نئی جہت وجود میں آئی تھی۔ جس فنکار نے ذائقوں کی دنیا میں یہ نئی تخلیق کی تھی اس کا ہاتھ چومنے کو جی چاہتا تھا۔ اس خوشبودار لذیذ چائے کے ساتھ ساتھ فرنچ ٹوسٹ بھی مظہر کمال تھی۔ دودھ، چینی اور انڈے کی آمیزش کی ہلکی تہہ بریڈ پر اس مہارت سے جمائی گئی کہ خستگی اور ذائقے کی انوکھی قسم وجود میں آ گئی۔ یوں سوق واقف میں ایک چھوٹے سے چائے خانے کے مالک نے اپنے کمال فن کا ایسا جادو جگایا کہ ایک نئے اور منفرد ذائقے سے روشناس کرایا۔ اس کی بنائی چائے اور ٹوسٹ نے قطر کی پہلی شام میں رنگ بھر دیے تھے۔ آج کئی ماہ بعد جب یہ حروف تحریر کر رہا ہوں تو وہ لذت، وہ ذائقہ، وہ فرحت اب بھی محسوس کر رہا ہوں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی (قاہرہ، مصر)

گپ شپ

بلا شبہ گپ شپ ایک ایسی خصوصیت ہے، جو ہمیشہ خواتین کی فطرت کی وجہ سے ان کے قریب رہی ہے جس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے معاملات کی وضاحت کے لیے زیادہ الفاظ استعمال کریں۔ کیونکہ وہ اکثر شکایتیں کرتی ہیں۔ عورت اگر نہ بولے گی تو وہ کئی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اسے بولنے دیا جائے۔ گپ شپ میں عورت کا مسئلہ تکرار ہے۔ یعنی وہی الفاظ جو وہ دہراتی ہے کوئی نئی بات نہیں ہوتی ہے، اس کا وہی معمول ہے۔ اگر کوئی مہمان آئے اور جائے تو اس کی بات صوفے، بیلون، ماربل، رنگ کی اقسام کے بارے میں ہوگی۔ اور اس کی طرف سے ایک لمبی آہ بھری حالت کی تنقید تک محدود ہوتی ہے اور یہ کہ اس کے پاس وہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس ہے۔ اپنی گپ شپ کا وہ خدائی حمد کے ساتھ اختتام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ، اگر وہ شادی کی تقریب میں جاتی ہے، مثال کے طور پر اس موقع سے ایک ماہ یا آدھا مہینہ پہلے، وہ گپ شپ کرے گی کہ وہ کیا پہنے گی؟! کیا خریدنا چاہتی ہے؟ وہ دلہا دلہن کے لیے کون سا تحفہ لے گی؟ ایسی صورت حال کے پیش نظر جب موقع ختم ہو جاتا ہے۔ جب چند روز باقی رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ عورت تمام مدعو کرنے والوں، ان کے کپڑوں اور سونے جاگنے کے بارے میں گپ شپ کرتی ہے، کہ ان میں سے اکثر سونے کے خول سے مزین ہیں۔ انھیں ادھار لیا ہے، یا کپڑے بھی کرائے پہ لیے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ رمضان کا سامان، اس کے اور بچوں کے لیے عید کے کپڑے، عید کی رونقیں، اس کی کریموں کی خصوصی ضروریات، کاسمیٹکس، ہیئر ڈائی، ڈرائز اور جلد کے دانے جو اسے خوفناک خواب دکھاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ اسکول میں بچوں کے داخلے کو بھولے بغیر اخراجات کے بارے میں بیوی کی گپ شپ ایک الگ گپ شپ ہے۔ بیچارے شوہر کو صرف سر درد کی دوا کا ایک ڈبہ خریدنا ہوتا ہے اور اسے ایک ہی بار میں لگتا ہوتا ہے۔

صحیح معنوں میں، آپ کو ایسی بیوی بہت ہی کم ملے گی جو مختلف ثقافتوں کے ساتھ شوہر کی دلچسپیوں اور خیالات کا اشتراک کرتی ہو۔ شادی کرنے کے بعد زیادہ تر خواتین کی زندگی صرف بیوی ہونے، بچوں اور کھانے پکانے تک محدود ہو جاتی ہے اور کبھی شوہر سے چوری چھپے کچھ پیسے الگ سے جمع کر لیتی ہے۔ بعد میں جب وہ اسے چیک کرتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر نے پیسے چوری کر لیے ہیں۔ کہاں بیچاری نے سوچی

کی روشنی سے شاندار کھانے کے ساتھ ایک رومانی رات بنانے کے لیے پیسے جمع کیے تھے، آخر کار وہ دل برداشتہ ہو کر شوہر کو بددعا دیتی ہے۔

سچ پوچھیے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کسی عورت کی ایسی گپ شپ سنوں۔ میں اس سے بات کرنے یا اس کی سننے کی حالت میں نہیں ہوتی۔ مجھے بھی اس قسم کی عورت کے تصور سے بھی نفرت ہے، جو ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوتی ہے۔ کبھی میں سننے پہ مجبور ہوتی ہوں، ایسی حالت میں خاموش رہتی ہوں یا جواب صرف (ہاں) میں دیتی ہوں اور اگر میں اس کے اصرار پہ جواب دوں تو ایک لفظ کے ساتھ جواب دیتی ہوں۔

ظاہری بات ہے کہ گپ شپ اب خواتین کی خصوصیت نہیں رہی، یوں کہ اس خصوصیت والے کچھ مرد موجود ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو خواتین سے زیادہ باتونی ہیں۔ وہ مرد اب خاموش انسان نہیں رہا، جو کم بولتا ہے، لیکن ایک دن وہ کسی بھی چیز اور ہر چیز پہ مسلسل بات کرنے میں خواتین سے مقابلہ کرتا ہے۔ شاید زندگی اپنے موجودہ تقاضوں کے ساتھ، آدمی کو بہت زیادہ بات کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور جنس مخالف کی توجہ مبذول کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو دکھانے کی ضرورت اسے اس طریقے کا سہارا دیتی ہے جو دوسری طرف سے قریب تر ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ تقریباً ہر کام میں ایک مرد ہے جو بہت ہی باتونی ہے۔ دن بھر، موقع بہ یا کسی اور صورت میں گپ شپ نہیں چھوڑتا۔ وہ اکثر کہانیاں سناتا ہے، فلاں اور فلاں کے بارے میں بات کرتا ہے، لیکن اس صلاحیت کے سبب وہ تمام ملازمین کے قریب ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی گپ شپ کی وجہ سے شاید وقت تیزی سے گزرتا ہے اور کام کی پریشانیوں کو بھلا دیا جاتا ہے۔

چوں کہ گپ شپ خواتین کی ایک فطری خصوصیت ہے، اس لیے میں دیکھتی ہوں کہ آج کل زیادہ تر عورتیں خاموش مرد پر ایسے مرد کو ترجیح دیتی ہیں جو بہت زیادہ باتیں کرتا ہے۔ وہ خاموش مرد کو بوریت کا احساس دلانے والا سمجھتی ہیں، کیونکہ وہ اچھی طرح سے سمجھتی ہے کہ گفتگو اظہار اور سمجھنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے، اس لیے بہت سی خواتین اسے خاموش مرد پہ ترجیح دیتی ہیں۔ لیکن اس قسم کا مرد مجھے اچھا نہیں لگتا ہے، مجھے بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ اور جیسے زیادہ تر خواتین سمجھتی ہیں، مجھے محسوس نہیں ہوتا کہ بات کرنے والا آدمی بہت دل لگی اور ہلکا پھلکا ہے اور اس قسم کا آدمی چاہے تمام عورتیں اس مرد کو پسند کرتی ہوں، میں اسے پسند نہیں کرتی ہوں۔

باتونی آدمی وہ ہے جو معاشرتی شائستگی سے ناواقف ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ طرز عمل اس آدمی کی

حیثیت کو گھٹا دیتا ہے، جو اپنی خاموشی اور اپنی حقیقی گفتگو سے مشہور ہے جو آدمی بہت زیادہ باتیں کرتا ہے وہ دوسروں کے سامنے کمزور، اور مضحکہ خیز نظر آتا ہے، جسے اس کی گفتگو سننے کا وقت نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض مردوں کی زندگی اور سماجی حالات کی وجہ سے وہ اپنی پریشانیوں کو بھلانے کے لیے گپ شپ کا سہارا لیتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے میں اپنی توانائی صرف کر دیتے ہیں۔

میرا ذاتی نقطۂ نظر ہے کہ خواتین کے برعکس مرد جو خود کو شامل کرتے ہیں اور کبھی کو بھی اپنی تشویش ظاہر نہیں کرتے۔ ایک مرد کو سمجھدار ہونا چاہیے جو مناسب وقت کے علاوہ کم بولتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ بات کرے، زیادہ خاموش یا مبالغہ آرائی نہ کرے، اس لیے بہترین چیز اعتدال ہے۔ یہ بھی کہ زبان میں بہت سے کیڑے ہوتے ہیں جن میں بے معنی بات کرنا بھی شامل ہے اور اس میں وقت کا ضیاع ہے۔ بے شک کہ بامعنی گپ شپ میں فائدہ ہوتا ہے مثلاً جب ہم دوسروں کو بتاتے ہیں کہ فلاں بھائی کو حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے یا پھر فلاں بہن نے ایک اچھا کام کیا ہے، وغیرہ تو اس قسم کی گپ شپ میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ فائدہ مند ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

برگیٹے والو سینے (ڈنمارک)
ڈینش سے ترجمہ: نصر ملک

برگیٹے والو سینے کی پانچ کہانیاں

برگیٹے والو سینے، ڈنمارک کی وہ بصری فنکار اور مصنفہ تھی، جس نے اپنی پوری زندگی میں ایشیا کے ان حصوں کا سفر کیا جہاں اس کے زمانے میں بہت کم مغربی لوگوں نے دورہ کیا تھا جس میں اس سے پہلے کا کھویا ہوا ملک، نیپال بھی شامل تھا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، برما اور ہندوستان جیسے دیگر ممالک کے اپنے مزید سفر سے لے کر آخر دم تک ان ممالک کے متعلق اور اپنے سفر کے دوران جن لوگوں سے اس کی ملاقاتیں رہیں ان کے متعلق اس نے سفرنامے لکھے، افسانے کہانیاں لکھیں اور ان ممالک کی تہذیب وثقافت سے اپنے ڈینش قارئین کو آگاہ کیا۔ ان کے شوہر ڈنمارک کے ایک بڑے معتبر سفیر تھے اور وہ کافی عرصے تک دلی متعین رہے اور یہیں پر برگیٹے والو سینے نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کا مطالعہ ومشاہدہ کیا اور ایک شاہکار کتاب بعنوان "ہندوستان میرا گھر" ڈینش زبان میں تخلیق کی اور کہانیوں کے کئی مجموعے تخلیق کیے۔ وہ جس ملک میں بھی رہیں، وہاں کی تہذیب وثقافت، لوگوں کے رہن سہن، مذاہب وتمدن کے متعلق کہانیاں لکھیں اور ڈینش لوگوں کو اپنی باور بصیرت کے ساتھ ان باتوں کے متعلق آگاہ کیا جو وہ جنوب ایشیا اور اس کے لوگوں کے متعلق نہیں جانتے تھے یا کم ہی جانتے تھے۔ برگیٹے والو سینے بہترین مصورہ بھی تھی اور دلی میں ان کی مصوری کے فنکاروں کی ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے، ہندوستان کے نائب صدر سر ایس۔ رادھا کرشنان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارا کام ہندوستان کی روح کی عکاسی کرتا ہے۔

ذیل میں ہم اسی ڈینش مصنفہ کی، ہندوستانی پس منظر میں لکھی پانچ کہانیاں پیش کر رہے ہیں تاکہ آپ بھی اندازہ لگا سکیں کہ ایک مغربی (ڈینش) مصنفہ ہندوستانی فکر و فلسفہ اور تہذیب وتمدن اور لوگوں کی عام زندگی کو کیسے دیکھتی اور پھر اسے اپنے لوگوں کو کیسے دکھاتی ہے۔ نصر ملک صاحب کے خیال میں یہ کہانیاں ہندوستان کے مذہبی، جنسی اور سماجی بیانیے کی حیثیت رکھتی ہیں بالفاظ دیگر ان کہانیوں میں ذات پات پر مبنی معاشرے میں استحصال کی داستان بیان بلا کم و کاست کی گئی ہے۔

اردو میں ان ڈینش کہانیوں کا ترجمہ جناب نصر ملک نے کیا ہے، جو گزشتہ نصف صدی سے ڈنمارک میں مقیم ہیں۔ وہ پچیس سال تک ڈنمارک ریڈیو کی اردو سروس کے مدیر رہے اور انھوں نے متعدد

ڈینش ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات کے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ اور ڈنمارک کی رائل لائبریری کے ایما پر انھوں نے بچوں کے لیے طلسماتی کہانیوں کے لکھنے والے مشہور زمانہ ڈینش مصنف ایچ۔ سی آنڈرسن کی کہانیوں کے تراجم بھی کیے، جو کتابی صورت میں رائل لائبریری نے شائع کیے۔ وہ ڈینش اسٹیٹ لائبریری کی غیر ملکی زبانوں کے مترجمین کی ٹیم کے رکن بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی اہلیہ ہما نصر کے ساتھ مل کر ایک جامع ڈینش اردو لغت بھی شائع کی ہے جو اپنی نوعیت کی لغت کی پہلی کتاب ہے۔ نصر ملک، ڈنمارک سے شائع ہونے والے، اسکینڈے نیویا کے پہلے اردو اخبار "صدائے پاکستان" کے آخر سال تک مدیر بھی رہے۔

☆☆☆

پہلی کہانی

خاموش آوارہ

دیانند کی آنکھوں میں ایک مقدس آگ جل پڑی۔ پہلی بار دلی کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں اسے روشن کیا گیا تھا۔ صحرائی دیہات جیسے غریب ہوتے ہیں، اس کا یہ گاؤں بھی ویسا ہی تھا۔ ایک شام مندر کی دیوی نے اسے ایک نشان دیا کہ اب اسے گھومنے پھیری لگانے کے لیے چن لیا گیا ہے۔ تیل کے ایک چھوٹے سے چراغ سے نکلنے والی چنگاری نے دیوی کے لباس کو بھڑکا دیا تھا، اور اس سے پہلے کہ کوئی نقصان ہوتا، دیانند نے اپنے ننگے ہاتھوں سے آگ کو بجھا دیا۔ دیوی نے اس کی طرف آنکھ ماری اور برکت کے طور پر اپنے ہونٹ ہلکے سے ملائے۔ مندر کے پجاریوں نے اسے خود دیکھا اور پھر انھوں نے اس کے گھر والوں سے کہا کہ انھیں جلد از جلد دیانند کو ترک کر دینا ہوگا، کیونکہ دیوتاؤں کی خدمت اس کا مقدر ہے اور اس کے لیے اسے مامور کر دیا گیا ہے۔

چونکہ وہ خاندان کا سب سے بڑا بیٹا تھا، جس کی وجہ سے اسے خاندان کی ذمہ داری اٹھانا پڑتی تھی، اور جب خاندان والوں کو اس کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ کیا کرنے والا ہے تو والدین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور دل رونے لگا۔ لیکن دیوتاؤں کے زبردست خوف کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے متصادم ہونے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ ویسے بھی جب دیوتا بولتے ہیں تو انسانوں کا خاموش رہنا فطری بات ہے۔

دیانند کو گاؤں کی طرف سے چنے گئے ایک آشرم میں لے جایا گیا۔ اس آشرم کا انتخاب گاؤں کے سب سے بڑے پروہت کی نگرانی میں کیا گیا تھا جہاں وہ خود بھی اپنی جوانی کے دنوں میں جا چکا تھا۔

بدری ناتھ کو جانے والے سڑک پر بے شمار آشرم تھے، ہر آشرم میں ایک گرو اپنے اپنے ارد گرد چیلوں، شاگردوں کو اکٹھا کرتا تھا اور انھیں ایک عظیم نجات تک پہنچنے کی راہ دکھاتا اور طریقہ سکھاتا تھا۔ چیلے اور

شاگرد اعتقاد رکھتے تھے کہ گرو ہی تمام زمینی چیزوں سے نجات دلانے والا ہے اور وہ یہ سب کچھ کائنات کے اسرار کے ساتھ ساتھ، ایک گرو ہی ہوتا ہے جو ان کو ظاہر کر سکتا ہے۔ ہر گرو کا اپنا ایک نظام تھا جو وہ اپنے چیلوں کو سکھاتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر گرو خود کو تقدس اور علم میں ان گروؤں سے کہیں زیادہ ماہر و قابلیت رکھنے والا مانتا تھا جو دوسرے پڑوسی آشرموں کی قیادت کرتے تھے۔

آشرم کے تمام چیلوں میں ایک چیز مشترک تھی، اور وہ تھی سچ کی تلاش میں آزادی کی آرزو۔ ہندوستان میں ایسے چیلوں کی تو کوئی کمی ہی نہیں جو ملک بھر میں گھومتے رہتے ہیں، وہ بھیک مانگنے والے اپنے کشکول لیے ایک زیارت گاہ سے دوسری زیارت گاہ اور ایک آشرم سے دوسرے آشرم تک جگہ جگہ چکر لگاتے ہیں۔ جب شام کی پوجا پاٹ ختم ہو جاتی ہے تو آشرم کے سامنے بھرے گڑھے میں مندر کی مقدس آگ بھڑکتی ہے، تو عجیب و غریب آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور یاتری راہ کے اندھیرے سے نکل کر اپنے برتنوں کو پانی کے گھڑوں کی طرف بڑھاتے ہیں، پانی ٹھنڈا و شفاف پانی جو، زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کی لذت سے بھرا ہوا ہوتا ہے، یہ گنگا کے آس پاس کے چشموں سے آتا ہے۔ مقدس پانی! جب بھی پانی پی لیتے ہیں اور ہاتھ منہ دھو لیتے ہیں تو پھر بھرے ہوئے پیٹ کے باوجود کم سے کم کچھ کھانا کھاتے ہیں اور تب بھی اچھا محسوس کرتے اور خوش ہوتے ہیں اور اپنے بچنے کو سراہتے ہیں۔ پھر وہ لگتے ہو گر مختلف آشرموں کے فلسفیانہ نظاموں اور مقدس کتب کے ہزاروں مشمولات پر بحث کرتے ہیں، دراصل یہ ان کی اپنی ہی مایوسی کی راگنی ہوتی ہے، وہ تھک جاتے ہیں یا پھر اونگھنے لگتے ہیں اور ہر چیز کو بے ہودہ ہونے کے طور پر سنتے ہیں۔ اس موقع پر وہ مقدس الفاظ کی ناخوش گوار بھنبھناہٹ، یا اپنے الفاظ کی دنیا سے اوپر اٹھ کر ہر چیز میں اور ہر ایک میں، ایک عظیم ہستی کو دیکھتے ہیں، جو عظمتوں کی عظمت ہے لیکن زندگی کی ناقص انفرادیت کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ یہی عظیم عظمت لوگوں کے ہجوم سے اوپر اٹھنے کی طاقت ہے اور وہ آشرموں کی تعلیم سے ہٹ کر اوپر دیکھتے اور نظاموں کا جائزہ لیتے، اور دیکھتے ہیں کہ ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے صرف ایک ہی راہ ہے۔ کچھ گرو اپنے شاگردوں، چیلوں کو اوم، تت ست، اوم کا ورد کرنا سکھاتے ہیں اور انھیں اس کی گہرائی تک لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ عظمت پا سکیں، وہ اس کے ایک ابدی، پوشیدہ سچائی ہونے پر اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ وہی واحد عمل ہے جو واقعی ایک آوارہ، پھیری لگانے والے کو آزاد کرا سکتا ہے۔

لیکن ایک غریب گرو اپنے آپ کو کیسے آزاد کرا سکتا ہے جب کہ وہ خود ہمیشہ اپنے بھوکے چیلوں کے ہجوم میں گھرا رہتا ہے جو روح کے لیے غذا چاہتے ہیں؟ یہ مجبوری آتی ہے کہ پابندی خود اپنے ہی سازی گھیروں کے جالوں میں ختم ہو جاتی ہے، وہ خود کو نظاموں اور فلسفوں میں پھنسا ہوا دیکھتا ہے۔

دیانند ایک بار جب گھوم پھر رہا تھا تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، کچھ سوچا اور مسکرا دیا۔ عجیب و غریب خیالات اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ وہ طویل ان گنت سالوں سے گھوم پھر رہا تھا اور وہ پہلے جیسا جوان تو بالکل نہیں تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ مرجھا رہا ہے لیکن کہیں سے اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے تھے۔ تمام بھٹکنے والے اور وہ لوگ جو آشرم میں سوتے ہیں، وہ، الفاظ اور کتابی تعلیمات میں دفن ہیں۔ دیانند بے اختیار بڑبڑایا، وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا اور راہ میں آنے والے بہت سے لوگوں کو پہچانتا تھا۔

کئی گروؤں نے دیانند کی تربیت کی تھی۔ اس کے آخری گرو نے اسے بتایا تھا کہ اب وہ ایک ایسا سچا چیلا ہے جو اکیلا چل سکتا ہے، آزادانہ طور پر سوچ سکتا ہے، اور جو چیز اسے ملتی ہے اس سے وہ حکمت حاصل کرنے کے قابل ہے۔ اس گرو نے اسے یہ بھی بتایا کہ ایک چیلے کے اپنے بھی خیالات ہوتے ہیں، جو گرو سے آزاد ہوتے ہیں۔

جب دیانند اپنے آخری آشرم سے، اس کی رسومات، اس کے جھوٹے اور سچے چیلوں، اس کے دن رات کی زندگی کے سچ اور جھوٹ سے باہر نکلا تو اسے ایسے لگا جیسے وہ عمر بھر کی قید سے باہر آ گیا ہے۔ دیواریں گر گئیں اور اس کی زندگی کا حقیقی سفر شروع ہو گیا

یاترا کے راستے پر دیانند کا نام شروع ہی سے آوارہ، پھیری لگانے والا تھا۔ اب زندگی خود ہی اس پر آشکار ہونے والی تھی۔ اب لوگوں کے کہے ہوئے الفاظ پھر بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کے لیے اب یہی ایک حکم تھا کہ باہر جائے اور سردی اور گرمی، درد، خوشی اور غم میں بے حسی کا تجربہ کرے لیکن وہ ایسی چیزوں کا تجربہ کہاں کرے گا؟ اور دیانند کو اس کے علاوہ بھی کچھ کرنا تھا یہ وہ نہیں جانتا تھا کہ راہ کدھر جاتی ہے۔

گنگا کا مقدس پانی اپنے کناروں کے اندر بہتا ہوا ہندستان کے سوکھے میدانوں میں سے گزرتا اپنے راستے کی گہرائی میں اترتا بہتا تھا اور پھر بلندیوں سے نشیب کی جانب پانی اتنے زبردست دباؤ میں تھا کہ کوئی بلند آواز میں چلائے بغیر انسانی آواز سن نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے دیانند کی یاترا کا راستہ چیخ و پکار اور شور سے بھرا ہوا تھا وہ خود تو چلتے پھرتے ہمیشہ خاموش ہی رہتا تھا اور اسی لیے اسے خاموش آوارہ کا لقب دے دیا گیا تھا
۔

دیانند اب جب چپ چاپ، خاموش، یاترا کے راستے پر چل رہا تھا تو اس کے ذہن میں آیا کہ وہ یہ تو جانتا ہی نہیں کہ اسے کس سمت جانا ہے۔ یہ اتنا عجیب سا احساس تھا کہ اب وہ مشکل سے آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس نے بے اختیار سوچا کیا پوری دنیا میں کوئی اور ہے جو یہ جانتا ہو کہ کہاں جانا ہے؟۔

اس کے اندر کا خالی پن اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے کی وادیوں میں سردی، برف اور

طوفان کو دیکھا۔ وہ بمشکل اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بادل اس کے پیروں کے نیچے آ گئے۔ سردی، اس کے ارد گرد سخت سردی تھی۔ ٹھنڈ اتنی زیادہ تھی کہ اسے یوگا کی حالت میں بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اپنے بدن کو گرمانا پڑا۔ پھر اس نے یوں محسوس کیا کہ جیسے اس کے ارد گرد آگ بھڑک رہی ہے۔ گرمی اس کے بدن میں گھس جانے کے بعد، وہ بڑے سکون سے سمادھی میں چلا گیا لیکن اس سے پہلے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اگلی صبح کس وقت بیدار ہوگا۔

جب وہ اپنے مقررہ وقت پر بیدار ہوا تو وہ تقریباً برف میں دب چکا تھا۔ نرم پاکیزہ اور اجلی برف، اس نے شب بسری کے لیے اپنے لیے جگہ بنائی تھی اور اب صبح سویرے اس نے غیر ارادی طور پر اپنی دھرمی رسومات ادا کرنی اور پوجا کے بھجن گانے شروع کر دیے۔ لیکن پھر اچانک رک گیا۔ یہ منتروں کے نعرے لگانے والا کون تھا؟

وہ دنیا میں اکیلا تھا۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر اچانک اس پر واضح ہوا کہ اسے مرنے کے لیے باہر بھیجا گیا ہے اور یہی ہے جس کا اب اسے تجربہ کرنا تھا۔

شفاف ہوا اس کے نتھنوں میں بھر گئی۔ پہاڑی چوٹیاں اس کے گرد تنی سیاہ کھڑی تھیں۔ نیچے گہرائیوں میں سبزیوں کے بھورے رنگ کے دھبے تھے جہاں انسانی مکھیاں ادھر ادھر قلابازیاں لگا رہی تھیں لیکن یہاں پتھر، سورج اور برف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور، ہاں بجلی ہوا، صرف طوفان کو آگہی دینے کے لیے کافی تھی۔ اسے دل کے دھڑکنے کا نظام ہتھوڑے لگنے کی طرح محسوس ہو رہا تھا جو بڑی بے شرمی سے اس کا سینہ پھٹنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ یہاں یوگا نے اس کی مزید کوئی مدد نہ کی۔ یہاں قدرت نے خود اسے یوں گھیر لیا کہ اس نے جو کچھ سیکھا تھا، سب بھول گیا۔ اسے لگا تھا کہ صرف یہی ایک صحیح چیز ہے۔ یاترا کے راستے میں گھاٹیوں کے نیچے آشرموں پر اچانک مردنی طاری چھانے لگی تھی۔ وہ پہاڑ کے عجیب وغریب غاروں کی طرح تھے، جو اچھے اور برے، روشن اور تاریک فلسفہ نظام کی مباحث سے بھرے ہوئے تھے۔ چھپانا شاید تمام آشرموں میں نمایاں آواز تھی اور اس چھپانے نے جیلوں میں احساس کی سرگوشی کو مار ڈالا تھا۔

اس نے اپنے ماضی کے آشرموں کی مذمت نہیں کی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بھی نہیں آیا تھا کہ وہ ایسا کرے۔ اس نے مذمت کے شعلوں کو بھی اپنے سر کے نیچے رکھنے والا تکیہ نہیں بنایا تھا۔ اس نے بھی یہ جانا نہیں تھا کہ دوسروں کی مذمت کر کے زندگی میں بہتر کھڑا ہوا جا سکتا ہے لیکن وہ تمام عقائد پر مسکرایا بھی کسی چیز کے بارے میں تمام طے شدہ خیالات، یہاں تنہائی میں ان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جیسا کہ یہاں تھا، وہ اب کارآمد نہیں رہے تھے۔

خیالات آتے اور چلے گئے۔ وہ تو بے چین کرنے والے تھے، دی خوشگواری لانے والے۔ ہاں انھوں نے شاید اسے مرنے کے لیے باہر بھیجا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نرم اور فطری طور پر آگے بڑھا اور جہاں تک وہ جو یاد کرسکتا تھا یہی تھا کہ اسے ہمیشہ کے لیے یہاں بھیج دیا گیا ہے۔

اب وہ ایک آوارہ مقدس آدمی تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اب آزاد ہے! اور یہ خود بڑے گرو نے بتایا تھا۔ اس نے تھوڑا سوچا کہ اسے کس چیز سے آزاد کیا گیا ہوگا۔ یہ شاید بے تکی تھی۔ خوف کا آخری احساس شام کو سمادھی ہونے سے پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔

دن آتے اور گزرتے رہے۔ دیانند نے بہت سے دوسرے جوگیوں کی طرح، چٹانوں کے غاروں میں پناہ لینا اور بڑے پیڑوں میں زندگی کو برقرار رکھنا نہیں سیکھا تھا۔ ایک صبح وہ سمادھی سے نہیں اٹھا تھا ......وہ وقت سے باہر ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

اگر دیانند کے ساتھ جوگیوں، شاگردوں یا گروؤں میں سے کسی نے وقت سے باہر اس کی آوارہ گردی دیکھی ہوتی تو وہ کہتے کہ ایک بہت ہی مقدس آدمی بھٹک گیا ہے وہ پھر اس کی زندگی کے بارے میں افسانے جنم لیتے۔ جیسا کہ اب تھا۔

یاترا کے راستے میں پڑنے والے آشرموں میں رہنے والے صرف یہ جانتے تھے کہ دیانند بھی موجود تھا لیکن یہ کہ وہ ان کے آشرموں سے دور کہیں گمنامی میں چلا گیا تھا۔ اوم تت ست اوم۔

☆☆☆

دوسری کہانی

دل سبز ریشمی جوتوں میں رقص کرتا ہے

کشمیر میں بہاری بہار، پھولوں سے بھری وادیاں، روح کو معطر کرتی، وہ جنوں قسم رنگ برنگے قدرتی پھولوں کی خوشبو۔ ایک نوجوان کشمیری دیہاتی لڑکی بہت سے زیورات اور چمکدار رنگ کے کپڑے پہنے ایک پہاڑی ڈھلوان پر بھیڑوں کے گلے کی نگرانی کر رہی ہے۔ اپنی بھیڑوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے وہ گنگناتی ہے:

"ہاں! آج میرا دن ہے۔ یہ سبز ٹوپی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ یہ مجھے یہاں گلمرگ کی پہاڑیوں پر ملتا ہے۔ یہ مجھے مسرور کرتا ہے، مدہوش کرتا ہے۔ یہاں میں اپنی طلائی خوشیوں کے ساتھ ناچتی ہوں، ہنستی ہوں، گنگناتی ہوں، گاتی ہوں۔ میرا باپ ان سے منسوب ہے اور اس کے کاٹے جانے کے لیے منتظر ہے۔"

"ہاں، بہن! اب جو میں تجھے کہنے والی ہوں، اے میرے دل، اگر تو صحرائی ریت میں اپنا پا ہوتو پھر

بھی تو میری نظروں میں ہمیشہ وادیِ کشمیر کے پھولوں کا لباس اور سنہری ستاروں والی ٹوپی پہنے دکھائی دے گا۔ بھلا
تم جانتے ہو ایسا کیوں ہے، اے میرے دن؟ ہاں، اس لیے کہ میرا گھڑی میں۔ ہمیں انہی گھڑیوں میں، میرا لالا
میری بھیڑوں کی اون کترنے کے لیے آنے والا ہے۔ اور یہ بھی کہ آج ہی اس کا باپ میرے باپ کے پاس
جانے اور اس سے پوچھنے والا ہے کہ کیا میرے زیورات اس گھر کو بھی روشن کر سکتے ہیں جو اس کا بیٹا میرے لیے
بنائے گا؟ تو اے میرے پیارے دن، یہی تو بات ہے کہ جب تم اپنے سبز ریشمی جوتوں میں غروبِ آفتاب کی
طرف وادیوں میں چل رہے ہوتے ہو تو میں گنگناتی ہوں، گاتی ہوں۔"

"اے میرے دن، وہ میرا لالا کب آئے گا؟ جلدی؟ جلدی؟ اے دن، اپنے جوتوں والے
قدموں کو تیز تیز اٹھا، اتنا تیز کہ وہ آگے بڑھیں، اور آگے بڑھیں! اب امید کی مٹھاس میرے دل کی دھڑکن تیز کر
رہی ہے، اے میرے دن! اگر تو یکدم جلدی کرے تو بہت ہی شاندار ہوگا! اے میرے دن، اگر تمھاری سنہرے
ستاروں والی رتھ کے آگے جتے ہوئے گھوڑے بھی سرپٹ دوڑیں، تیزی دکھائیں تو شاید تم تمام پھولوں، تمام
بھیڑوں، تمام جانوروں کی ریشمی آنکھوں کو چوم سکتے ہو۔"

"اے میرے دن، اب جب تمھاری پرچھائیوں کے نیلے سائے پہلے ہی واپس جانے والے ہیں اور
تم نے اپنے تیز گھومتے پہیے کو چھپانے کے لیے شام کے آسمان کو بادلوں میں بدل دیا ہے، دیکھو پہاڑوں کی
چوٹیوں پر برف کیسے جواہرات کی طرح چمکتی ہے! یہیں کی بھولی بسری وادیوں میں بھی، وقت کے پیچھے، تو اپنی
ساری شان و شوکت دکھاتا ہے۔ او دن، وہ مجھے اپنی شاندار سنہری رتھ میں آگے بڑھنے کے لیے بہترین لباس
پہناتے ہیں! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ سبز ریشم کے جوتے شام کے نیلے سائے کے ساتھ جاتے ہیں۔"

"او دن، اب تمھیں دس گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اور اب میرا لالا آنے والا ہے۔ وہ وادی کی گہرائی
میں بہت چھوٹا لگتا ہے۔ مجھے آج اس سے ملنے کے لیے اڑنا ہے۔ یہ برا ہے، تم میرے قابلِ فخر، پیارے دن
اب دوسری طرف رخ پھیر رہے ہو اور اب تو تمھارا ساتھ میری خوشی کے لیے کافی نہیں ہے۔ جب تک میں
واپس نہیں آؤں گی، میری نرم و ملائم اون والی بھیڑیں، یہیں خاموش کھڑی رہیں گی۔ اب میں اڑتی ہوں،
سارے پھول مجھ پر مسکراتے ہیں۔ دن چاہے رات میں بدل جائے، وہ میرا لالا، ہمیشہ پھولوں کی خوشبو
سے بھرے سبز ریشمی جوتوں میں ملے گا۔"

"اب وہ اتنا قریب ہے کہ میں اس کی پر مسرت آنکھیں دیکھ سکتی ہوں۔ اپنی ناک میں اس کی
خوشبو محسوس کر سکتی ہوں لیکن جشن میں پہننے والا اس کا لباس کہاں ہے؟ اے سبھی دنوں کے خدا، اس کے پاس
جشن کا لباس نہیں ہے! وہ اپنے پرانے سرمئی چیتھڑوں میں آتا ہے۔ وادی میں روشنی ختم ہو گئی ہے۔ اے دن

کیا تو نے پوری طرح مجھ سے منہ موڑ لیا ہے؟"۔

"شاید وہ یہ چاہتا ہے کہ میں یہ جان سکوں کہ اس کے لیے، جشن کا لباس صرف آج کے سرخی چیتھڑے ہی ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آخر وہ میرا اور میری بھیڑوں کا بہترین دوست ہے۔ میرا پیارا کانکا۔ دیکھو، دیکھو، کانکا، میں تیری جانب دوڑ رہی ہوں۔ حالانکہ ٹھنڈی یخ ہوا میرے دل کو منجمد کر سکتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ٹیلے پہاڑ بھی تیرے جشن کے لباس کی طرح سرخی ہو گئے ہیں"۔

"پرندے اضطراب کی طرح پھڑپھڑاتے ہیں۔ اتنی عجیب کوشش کی ہے تم نے، مجھے بتاؤ کانکا، میرے کانکا بتاؤ، کیا تم اپنی گرم چائے سے میرے دل میں خوشخبری کی نوید لاتے ہو؟ ہمارا دن تو سنہری ستاروں والی رتھ میں اڑ گیا اور رات اس کی پیروی کرے گی۔ مجھے بتاؤ، تم اپنے ساتھ میرے لیے کیا لائے ہو، تم میری کامیابی کی امید رکھتے ہو؟ تمہاری آنکھوں میں برف کیوں ہے، اور تمہارا منہ سوکھے سانپ جیسا سخت کیوں ہے؟ سردی میں تم میرے ساتھ میری بھیڑوں تک چلو، اپنی بڑی قینچی لے لو اور بھیڑوں کی اون کترنا شروع کر دو"۔

"اوہ، اب یہ سب میرے لیے بڑا واضح ہے۔ تم مجھے وقت پر سکھاؤ گے کہ کام کے بعد کھیل آنا چاہیے۔ میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔ کانکا تم بہت عقلمند ہو۔ میں اپنے بیٹوں کو بھی یہی سکھاؤں گی کہ ان کا باپ کتنا عقلمند تھا، میرا یقین کرو، کانکا، ایسا کروں گی۔ میں ان کو سکھاؤں گی کہ ان کا باپ اتنا عقلمند تھا"۔

"ہو سکتا ہے تمہارے پاس تمہارے جشن کا لباس اور تمہاری بانسری تمہارے کاندھے والے تھیلے میں ہو۔ جب کام ختم ہو جائے گا تو تم میرے لیے اپنی بانسری بجانا پھر اس طرح تمہاری طرف سے خوشی کی بات مجھ تک پہنچے گی۔

دیکھو کانکا میرے پاس تمہارے لیے ایک گرم چپاتی ہے۔ صبح سویرے میں نے اسے رات کی آگ سے پتھروں کے نیچے رکھ دیا تھا تاکہ یہ اتنی ہی گرم رہے جتنا میرا دل تمہارے لیے گرم ہے۔ تم نے پہلے کبھی اتنی جلدی اون نہیں کاٹی۔ تم شاید مجھے دکھاؤ گے کہ خیمے میں بیٹوں کا انتظار کرنے والا آدمی اس طرح کام کرتا ہے"۔

"جلدی تم کام ختم کر لو گے۔ تم شاید آج رات یہیں ٹھہر جاؤ اور آنے والے دنوں میں ہماری خوشیوں کے بارے میں بتاؤ۔ اب آخری بھیڑ موسم کی ہوا میں بھی کھڑی ہے۔ مجھے اب کوئی ٹھنڈ، سردی نہیں لگتی۔ تمہاری مہارت دیکھ کر میں خود کو گرم محسوس کرتی ہوں۔ تم پوری دنیا میں ذہین ترین آدمی ہو۔ وادیوں میں تم جیسا کوئی چرواہا نہیں۔ یہ میں تبھی جان گئی تھی جس دن میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا جب تم نے پہلی بار میری بھیڑوں کی اون کتری تھی۔ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم تھا، کانکا، اور تب سے میں نے اپنے آپ کو صرف

تمھارے لیے سنبھال رکھا ہے"۔

"کانا، اب تم نے کام ختم کر لیا ہے۔ میں تمھارے قدموں پر پھول رکھتی ہوں یہ تمھیں بتانے کو کہ میں تمھیں اپنی زندگی میں ہر روز پھول دوں گی۔ منشدوٹیں نہیں، نہیں، زہریلے پیلے پھول بھی نہیں، بالکل نہیں، ہر ایک شام جب تم اپنے قدموں سے بیتابی کے ساتھ ہمارے خیمے کی طرف دوڑتے ہو تو صحت مند بچے اور اچھی چپاتی کے حقدار ہوتے ہو"۔

"پھر تم اپنے بیٹوں کو اپنے بازوؤں سے اوپر اٹھاؤ گے، اور ہاں تمھیں کہنا پڑے گا کہ "مجھے بیوی اور بیٹے ملے ہیں، میں دیوتاؤں کا پسندیدہ ہوں"۔۔۔۔۔۔ کانا، ہم سب مل کر تمھارے لیے اتنا اچھا کریں گے کہ صبح ہوتے ہی جب تم اٹھو گے تو سوچو گے کہ ہمارے ساتھ رہنا کتنا اچھا ہے۔۔۔۔ کانا تم مجھے ٹھنڈی راتوں میں گرم کرتے ہو اور گرمی کے دنوں میں راحت بخش ٹھنڈک پہنچاتے ہو"۔

جیرتس کا دل اچانک بے نام خوف سے گھبرا گیا۔ کانا کیا کر رہا تھا؟ کیا اس نے ڈھیر سے اُون لے کر اپنے کام کی اُجرت کے طور پر اسے اپنی بوری میں نہیں ڈالا؟ آخر کار اس نے لاپرواہی اختیار کی اور سمجھا کہ یہ اس کے لیے کافی ادائیگی تھی۔ اب اس نے تسلی کے لیے بوری کو بڑے پتھر کی طرح سختی سے دبایا، یہی اس کے لیے کافی تھا، کیا ہوا تھا؟ اس نے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کی، اور نہ ہی وہ مزید کوئی واضح سوچ بنا سکی۔ ایک موٹی سوئی جیسا ابھرا اتنے زور سے اس کے دل میں آئی اور اسے لگا کہ جیسے کوئی پہاڑ اس پر آن گرا ہے۔ آبشاروں کی دھمکی اور سریلی کانگ نغمے میں بدل گئی۔ بے ساختہ اس نے اس کی طرف دیکھا اور سمجھا کہ وہ پیار کرتی ہے۔ اب بوری میں مزید اُون بھرنے اور بوجھ بڑھ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

جیرتس کو اچانک احساس ہوا کہ اس نے اُون کٹوانے کے لیے، ادائیگی کے طور پر اتنی اُون پہلے کبھی نہیں دی تھی۔

"کیوں، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟" وہ مایوسی سے پھٹ پڑی۔

کانا نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن اس کے سامنے اپنی اُون والی بوری رکھ کر دوبارہ گاؤں جانے کی تیاری کی اور جب وہ اس سے چند قدم دور ہو گیا تو بڑے اطمینان سے بولا:

"گاؤں میں پچھلے سال مجھے سوگی کے حوالے کر دیا گیا تھا اور تجھے پاہون کو دے دیا گیا تھا۔ اگلے چاند ماہ میں ہمیں جشن میں جانا تھا۔ دیوتاؤں کا کہنا تھا کہ اس کے بعد شادی کے لیے سب سے موزوں وقت ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم دونوں شادی کرتے ہیں تو ایک بڑی آفت گاؤں کو اپنے نرغے میں لے لے گی

اور پورے گاؤں میں طاعون پھیل جائے گا اور گاؤں گھنٹہ رات میں بدل جائے گا کیونکہ ہم ایک دوسرے کے لیے سانپ کے زہر کی طرح ہیں اور اگر ہم اکٹھے ہو گئے تو جذام اور بھی دیگر موذی بیماریاں ہماری آنے والی پیڑیوں میں داخل ہو جائیں گی"۔

پھر وہ کچھ کہے بولے بغیر بھورے گیدڑ کی وادی کی ڈھلان میں غائب ہو گیا۔

اب پہاڑوں کے سائے تقریباً مکمل سیاہ ہو چکے تھے اور جیوتس کے دل میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ موٹی ہوتی بھیڑیں اس کے گرد یوں گھوم رہی تھیں جیسے وہ رات کی چلنے والی ٹھنڈی ہوا سے پناہ لینا چاہتی ہوں۔ وہ جمائیاں لے رہی تھیں اور سخت تھکی ہوئی تھیں۔

جیوتس کے حلق سے ایک گانا پھوٹ پڑا اور اس کی آنکھوں سے سنہری روشنی چھلکنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے آس پاس کی چیز پہاڑی چوٹیوں کی طرح سرد اور ویران ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اون میں چھپا لیا اور اس رات وہ کافی گرم ہوئی لیکن پھر بھی اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر اور اس کے ارد گرد ٹھنڈ زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔

پھر جب دن وادی میں رقص کرنے لگا تو وہ اس کا سامنا کر سکی۔ اور اس نے اس سے منہ پھیر لیا اور خود کام کرنے لگ گئی۔ دن نکلتے رہے، دن ڈوبتے رہے۔ جیوتس ایک ہنرمند اور ذہین عورت تھی۔ اس کے ہاں صحت مند بیٹا ہوا اور پھر دوبارہ بھی صحت مند بیٹے پیدا ہوئے۔

اب وقت آنے پر جیوتس کسی انجان طرف کو جانے والی تھی اور ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ اس نے سرگوشی کی:

"تم ہی تو ہو اب یہاں، اے میرے دن، سبز ریشمی جوتوں اور سنہری ٹوپی میں یہ تم ہی تو ہو"۔

یہاں واقعی کسی نے اس کی بات نہیں سنی تھی کہ اس نے کیا کہا تھا۔ آخر وہ تو بس ایک بوڑھی، بیمار عورت تھی۔ جسے اپنے راستے پر جانا تھا۔ طلوعِ آفتاب کی طرف وہ اسے شمشان گھاٹ لے گئے لیکن انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کی ارتھی کے آگے آگے دن سبز ریشمی جوتوں میں ناچ رہا تھا۔

☆☆☆

تیسری کہانی

میرے دل میں شمع جلاؤ

میرے دل میں ایک شمع جلاؤ تم میرے بیٹوں کے باپ، وہ روشنی جو صرف تم ہی مجھے دے سکتے ہو۔
دوسری عورتیں گھروں میں پوجا کی جگہ میں دیوتاؤں کے سامنے ناک میں گھنٹی ہیں، دیوتاؤں سے

پرارتھنا کرتی ہیں۔ میں تمہارے سوا کسی سے پرارتھنا کرنا بھول گئی ہوں میرے پتی۔

تم کافی عرصہ مغرب میں رہے۔ اتنا عرصہ کہ اب تم بھارت کے لیے اجنبی بن گئے ہو، اور سب سے زیادہ مشکل یہ کہ میں تمہارے لیے اجنبی بن گئی ہوں۔ تم اپنے سفر سے ہمارے گھر کے لیے بہت سی چیزیں لائے ہو۔ سب سے ممکن شاید یہ تھا کہ ہمیں درخت کے پاس بیٹھنا تھا، میز کو اٹھانا، چارپائیوں پر کھڑا کرنا اور پھر اس پر کپڑا بچھانا اور ہمارا چاندی کے چمچوں سے کھانا تھا۔ گویا ہم اس وقت کھانے کو محسوس کر سکتے ہیں جب تخت ٹھنڈی دھات ہمیں اس سے الگ کر دیتی ہے۔ ہماری انگلیاں پتر بھوجن کھانے کے لیے بوجھل ہو گئیں، اور اس لیے اس نے ہمیں ایسی بیماریوں کا نشانہ بنایا، جن کا ہمیں پہلے کبھی علم ہی نہیں تھا۔

جب میں جوانی میں تمہارے والدین کے گھر گئی تھی اور میں کنواری تھی، تو تمہاری آنکھیں دیوتاؤں کی قربان گاہ کے سامنے مندر کی روشنی کی طرح تھیں۔ جب تم میرے ساتھ کھیلتے تھے تو تمہارا چہرہ خوشی سے چمکتا تھا، اور تم نے میرے دل میں روشنی ڈال دی تھی۔

میں نے تمہارے لیے بیٹے پیدا کیے، بہت سے بیٹے، جنہیں تم نے دور دراز، تاریک ملکوں میں بھیجا، یہاں سے اتنا دور کہ میرے خیالات ان تک بالکل نہیں پہنچ سکتے تھے، اور ندی پہنچے۔ سمندر کے اوپر گئیں۔ سوچ کو سفر کی راہیں ملتی ہیں۔ میں وہاں بالکل خاموش ساکت کھڑی رہی۔ کوئی راہ اور نہ ہی کوئی پگڈنڈی۔

ابھی دنوں میں نے تیری خاطر دیوتاؤں کو ناکام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنے ایمان کی طاقت سے تم تک پہنچ سکتی ہوں۔ میرے لیے ایک ہی معبود تھا اور وہ تم تھے، لیکن میں نے تم سے جتنی منتیں کیں، اتنا ہی تم نے خود کو مجھ سے دور کر لیا۔

میں گلاب کے تیل سے نہایا، اپنی ملکیت میں موجود سب سے خوبصورت ساڑھی پہنی، لیکن تم نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ یہاں تک کہ تم نے میرے قیمتی موتی بھی نہ دیکھے، جو میرے باپ نے میرے جنم دن سے لے کر ایک ایک کر کے خریدے تھے۔ میں ان کا سب سے خوبصورت زیور ہوں، وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ تاہم، دن زندگی کے لیے بے وقار اور خالی ہیں۔ جیسا کہ تم کو لگتا ہے کہ وہ تمہارے پاس ہیں، وہ ایسے گزر جاتے ہیں جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ کاش میرے ہاتھ مستقبل کے ان گنت دنوں سے بھرے ہوں اور میں ان سب کو تمہاری پوجا کرتے میں اور تمہارے لیے ہر چیز کو گرم رکھنے اور اچھا بنانے کے لیے استعمال کروں۔

چونکہ اب میں زیادہ بیٹوں کو جنم نہیں دے سکتی تھی اس لیے میں تمہارے لیے ایک نئی جورو لے آئی۔ وہ سمندر پر چاندنی کی طرح خوبصورت تھی لیکن تم ہمیشہ دور ہی اور چیز کی خواہش رکھتے تھے۔ تم اکثر سمندر پار سفر کرتے تھے اور تمہارے جانے سے پہلے میں تمہاری آنکھوں میں مندر کی روشنیاں دیکھتی رہتی تھی جب تم گھر پہنچتے

تو تمھارے منہ کے گرد و درد کے تیز دھار نشان ہوتے تھے۔ تم اتنے اجنبی ہو گئے تھے، اتنے غیر مانوس لگتے تھے، جیسے دیوتاؤں کی اپنی سرزمین بھارت میں تمھارا اپنا بھی کوئی گھر ہی نہیں تھا۔

تمھارے ساتھ بہت دور، دور یہاں سے بہت دور، کچھ ہوا، کچھ ایسا ہوا جس میں نہ میرا اختیار تھا اور نہ ہی اس میں کوئی میرا حصہ تھا اور ان تمام راتوں کے دوران جب میں اپنے بستر پر اکیلی ہوتی تو ایک خوفناک اضطراب مجھ پر طاری ہو جاتا تھا۔ ایک رات میرے کمرے میں ایک سانپ گھس آیا۔ میں اس کی سرگوشی سن سکتی تھی اور مجھے لگا کہ وہ میرے بستر پر تھا۔ میں نے بالکل حرکت نہ کی۔ یہی سوچا، آیا ہو آتا تھا تمھارے ساتھ موت، میری کھوئی ہوئی خوشی کے درد سے بدتر نہیں ہو سکتی۔ میرے دل میں گہرے گڑھے بن گئے ہیں۔ میں اب اچھی نہیں ہوں، میری مسکراہٹ بدصورتی میں بدل چکی ہے۔ میرے مرہم میری مدد نہیں کرتے۔ انھوں نے مجھے مزید بوڑھا کر دیا ہے۔ عمر کے سائے مجھ پر چھا رہے ہیں اور مجھے اداسی میں غرق کر دیا ہے۔ میں تمھاری بیوی جو روئی طرح تمھارے گھر کی امارت سے کھانے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتی۔

میں وہ دن کبھی نہیں بھولوں گی، جس دن تم نے اپنے بڑے صحن میں ایک سوئمنگ پول بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ یہ ہمارے لیے ہے لیکن جب میں نے تمھیں دیکھا تو تمھاری نظریں مجھ سے ہٹ گئیں۔ تمھارا گھر اب سجا سجایا ہے، بالکل ویسا کہ اہل یورپ پسند کرتے ہیں۔ بالآخر تم نے وہاں رہائش اختیار کر لی اور پھر اس کے بعد ہم نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔ ہم جو تم سے پیار کرتے ہیں، ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ تم یہاں رہتے ہو یا کہیں یورپ میں۔

ایک دن جب ہم سب کو معلوم ہوا کہ اب تم ایک طویل، طویل ترین سفر سے واپس آ رہے ہو، میں نے اپنی سب سے خوبصورت ساڑھی پہنی۔ میری پازیب سونے کی تھی، میرے موتی سنول کی انگلیوں پر شبنم کی طرح چمک رہے تھے۔ میری ناک کا لونگ اتنا خوبصورت تھا کہ اس نے میرے چہرے کو پھر سے جوان کر دیا، میری آنکھیں اتھاہ جھیلوں کی طرح کالی تھیں، میرے کانوں کی بالیاں، شام کے وقت، کبھی وہ دروازے کے صندل کی موسیقی کی طرح ہلکی ہلکی سی بج رہی تھیں۔ میرے بازو سونے کے زیور سے ڈھکے ہوئے تھے جن کی شکل کوبرا کی طرح تھی۔ میں نے بالوں کو گلاب کے تیل سے مسح کیا تھا اور تمھارے سب سے پسندیدہ زیور، کلائی کے سب سے قیمتی تاج سے آراستہ کیا تھا۔

میں تقریباً ایک دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی اور میری عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ میں تمھارے بیٹوں کو اپنے اردگرد لیے تیار کھڑی تھی۔ تمھاری دوسری بیوی بھی خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ہاں، جی ہاں، بھارت نے تمھارا اس سے پہلے اس طرح کا شاندار استقبال کبھی نہیں کیا تھا۔ اس بار میں نے یقینی طور پر محسوس کیا کہ تم ہمارے ساتھ گھر

پڑی رہو گے جب تم سفر پر تھے تو تمہارے اس گھر میں تمہارے ہی جنم سے معجزے رونما ہوئے تھے۔

صحرائی گرمی اب غالب نہیں رہی تھی۔ اب عقب سے ہمالیہ کی ٹھنڈی ہوا تھی۔ کچھ غیر ملکی کاریگروں نے بڑے جادوئی طریقے سے تمہارے پورے محل میں ٹھنڈی ہوا بھر دی تھی اگرچہ ہمارے وارڈ میں ایسا نہیں تھا کیونکہ ہمیں تو تمہارے خاندان کو، بھارت کی ہوا کو اپنے اردگرد رکھنے اور اسی میں سانسیں لینے کی اجازت تھی۔ تم ایک چمکدار گاڑی میں آئے۔ یہ سورج کی طرح دن کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اب تم بالکل بدلے ہوئے تھے۔ یورپی لباس میں ملبوس اور تمہارے پہلو میں ایک اجنبی بیٹھی تھی، یعنی کہ ایک مغربی عورت۔ جب تم محل کے دروازے پر پہنچے تو گاڑی رک گئی۔ تم نے نوجوان عورت کو نیچے اتارا اور کہا: "میری پیاری اجنبی پھول، اپنے پیروں کو احتیاط سے اٹھاؤ اور چلتے رہو، کیونکہ یہ تمہارا مستقبل کا گھر ہے!" اس اجنبی نے ہماری طرف دیکھا، ہم یعنی تمہارا خاندان، اور ہم سب دل کی گہرائیوں سے تمہارے سامنے جھک گئے تم، جو میرے شوہر اور میرے بچوں کے باپ ہو۔ پھر وہ اجنبی بڑی حیرت سے بولی: "بہیرہ واقعی تمہارے مددگاروں میں کتنے خوبصورت لوگ ہیں، یہاں کتنا عجیب ہے۔"

وہاں ان کے سامنے کنول کا تالاب بچھا ہوا ہے، اور یہ ہمارے سفید محل کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ محل کے تین دروازے اس کی بالکونیاں، اس کے گنبد، مینار، یہ سبھی شام کی دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ پورا محل ایک بڑے گلابی پھول کی طرح لگ رہا تھا جس کی پتیاں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔

"صرف ایک خواب ہی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے۔" اس اجنبی نے کہا۔

اور تم، میرے پتی، تم نے ہماری طرف دیکھا تک نہ تھا۔ تم نے خود تمہارے اپنے خاندان کو نہیں دیکھا تھا جہاں تمہارے خیالات تھے، وہاں ہم تھے ہی نہیں۔

یہ اجنبی بڑی تھی، تھوڑی سی بھونڈی، اور اس کی آنکھیں آسمان کی طرح نیلی تھیں اور اس کے بال دھوپ میں چمکتے سونے کی طرح لگ رہے تھے۔ اس کا لباس کافی عجیب تھا۔ یہ کسی قلی کے لباس کی طرح موٹا تھا اور اس نے صرف ایک انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے بہت سے عجیب و غریب سفید نوکر تھے جنھوں نے بیشمار سوٹ کیس اٹھائے ہوئے تھے۔ ایسا تھا جیسے وہ ہمیشہ یہاں رہنا چاہتی ہو۔ تم دونوں بالکل خاموش آگے چلتے رہے۔ خوشی تمہارے چہروں پر ظاہر ہو رہی تھی اور پھر تم دونوں دھیرے دھیرے خود کو محل کے مرکزی دروازے سے محل کے سنے سجے ہوئے حصے میں لے گئے۔ سفید نوکروں نے جلدی سے، اندر سے ٹھنڈی ہوا کے دروازے بند کر دیئے۔ پھر ہم نے انھیں مزید نہیں دیکھا۔

اس دن سے، سال کے گرم ترین وقت میں بھی، میں کبھی گرم نہیں ہو سکی۔ سردی چاروں طرف سے مجھ پر چھا گئی تھی۔ میں اکثر اپنے بیٹوں سے پوچھتی تھی کہ کیا اس اجنبی کے کمرے سے آنے والی جادوئی سردی

میرے کمرے میں بھی ہے کیونکہ میرے اندر اور ارد گرد ہر چیز بہت ٹھنڈی تھی۔

وہ مجھے حیرت سے دیکھتے اور یوں سر ہلا دیتے۔ جیسے انھوں نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔

میں اپنے سونے والی جگہ پر گئی اور اپنے آپ کو ایک پرانی آئینے میں دیکھا۔ تب میں فوراً سمجھ گئی کہ میرے بیٹوں نے سر کیوں ہلایا تھا۔ میں ایک بہت پرانے ہاتھی کے دانت کی طرح پیلی پڑ چکی تھی۔ ایسی کہ کوئی گدھ بھی میرے ساتھ نہ ٹھہرے۔ کاش میں دیواروں سے باہر نکلوں اور پھر اس جگہ ادھر ادھر بھٹکنے کے لیے تیار ہو جاؤں جہاں خوشی اور ناخوشی کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔

میں کافی دیر تک اس عجیب شے کو دیکھتی رہی جو مجھے آنا چاہیے تھا اور اچانک ایک خیال نے مجھے میرے اندر سے تلوار کی طرح کاٹ دیا: "اب کچھ ہونا چاہیے"۔ میرے اندر کی مدھم، غیر استعمال شدہ آگ کو عمل میں لایا جانا چاہیے۔ شاید ایک خوف ناک فعل لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس اجنبی کو مرنا پڑے گا۔

کیا اس اجنبی نے میرے پتی اور میرے بیٹوں کے باپ کو مجھ سے چھین نہیں لیا؟ میں پہلی بیوی اب کسی شمار میں نہیں ہوں۔

اور میرے دیوتا جس کی میں عبادت کر سکتی تھی اسی نے مجھے لوٹ لیا ہے۔

میں نے اپنے پہلے نوکر کو بلایا، میرا اپنا پیارا رجا جو میرے باپ کے گھر سے میرے ساتھ آیا تھا۔ اس نے بڑی بہادری اور دل میں خوشی کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو میں نے اسے کرنے کو کہا۔

وہ میرے قدموں میں گر گیا۔ وہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ بھارت کے سماج کے مطابق کچھ ہونا چاہیے تھا۔

"آج رات تم باہر جانا"۔ میں نے خاموشی سے اسے کہا۔ "دریا کے کنارے شمشان گھاٹ پر جانا اور ایک ہیضے سے مرنے والے اور ایک چیچک سے مرنے والے کی لاش تلاش کرنا۔ دونوں لاشوں سے جو کچھ ہو سکے لے لینا، اتنا لینا کہ دونوں اس سے متاثر ہو سکیں۔ اتنا لازمی ہونا چاہیے کہ اس سے دو مر سکیں۔

رجا نے دیر تک میری آنکھوں میں دیکھا اور بولا: "اے میری بڑی مالکن، تم جو ہمیشہ میری زندگی میں رہی ہو، میں طویل عرصے سے جانتا ہوں کہ اس اجنبی کا مرنا ضروری ہے۔ میں نے بھی ابھی عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کرم کے پھل کے نتائج "کا آدھا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو پھر ہم دونوں گے جو اس بوجھ کو اٹھا اٹھائیں گے۔ ہاں، اگر کچھ کیا تو!"۔

"اگلی زندگی میں ہمارے اٹھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میرا یقین کرو میرے رجا، میرے مضبوط اور اچھے رجا، کچھ بھی نہیں۔ ہمارے لیے برداشت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا، کیونکہ ہم نے مستقبل

میں بھی زندگیوں کے لیے ابھی ہی سے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ بھارت کی روایات وا قدار کو کبھی نہیں توڑا جا سکتا۔ اب عمل کی گھڑی ہے"۔

رنجنا سبز پتوں میں کچھ لے کر اندر آیا۔ یہ کچھ زیادہ نہیں تھا لیکن اس نے یقین دلایا کہ یہ کافی تھا۔

میں نے لمبا اور گہرا سوچا، پھر جواب دیا" رنجنا کوئی اپنے دیوتا کو نہیں مارتا۔ اپنے آپ ہی کو مارنا ہوتا ہے۔ اب تم اس مواد کو دو حصوں میں برابر برابر تقسیم کرو۔ آدھا مجھے دے دو، اور ہاں، گھر میں اجنبی کی ضروریات کا خیال رکھنا۔ اب اس میں بیماری سرایت کر چکی تھی، اور شیاطین میرے خدا کے کانوں میں ہنس رہے تھے، مذاق کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ اس نے ایک جنون کی سی حالت میں بھارت کے دیوتاؤں کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ دیوتا، جنھیں وہ ایک غیر ملکی دیوتا کی خاطر بھول گیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے بھی اب اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ وہ پراتھنا کرتا رہا لیکن سب بے سود۔ گھنٹے گزر گئے۔ ایک دن لندن سے کمرے میں ڈاکٹر جمع تھے، بہت سے ڈاکٹر لیکن بے مددگار۔ وہ اجنبی عورت بیماری کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل نہیں تھی۔ بیماری اس میں سرایت کر چکی تھی۔ اب ہر دعا اور ہر دوا بے اثر ہو چکی تھی۔

ایک رات اس نے اپنا سب کچھ ان پر قربان کر دیا تھا جب صبح ہوئی تو میں نے یہ دیکھا اور میں بیمار اور پھی رینگ رینگ کر گھڑی" قربان گاہ" کے سامنے جا گری۔ ایسا تھا کہ جیسے میں اس کے گرد رقص میں ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں بھی نامعلوم میں کسی جگہ چلی جاؤں، میں دیوتاؤں کے لیے آخری قربانی پیش کرنے کی خاطر ناچ رہی تھی۔

وہ اجنبی پہلے مرگئی۔ میں بہت سخت جان اور مضبوط ہوں۔ میں بھارت کی بیٹی ہوں اور بچپن ہی سے متعدی بیماریوں کے خلاف مزاحمت کر چکی ہوں۔ اب میرا وقت بھی آگیا ہے۔ میں نے بھی وہی چیز لی ہے جو اس اجنبی کو دی گئی تھی لیکن اس نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ آج رات کچھ اور ہی کام ہوا۔ میرے "سینڈ گلاس" میں ریت کے آخری ذرے ختم ہو گئے، اور میں اب مزید غم یا تکلیف برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔

بھارت کے دیوتاؤ! میرے دل کے واحد چراغ کی روشنی کی طرف، مستقبل میں، ہمیشہ ہمیشہ میری رہنمائی کرنا۔ میرے دل کا چراغ، میرا پیارا خاوند!

☆☆☆

چوتھی کہانی

سحر کے پنکھ

میں نیتا ہوں جو مندر میں دیوتاؤں کے سامنے رقص کرتی ہے۔ میرے دن گھنٹے کے دن ہوتا

چاہئیں۔ کام کی سرگرمی دھول سے بھرے، کیونکہ ہمیں کام کرنا چاہیے! ہمارے گرو بے رحم اور انتھک ہیں، زندگی کے لیے ان کا جذبہ، ہمارا کام، ہمارا رقص ہے۔

ہمارا ایک بوڑھا گنجا گرو ہے۔ اس کا سر ایک موٹے آم کی طرح رس سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے کتنی ہی بار یہ خواہش کی ہے کہ آم کا سر پھٹ جائے اور اس میں سے ساری کڑواہٹ اسی طرح بہہ جائے جس طرح ایک پکے ہوئے آم کا رس زمین پر گرتے سے بہہ نکلتا ہے۔ میں اور میری ساتھ رقاصائیں اس سے نفرت کرتی ہیں۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا اور سر ہلاتا ہے۔ اس نے آنکھوں کے دو میٹ پہن رکھے ہیں جو ان کی طرف دیکھتے ہے دھندلا جاتا ہے۔ کیا یہ ہمارا مہاراجہ ہے حالانکہ حقیقت میں وہ ایک سانپ کی طرح یوں کاہل ہے جیسے سانپ کے سر سے آدھا بیہوش ہو، وہ ایک دبلا، قابل اعتماد، مرد اعدہ یا اختیار کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھنچی ہیں اور بڑی ہو جاتی ہیں اور پھر گرد و بادل ان سے غائب ہو جاتے ہیں۔ سوچیے، جب اس کی جاہ طلبی کی خواہش ہمیں آزماتی ہے تو وہ آنکھیں کیسی ہوتی ہیں۔ اگر ہماری مہارانی یا کوئی شہزادی اس کے سامنے کھڑی ہو تو وہ خود پسندی کی خوشی سے چمک اٹھتا ہے۔

وہ ایک عجیب ہستی ہے۔ ہمارا پیارا گرو۔ اگر ہم زندگی کو بچانا چاہتی ہیں تو اس کے سامنے کھڑا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ یہ اس کی رہنمائی ہے کہ مجھے یہاں مندر میں اور ہمارے عظیم مہاراجہ کے گھر "فرنٹ ڈانسر" کے طور پر رقص کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔

یہ آم کا سر مجھ سے ہر چیز کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک عورت ہونے سے لے کر اس کے بڑے عزائم کی تکمیل تک۔ جس نے مجھے دھرتی کی بہترین رقاصہ بننے کے لیے اٹھایا۔ میں ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتی تھی اگر میرے اندر وہ کچھ نہ ہوتا۔ جس کا احساس مجھے دلایا گیا تھا۔ تاہم جو کچھ میرے پاس ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں اپنی زندگی کی مکملیت کو رقص میں لاتی ہوں اور وہ سوچتی ہوں کہ میں اس کی تربیت کا بہترین نمونہ اور شاہکار فن ہوں۔

کل میں نے اپنے استاد گرو اور مہارانی کے درمیان گفتگو سنی۔ ہماری برگزیدہ مہاں نے پوچھا کہ کیا میں ایک عورت کے طور پر مہاراجہ کو خوش کرنے کے لیے کافی بالغ ہوں؟ میں دیکھ سکتی تھی کہ آم کا سر بالکل خاکستری ہو گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ شاید وہ مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے لیکن میں ایک انسان ہوں، میں کسی کو دیے جانے کے لیے ہوں نہ اور مجھے کوئی رکھ سکتا ہے کیونکہ میں نیتا ہوں نیتا! جو اس دنیا کے مردوں کے لیے نہیں، صرف دیوتاؤں کے لیے رقص کرتی ہے۔

زمین پر کبھی بھی جگہ کے مقابلے میں۔ میں اپنے دیوتاؤں کی سنہری دنیا میں، اپنے گھر میں ہوں،

جہاں بے رنگی اور خود پسندی ان تمام تیلی ہم جولیوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ جب میں صبح سویرے، بہت تڑکے سمندر کے کنارے رقص کرتی ہوں تو دیوتا مجھے عشق کرنے دیتے ہیں۔ دیوتاؤں کی دنیا میں سحر ہونے کے پنکھ لگاتی ہے۔ سیہ زیورات، موتیوں اور نیلم کی طرح چمکتے ہیں۔ ریشم کے بادل ہوا میں ادھر ادھر موتی لہراتے ہیں، وہاں، دور، بہت دور سورج طلوع ہوتا ہے۔ دیوتا اپنا پھاٹک کھولتے ہیں اور دن کے بادشاہ کے بیٹے کو سورج کی چمکتی ہوئی رتھ پر سوار کرتے ہیں جو خالص سونے کی بنی ہوتی ہے۔

وہ میری طرف بڑھتا ہے۔ آج وہ مجھے رقص کرتے ہوئے دیکھے گا۔ وہ رقص جس کے لیے مجھے اکیلے ہی ناچنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ دراصل دیوتاؤں کا وہ رقص جو اس دھرتی پر پہلے کبھی نہیں ہوا۔ دیکھو، وہ آرہا ہے، صبح کے بادشاہ کا بیٹا۔ قریب سے قریب تر۔ اور میں زمین پر رقص کرنے والی صرف ایک رقاصہ ہوں۔ میں نیلا ہوں اور میرا رقص بے وقت ہے۔ اور دیوتاؤں کی خوشگوار سانس میری موسیقی ہے۔

اگر میں سحر کے پنکھوں کو سمیٹ کر رکھ سکتی تو میں سب سے دور سمندر کے کنارے پر رہتی۔ اور یہاں تمہارا بایاں ہاتھ میرے سامنے ہوتا اور دائیں ہاتھ نے مجھے مضبوطی سے تھاما ہوتا اور تم نے بربط پر گانا گایا ہوتا۔ گانا، جو اب سب کے لیے مر چکا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس گانے کی آواز اور بربط کی سریں، صبح کی دھندلاہٹ میں ابھی زمین پر اور میرے دل میں گونجتی ہیں۔ گانا اور موسیقی ان کے ساتھ ہی مر کیوں نہیں جاتے جنھوں نے انھیں لوگوں کے دلوں میں زندہ کیا ہوتا ہے؟

میں نیلا، ملا تھور مہاراج کے مندر میں مندلی کی پہلی رقاصہ۔ میں اپنے بارے میں اپنے ارد گرد اتنی عجیب و غریب باتیں کیوں سنتی ہوں۔ کیوں دیکھتی ہوں؟ بتاؤ تو! سحر کے پنکھ ہونے کے کیوں ہوتے ہیں؟ مجھے سمندر کے کنارے اکیلے ناچنے کے لیے فجر کے وقت ہی باہر کیوں نکلنا پڑتا ہے؟ میں ہر صبح دیوتاؤں کے زیورات والے کپڑے، جو ہوا میں سوکھنے کے لیے لٹکائے ہوتے ہیں، کیوں دیکھتی ہوں؟ میرے ارد گرد معجزے کیوں ہوتے رہتے ہیں؟

مجھے بتاؤ، اے زمین کی تمام مصوری! مجھے بتاؤ، اے مقدس گنگا! مجھے بتاؤ، اور تم ادھر شمال میں برفیلے پہاڑو! مجھے بتاؤ، اور، مجھے بتاؤ کہ ایک دیوتا، وہاں ہر رات کیوں آتا ہے، اور مجھے گلے لگاتا ہے اور میرے ساتھ کھیلتا ہے تاکہ میں مندر میں قربان گاہوں کے سامنے پورے جوش و خروش اور وجد و خوشی سے ناچ سکوں۔ ایسا کیوں ہے کہ میں اس کی نظر میں، بدفطرت آدمی کی سرکی بدنظروں کو بھول جاؤں؟

وہی دیوتا ہے جو ہر اندھی رات کو میرے پاس آتا ہے۔ وہ آتا ہے جب بڑا ستارہ، کھجوروں کے درختوں کی سب سے اونچی چوٹیوں کے اوپر چمکتا ہے اور اندھیرے میں زندگی بھر جاتی ہے۔ سمندر میں لہروں

کی طرح اندھیرے میں چمک آجاتی ہے۔ اندھیرا چھٹ جاتا ہے اور میں، اپنی سنہری ساڑھی میں چمکتی اور رقص کرتی ہوں۔

ہر شام وہ میرے لیے تحفے لاتا ہے، ساڑھیاں، شفق رنگ سونے کے تاروں اور چاندی کی کرنوں سے بنی اور جواہرات جو اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکتے ہیں۔ اگر میں جگنوؤں تک پہنچتی ہوں تو میرے ہاتھوں میں جواہرات آجاتے ہیں لیکن جب میں جواہرات تک پہنچتی ہوں تو میرے ہاتھوں میں جگنو آجاتے ہیں۔ یہ کیسی خوش بختی ہے جو دن رات مجھے گھیرے رکھتی ہے اور ہر چیز کو تتلی پریوں کی کہانیوں میں بدل دیتی ہے۔

میری ساتھی رقاصائیں، آم کے سر والے بے رحم کے ظلم کے نیچے مرجھا رہی ہیں۔ وہ سب اس کی غلام ہیں۔ میں اکیلی آزاد ہوں۔ اگرچہ میں وہ لڑکی ہوں، جسے وہ سب سے زیادہ گلے لگاتا ہے۔ میں اپنے خلاف اس کی پابندیوں کے تحت، سب سے زیادہ آزاد ہوں، کیونکہ میں لیتا ہوں، دیوتاؤں کی اپنی رقاصہ۔ میرے جسم کو وہ پکڑ سکتا ہے، لیکن میرے تمام خوابوں میں مجھے ایک دیوتا کا بیٹا پسند کرتا ہے، اور آم کا سر میری ساڑھی کو بٹنی میں نہیں روند سکتا۔ وہ مجھ پر کوئی بھی پابندی لگا سکتا ہے لیکن وہ مجھے چھو نہیں سکتا کہ میں حقیقت میں کیا ہوں۔

آج میں سب لوگوں کے سامنے ناچوں گی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آج بھارت کا ایک بڑا دن ہے اور اسی لیے ایک بڑے جشن کا سماں ہے۔ ہم اپنی تربیت کے اوقات سے فارغ، نیم کے پیڑ کے سائے تلے کھیلتی آزاد ہیں۔ باقی آزادی سے خوش ہیں، وہ سیکھنے سے نفرت کرتی ہیں۔ میں تنہا اجنبی مذاہب، رسم و رواج کے بارے میں جاننا پسند کرتی ہوں۔ کچھ دن پہلے ہمارے استادوں میں سے ایک نے ہمیں "ہارپسٹ" کے بارے میں بتایا تھا جو کسی زمانے میں رہتا تھا اور سچ کے بارے میں گاتا تھا۔ میں اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ میرا استاد اس کے بارے میں بہت کم جانتا تھا، صرف اتنا اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس سحر کے پنکھ تھے اور وہ سب سے دور سمندر کے کنارے پر رہتا تھا اور یہ کہ اس کا گانا اب بھی ہلکی رحمت کی روشنی میں بھی بار بار گونجتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اس کے "ہارپ" کی آواز پر اپنا سب سے خوبصورت رقص کر سکتی ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم مہاراجہ تھا جس نے نافرمان لوگوں پر ایک مضبوط حکومت کی۔ کون جانتا ہے، شاید اب میرا یہ اس چھپتا بیٹا ہے جو دیوتاؤں کے درمیان رہتا ہے اور اب بھی مجھ سے ملنے آتا ہے جیسے کہ ہمارے نوجوان دیوتا کرشنا نے دریا کے کنارے چرواہوں سے ملاقات کی تھی۔

بہرحال میں یہ بانسری بجاتی ہوں۔ سحر کے سنہری پروں پر یہ بانسری بجانے والا وہی ہے جو مجھے تب ملنے آتا

ہے جب آسمان کا عظیم ستارہ کھجوروں کے پیڑوں کی چوٹیوں کے اوپر چمکتا ہے۔ اب سورج کی گیند اتنی مضبوط اور گرم ہو چکی ہے کہ کوئی بھی اس پر سوار نہیں ہو سکتا۔ وقت آن پہنچا ہے۔ مجھے اپنی دیوی ظان میں ملبوس ہونا چاہیے اور ناچنا چاہیے۔

اور آج تو میں ایسا ناچوں گی کہ آم کا سر بھی اپنا لالچ بھول جائے۔ میں ایسا ناچنا چاہتی ہوں کہ اس کا موٹاپا اس سے اتر جائے، ناچ، جس کی رعنائی، اسے اس کا اشتعالادین بھلا دے۔

جشن کے میدان میں ہزاروں لوگ بیٹھے ہیں اور ہم رقاصاؤں کی ٹولی پر امید سے مسکراتے ہیں۔

آم کا سر بے تابی اور بے بسی کا کڑوا پسینہ بہا رہا ہے۔ اس کے لیے کوئی سایہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنے دل میں امنگ کی آگ اور دھوپ کی بے رحمی کو اپنے سونے جسم پر لے رکھا ہے۔

آج کے دن تمام لوگوں کو دکھایا جائے گا کہ کیا وہ ہمارے ذریعے امر ہو جائے گا جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ اس نے ہمیں رقص کی نعمت دی ہے۔ دیوتاؤں کو پہلے ہی سے لا تعداد ہاروں سے سجایا گیا ہے۔ مندر کے ہال میں بھی لوگوں کے لیے جگہ نہیں، اس لیے دیوتاؤں کی نمائندگی مندر کے باہر زندہ رقاصائیں کرتی ہیں، اور وہ سچائی سے ایسے رقص کرتی ہیں جیسے وہ خود دیوتاؤں کی بچیاں ہوں۔ آج مجھے ان پر فخر ہے۔ ہجوم خاموش ہے لیکن جب میں داخل ہوتی ہوں تو پنڈال پر گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ سکوت، مکمل سکوت! ایسا لگتا ہے جیسے زمین پر میرا کوئی گھر نہیں۔ میں دیوتاؤں کے بارے میں لوگوں کے خوابوں کے بیچ میں رقص کر رہی ہوں۔

غریب لوگو! تمہیں ان عظیم لوگوں کے بارے میں ایک خواب ہی دیکھنا ہے جو کبھی ہمارے ساتھ رہتے، کھیلتے اور خوش ہوتے تھے۔ تم یہ بھی کیسے جان سکتے ہو کہ ہر رات اور ہر دن میں اپنے دیوتا کے ساتھ ایک ہوں اور صرف اسی کے لیے ناچتی ہوں!

اب میں سیدھی ہو جاتی ہوں اور ایک ہی پاک لمحے میں اپنے بازو دھوتیوں کی ہوا میں پھیلاتی ہوں اور ناچنا شروع کر دیتی ہوں۔ وہاں، وہاں شام کی سرخی میں سے میرا دیوتا مجھ سے ملنے کے لیے آتا ہے۔ حیرت زدہ ہو کر، میں اپنی ساتھی رقاصاؤں سے منہ موڑ لیتی ہوں جو دیوتاؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے، یہاں تمام لوگوں کے درمیان، دیوتا کا لائق ترین بیٹا مجھ سے ملنے آتا ہے۔ اس سے پہلے میں نے اسے دن کی روشنی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے اس کے ارد گرد ہر چیز مدھم تھی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کتنا خوبصورت اور کتنی بڑی بڑی آنکھوں والا تھا۔ اوہ! اس کے خوبصورت لمبے بال، دھوپ میں کیسے سونے کی طرح چمکتے ہیں!

میرے پاؤں تیزی سے، بڑی تیزی سے ناچتے ہیں۔ دیکھو میں تمھاری طرف دوڑتی ہوں، تم، میری آرزو کی مٹھاس۔ میں اب زمین کو نہیں چھوتی۔ میں پھولوں کے جھونکے کی طرح ہلکی ہوں۔ میری لمبی چندریا، چاندنی رات میں کنول کی جھیلوں پہ دھند کی طرح میرے گرد گھومتی ہے۔ ہمارے چاروں طرف چاندی کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہجوم نہیں رہا اور یوں کہ جیسے آم کا سر بھی تمھارا نہیں جو مجھ پر قلم کا سوچے۔ میں دنیا میں تمھارے ساتھ بالکل اکیلی ہوں۔ تم مجھ پر جھکتے ہو۔ میں تمھاری بانہوں میں واپس کھنچتی ہوں، اتنا پیچھے کہ میرا سر زمین کو چھو لیتا ہے۔ تم اتنا آگے جھکتے ہو کہ اب میرے منہ تک پہنچ سکتے ہو۔ تمھاری سانسیں کشمیر کی بہار کے تمام پھولوں کی طرح خوشبو سے بھری ہوئی ہیں اور تمھاری آواز مندر کی گھنٹیوں کی آخری آواز کی طرح ہے جو ٹھہر جایا کبھی کانوں میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ تم اتنا سویرے جلدی مجھ سے کیا چاہتے ہو، اے دیوتا کے خوبصورت و شاندار بیٹے، ہمارا ستارہ مجوروں کے اوپر چوٹیوں پر نہیں ہے؟ تم یہاں میرے ساتھ بات نہیں کر سکتے اور ہمارے شاندار محل میں رات کے جواہرات اور بھگوڑوں کو ایک ساتھ نہیں ملا سکتے۔ تمھاری وجہ سے میں ناچتی ہوں، تیز، ناچتی ہوں، تیز، بہت تیز ناچتی ہوں۔

اب ہم اکیلے ہیں۔ کائنات میں کوئی آواز نہیں لیکن تمھاری سانسوں کے ساتھ، وقت کے ساتھ، میری پازیب کی دھندلی سی آواز ہے جو مجھے بغیر کچھ محسوس کیے رقص کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ بس میں رقص کرتی ہوں۔ یہ زندگی کا رقص ہے، جو میں تمھارے لیے کر رہی ہوں اور اے میرے دیوتا، کیا تم سمجھتے ہو؟ تم وہ آسمانی چمک میرے دل میں لے آئے ہو، وہ آسمانی چمک جو میں ہمیشہ اپنی زندگی کے خوشگوار لمحوں میں دیکھتی تھی۔

ابتدا ہی میں، میرے نامعلوم والدین نے مجھے مندر کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ میں صرف ایک لڑکی تھی، اور کسی کو معلوم ہوا کہ دیوتا کے بیٹے کی محبوبہ بننا میرا مقدر تھا۔

میں نے پہلے کبھی اتنی دیر تک رقص نہیں کیا، اور اب میرے تلوے اتنے پھولے ہوئے ہیں کہ اب میرے پاؤں نہیں ہیں۔۔۔ یہ تو پنکھ ہیں، پنکھ! میرے پنکھ جو مجھے اوپر اٹھا کر لے جاتے ہیں تاکہ میں ناچوں، ناچوں، اور پھر میں ناچتی ہوں، اور میرے محبوب کی سانسیں مجھے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں، دور، اس سے کہیں دور جو معلوم ہے اور اس سے بھی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میرے دیوتا کے ہاتھ نہیں ہیں۔ اس کے نیلے پنکھ ہیں جو شام کے ڈھلتے سورج میں ٹھہر جا پانی ہو جاتے ہیں۔

اب ہم ہجوم میں نہیں کھلتے۔ ہمارے اردگرد صرف شور ہی شور ہے، شور۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے زمینی مٹی کے زوال کے اثرات اب مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہاں ہاں، مجھے لگتا ہے کہ میں جیت چکی ہوں! جیسے ہی میں ناچ رہی تھی، دوسرے زمینی لوگ بھی ناچ رہے تھے لیکن وہ یہ نہیں جان سکے کہ ایک دیوتا کی سانس نے

مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور یکہ میں شام کے سرخ پنکھوں سے اوپر، بلند ہو چکی ہوں۔

الوداع سمندر۔ الوداع اور تم بے ذائقہ آسمان کا سر۔ الوداع زندگی کا پورا خواب۔ الوداع۔ اب جب کہ میرے پاس خود اپنے پنکھ ہیں، میں اس جگہ پر اڑتی ہوں جہاں میرا دیوتا اور میں دونوں شام کے سرخ و سرمئی رنگ میں ایک ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

پانچویں کہانی

بت تراش کا چاقو

میں ایک مجسمہ ساز ہوں اور صرف ایک غریب ہنرمند کاریگر ہوں۔ میری واحد دولت میرا چاقو ہے لیکن اس میں بہت ہی عجیب و غریب خصوصیات ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ جادوئی ہے اور یہ کہ یہ خود معجزات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ساگوان کے سخت ترین ٹکڑے بھی مکھن کی ڈلی کی طرح کاٹ دیتا ہے۔ میں نے اپنا چاقو دیوتاؤں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہ ان کی طاقت ہے جو میرے کمزور ہاتھوں اور میرے اچھے چاقو کی رہنمائی کرتی ہے۔ میں نے بیشمار دیوتاؤں کے مجسمے بنائے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ حیرت کے بعد حیرت کیسے سامنے آتی ہے، جب میں کوئی بت بنانے کے لیے سخت لکڑی میں سوراخ کرتا ہوں تو یہ تخلیق دیوتاؤں کی مرضی ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری جوانی کے دنوں کی دھوپ یہی تھی کہ زمین پر دیوتاؤں کی مرضی پوری ہو جائے۔ پنڈت، پجاری اکثر گاتے ہیں: "اہم برہما ہے"..... میں برہما ہوں... ان بتوں سے پہلے جو میرے چاقو نے تراشے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم انسان زمین پر دیوتاؤں کی طاقت ہیں۔ دیوتا ہمارے ساتھ نہیں بلکہ ہمارے ذریعے کام کرتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو، وہ کبھی کبھی میرے ذریعے بھی کام کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ ناخواندہ بھکاری اپنی مشقتی آوارہ گردی کے دوران بھی یہی گنگناتے ہیں: "اہم برہما ہے"۔ اور میں بھی اسی کا جاپ کرتا ہوں۔ اس سے مجھے لکڑی پر چاقو کی جادوئی مشق کرنے پر یقین کرنے کی طاقت ملتی ہے تاکہ اس لکڑی سے جو تخلیق کیا جانا ہے اور جو ہونا ضروری ہے، وہ ہو جائے۔

میں ان لوگوں کے لیے ایک دکھی بھکاری کے سوا کیا ہوں جو مجھ سے اور میرے چاقو سے کام لیتے ہیں۔

میرا استاد، میرا مالک، جو مجھے مسترد کرنے یا اپنے کام میں رکھنے کی طاقت رکھتا ہے، اکثر مجھ پر مسکراتا اور کہتا ہے: "میرے بھائی تم بہت سادہ ہو لیکن تمہارا چاقو تمہارے بارے میں بہت کچھ کہتا ہے، یہ

تمھارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے"۔

سچائی ضرور ہونی چاہیے، کیونکہ میرے کمزور ہاتھوں کے بچے دیوتا یہاں سے آزاد ہو سکتے ہیں لیکن میرا سب سے بڑا خواب ابھی تک پورا نہیں ہوا۔ میرا خواب کہ میرے خوابوں کی دیوی مجھے اپنا درشن کرائے، اپنا چہرہ دکھائے۔ مندر کا مکھ پجاری تک میرے پاس اُس وقت آیا جب میں متھرا میں ایک بڑے مندر میں قربان گاہ کے لیے ایک دیوتا پر کام کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک کھڑا رہا اور دیکھتا رہا کہ جب میں بت تراش رہا تھا تو کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بہت اچھی ہیں، وہ ایک منتقی ہے جس کے ذریعے دیوتاؤں نے کام کیا ہے اور بہت سی یادگاریں اور مندر حاصل کیے ہیں۔ اسی لیے میرا چاقو سخت سے سخت لکڑی کو اتنی آسانی اور خوشی سے کاٹ لیتا ہے۔ اچانک وہ مجھ سے بولا: "آسمان اور زمین کی سب سے خوبصورت دیوی کے بارے میں کیا خیال ہے، کیا تمھارا چاقو اُسے ڈھونڈ سکتا ہے، یا تم خود اسے درختوں کے تنوں کی قید سے آزاد کرائے بغیر ہی مر جاؤ گے؟"۔

میں نے قدرے رک کر جواب دیا،

"شریمان، آپ کیسے جانتے ہیں کہ اُسے ڈھونڈ کر آزاد کر دیا جائے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تو میری زندگی کا خواب ہے آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جب سے میرے ہاتھ میں چاقو آیا ہے، میں دن رات اسے ڈھونڈ رہا ہوں لیکن جتنا میں نے اسے تلاش کیا، اتنا ہی وہ مجھے ٹالتی گئی۔ کبھی کبھی میں نے اس کی جھلک کسی کسی دیوتا کی آنکھوں، ناک یا چہرے پہ دیکھی ہے لیکن یہ بھی صرف دھندلی سی۔ افسوس کہ جھلک بھی جس کا میں نے خواب دیکھا تھا۔ زندگی بذات خود کتنی سیدھی ہے لیکن کبھی دیوی کو درخت سے آزاد کرانا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا"۔

مندر کا مکھ پجاری کافی دیر تک میری طرف ان آنکھوں سے دیکھتا رہا اور ظاہر ہے کہ اس نے میرے جرأت مندانہ جواب کے لیے مجھے معاف کر دیا۔ آخر کار وہ بڑی دھیمی آواز میں بولا: "شاید ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے، دیوتا صرف اپنا خود کو وہاں کرتے ہیں جہاں ان کی روح میں تمام زمینی رکاوٹوں کو عبور کر سکتی ہیں۔" لیکن اس سے اس کا کیا مطلب تھا یہ میں نہیں جانتا۔

وہ مہا مکھ پجاری، ایک بہت ہی معزز آدمی ہے اور میں، میں تو صرف ایک بت تراش، نقش و نگار کرنے والا دیوتاؤں کا غلام ہوں۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے ہیں۔ وقت نے میرے بالوں پر سفید برف ڈال دی ہے۔ میری آنکھیں اشکبار ہیں۔ میرا دماغ اس عظیم مہربان کی تلاش میں تھک گیا ہے، جسے میں پانا چاہتا ہوں۔ میں جل گیا ہوں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ یہاں متھرا میں میرا کام کرنا میرا آخری کام ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ مون سون سے پہلے، اس کام کا ختم ہو جانا ضروری ہے۔ بت تیار ہو جانا چاہیے۔ اور یہ بھی،

میں جانتا ہوں کہ، میں اپنی آخری طاقت کے ساتھ اپنے پیارے چاقو کے ساتھ مل کر یہ معجزہ کر دکھاؤں گا۔

عظیم مندر کی جگہ پر اب بھی ہلکی دھند، دھوئیں کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ عبادت کرنے والا ہجوم ختم ہو چکا ہے۔ میں لکڑی اور چاقو کے ساتھ اکیلا ہوں۔ مجھے گھر جانا چاہیے۔ میں نے آج صبح سے کچھ نہیں کھایا، روشنی مدھم ہے۔ لیکن زندگی میں سب سے مضبوط بھی، کبھی کمزور ترین کے ذریعے اپنا بہترین اظہار تلاش کر لیتا ہے۔ ایک پنڈت نے ایک بار یہی تو کہا تھا جب میرے چاقو نے بڑی کامیابی کے ساتھ لکڑی کا ایک بہت ہی خوبصورت دیوتا تراشا تھا۔

دن گزر گیا ہے۔ کبھی کوئی دن اتنا خراب نہیں تھا کہ میرا ہاتھ اتنا کمزور ہو جاتا، جتنا آج تھا۔ او، کبھی دیوتاؤ! اس دن مجھ پر واضح ہو گیا ہے کہ میری دیوی میرے چاقو کے ذریعے کبھی میرے پاس نہیں آئے گی۔ ان گنت دن آئے اور گزر گئے۔ اس دیوی کے بے شمار خواب دیکھے جو سب مٹ گئے۔ میرے اندر سب کچھ بجھ اور خالی ہو گیا۔ وہ نظارے جن میں میں نے اسے دیکھا، حسین ترین، سب سے زیادہ مہربان، وہ ختم ہو گئے۔ اس سے بہتر تھا کہ میں مر گیا ہوتا۔ میں اپنے چاقو کو اپنے دل میں اتار کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔

کاش کوئی اپنی زندگی کے بچے، خوبصورت خوابوں کے بارے میں، اپنے خوابوں کو بھول سکے، کیونکہ ان کی یاد کا درد، دل کے کمزور ہو جانے کا سبب بنتا ہے۔ جب کسی کے سب سے اچھے خواب مر جاتے ہیں تو یہ غریب جسم کے لیے موت کی اصل اذیت سے بھی زیادہ اذیت دہ ہوتا ہے۔ او مہربان دیوی! تو کبھی میرے پاس نہیں آئی، اور جب میں تجھے بہت زیادہ ڈھونڈ رہا تھا تو نے ہمیشہ منہ موڑے رکھا۔ آج رات جب میں کام کر رہا ہوں تو یہ جانے بغیر کہ میں کیا کر رہا ہوں تو ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے اب یہ مجھ پر واضح ہو چکا ہے کہ میں تجھے اور اپنے چاقو کو اور تمھارے بارے میں اپنے سبھی خیالات و محسوسات کو الوداع کہنے کے لیے تیار ہوں۔ پرانے دنوں میں ایک بار جب میں "ہیرو واڑ" کے قریب ایک مندر میں کام کر رہا تھا تو، ایک شام کو میں نے دیکھا کہ میں پہاڑوں میں گھوم رہا ہوں، اور سورج اپنی آخری شعاعیں برفانی وسعتوں پر گرا رہا ہے اور تم، بلند ترین چوٹیوں میں سے ایک، روشن چوٹی پر مجھ سے ملنے آئی ہو تم اتنا قریب آ گئی کہ میں نے تمھارے لیے اپنے ہاتھ بڑھائے لیکن میں صرف خالی ہوا کو ہی پکڑ سکا، کیونکہ تو صرف ایک خواب تھی، تو ایک سایہ تھی۔ تو حقیقی نہیں تھی تو صرف ایک سایہ تھی، صرف ایک پرچھائی۔ میرے ذہن میں زندگی کی قوت نے ایک دیوی کا روپ دھار لیا لیکن یہ میری زندگی میں صرف ایک سایہ تھا اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عجیب بات ہے کہ آج رات چاقو کتنا مصروف ہے۔ یہ بالکل بھول گیا ہے کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، اور میرا جسم بھوک سے نڈھال ہے۔ اتنی نرم لکڑی اس کے نیچے یوں آ جاتی ہے کہ میں دیوتا کے اعضا کو

سخت گدّے (ماس) سے باہر نکال لوں۔ ناک اور کان بالکل ٹھیک تراشنے میں کتنے آسان ہیں۔ آنکھیں سیدھی گوہر میں چمکتی ہوئیں۔ عجب بات ہے کہ ہر چیز کتنی آسانی سے شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تاج ماتھے کے گرد مضبوطی سے بند ہو جاتا ہے، منہ نرم محسوس ہوتا ہے۔ جلدی چاقو سے مزید کچھ چیزیں بدل جائیں گی۔ صبح کی روشنی مندر کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتی ہے۔ مجھے دریا کے بہنے کی گرج سنائی دیتی ہے۔ سوچو، اب صبح ہو چکی ہے۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کیا میں نے رات بھر یہاں کام کیا ہے۔ اور ہوا کیا۔ میں مشکل سے اپنے چاقو کے کام کی طرف آنکھ اٹھانے کی ہمت کرتا ہوں۔ کیا میری دیوی، آخری رحمت کے طور پر، مجھے کسی قسم کا معاوضہ دیجے گی کیونکہ وہ خود تو میرے پاس نہیں آ سکتی؟

یہاں صبح بہت خاموش ہے۔ لیکن جلدی لوگ یہاں دیوتاؤں سے آج کے دن کے لیے آشیرواد مانگنے آئیں گے۔ میں یہاں ایک اندھیرے کونے میں چلا جاؤں گا اور وہاں کھڑا ہو کر ان کے چہروں کو ویسے ہی دیکھوں گا جیسے وہ میرے دیوتا کی پوجا کر رہے ہوں گے۔ میں اس منظر کو ان کی آنکھوں سے دیکھوں گا، اور پھر میں اپنی نظریں اپنے چاقو کے عظیم کام کی طرف کروں گا۔ جلدی سنکھ بجاری آ جائے گا۔ اب پہلے بچے آئے ہیں۔ رام کرپا کرے کہ بچے سب سے پہلے میرے دیوتا کو دیکھیں۔ ان کے چھوٹے بھورے پاؤں مرمر کے فرش پر بڑی نرمی و آہستگی سے پڑ رہے ہیں۔ دیکھو، ان میں ہر ایک کے ہاتھ میں پیلے پھولوں کے ہار ہیں۔ انھیں قربانی دینی پڑتی ہے۔ وہ سب سے پہلے کس دیوتا کے پاس جائیں گے، اور کس کو پھول چڑھائیں گے؟ وہ کافی دیر تک وہاں کھڑے رہے۔ پھر ایک گول آنکھوں والا لڑکا اس طرف دیکھتا ہے جہاں میرا آخری تراشیدہ کام پڑا ہوا ہے۔ اس کی گول آنکھیں چمکتی ہیں اور وہ حیرت سے کہتا ہے: "میں اپنا پھولوں کا ہار اس پر چڑھاؤں گا، یہ تو میری ماں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے"۔

"واہ!" میں حیرت سے سوچتا ہوں۔ ٹھیک ہے، وہ بچہ ہی تو ہے، وہ دیوتا اور دیوی میں فرق نہیں جانتا۔ اب بہت سے لوگ آ رہے ہیں۔ وہ بھی پھولوں کی چادریں اور ہار لے کر آئے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ ادھر اُدھر جہاں میرا دیوتا، جسے میں نے کل رات ہی تراشا تھا، کھڑا ہے، وہاں تھوڑی تلاش کے بعد وہ آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اب دوسرے پنڈت، پجاری بھی آتے ہیں۔ وہ معمول کے مطابق سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں تاکہ پوجا کے لیے بڑی قربان گاہ تک پہنچ جائیں لیکن اندھادھند اس طرف دیکھتے ہیں جدھر باقی سب لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک پرسکون روشن حیرت نمودار ہوتی ہے۔ اچانک وہ اونچی آواز میں الاپنا شروع کر دیتے ہیں "آہم برہما سمک"۔ ایک خوش کن دھاڑ کی طرح اب پورے مندر میں یہ آواز آتی ہے۔ "آہم برہما۔۔۔۔ آہم برہما۔ میں برہما ہوں۔ میں برہما ہوں۔ آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، ہاتھ خود بخود ماتھے

تک اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے کہ میری وجہ سے کوئی اُسے پہچان سکے وہ سب اُس کے سامنے خاک پر جھک جاتے ہیں۔ اس کی طرف ابھی تک مجھے نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی لیکن اب میری آنکھیں دیکھنے کے لیے کافی تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے اب تک جو کچھ دیکھا وہ دوسروں کے ذریعے ہی دیکھا۔

کچھ تو خاص اثر تھا ورنہ میرے دیوتا کے سامنے ہر کوئی سرنگوں کیوں تھا۔ کیا واقعی کسی دیوتا نے میرے تراشیدہ بت پر کوئی پھونک ماری تھی کہ وہ زندہ ہوا؟ اتنا زندہ کہ فوراً اس کی پوجا کی جاتی۔ ورنہ دیوتا بھی جانتے ہی ہیں کہ لکڑی کے بنے ہوئے اور مشکل دیوتا کو گھر میں موجود ہونے میں کافی وقت لگتا ہے۔

مندر میں خاموشی ہی خاموشی ہے اور ہر کوئی بالکل بے حرکت پڑا ہوا ہے گویا وہ خود لکڑی سے تراشے گئے ہیں۔ شاید ہی کوئی روحوں کو سن سکتا ہے لیکن اب پجاری آلاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی معمول کی آواز میں نہیں، نہیں، ایسا لگتا ہے کہ ان کی آوازیں خود دیوتاؤں کی قربان گاہ کی اندرونی چمک سے اُٹھ رہی ہیں۔۔۔۔۔"
آہم برہما، ہے۔۔۔۔۔ آہم برہما، ہے"۔ اب ہر کوئی یہی منتر آلاپ رہا ہے اور میں خود بھی خوشی کے آلاپ میں اپنی ہلکی سی آواز کو بلند کرتا ہوں اور آلاپ کی گرج کے بیچ میں نے اوپر دیکھنے کی ہمت کی۔ لیکن نہیں۔ میں کچھ نہیں پا رہا ہوں کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کل رات ایک دیوتا بنایا تھا جس کے بارے میں میں نے سوچا تھا لیکن وہاں میرے سامنے تو ایک سب سے خوبصورت دیوی کھڑی تھی جو کبھی اس ناممکن دھرتی پر اتری تھی۔ میرا پورا اندر بے نام خوشی سے بھرا ہوا ہے کیونکہ اگر میں ٹھیک دیکھوں تو میری دیوی میرے سامنے روشن اور زندہ کھڑی ہے اور کیا وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی؟ میں نے سرگوشی کرنے کی جسارت کی "تم یہاں کیسے آئی ہو اور کون تمہیں یہاں لایا ہے؟" وہ ہجوم میں سرگوشی کرتی ہے "یہ بھی تو ہے کہ ہر زمانے کا ایک معجزہ ہوتا ہے۔ تمہاری آرزو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ تمہارے ہاتھ نے مجھے بنایا ہے" لیکن پھر مجھے اس کے لیے زمین پر بھی جھکنا پڑتا ہے۔

اب مندر کے کھلے دروازوں سے باہر، جمنا کے بھاری بہتے پانیوں سے، بہت پرے، ہر چیز اور ہر ایک میں برہما کی زندگی کا مشترک آلاپ گونجتا ہے اور آلاپ میں طاقت ہے۔ یہ اتنی مضبوط ہے کہ یہ برف کے گھر، ہمالیہ تک پہنچ جاتی ہے، ہمالیہ! دھرتی پر دیوتاؤں کا مسکن!

☆☆☆☆

گنتھر گراس (جرمنی)

جرمن سے ترجمہ: رور غزالی

گنتھر گراس کی ایک کہانی

جرمن ادب میں موجودہ دور کے سب سے اہم شاعر، ادیب اور مصور کا نام گنتھر گراس ہے۔ آپ 16 اکتوبر 1927 کو پولینڈ کے شہر ڈانزگ میں پیدا ہوئے جو کبھی جرمنی کا حصہ رہا ہے۔ 13 اپریل 2015 کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ گنتھر گراس کی موت جرمنی میں ادب کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی ایک سوگوار تاثر چھوڑ گئی۔ ان کی موت ادب کا ناقابل تلافی نقصان تصور کیا گیا۔

وہ ایک عام سے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ان کے والدین کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ انھوں نے ادب اور خاص کر نثر میں بہت نام کمایا۔ انھیں 1999ء میں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں دوسرے بے شمار انعامات سے نوازا گیا۔ وہ عالمی سیاسی معاملات پر اپنی رائے قائم کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ وضع دار اور مقبول سمجھے جاتے تھے۔ اپنی آخری اور متنازعہ ترین نظم جس میں انھوں ایران اور اسرائیل کے مابین تنازعے میں اسرائیل کی ایران پر ایٹمی حملے کی شدت سے مذمت کی تھی اور ان پر اسرائیل میں داخلے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ اس دوران وہ زیادہ تر وقت علالت میں رہے۔

جان اروِنگ جو کہ خود ایک بڑے دانشور ہیں انھوں نے ان کے انتقال پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب کوئی تمھاری ثانی نہیں، کم از کم ان جیسا۔ جان اروِنگ کا جو اپنے ناول ہوٹل ہمپشائر کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبول ہیں، کہنا ہے کہ گراس اپنے ناول ٹن ڈرم کی نسبت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ گراس کھلونوں کے بیوپاری تھے، اپنے سارے کھلونے لیکر اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں اور ہمیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی ایک مدورجہ متنازع نظم:

ابتدائی حملے کا خود ساختہ حق

اس کا شور
کوڑے کے ڈھیر سے اٹھنے والی سیاؤں ہے
جیسے جشن میں
بجائی جانے والی تالیوں کے شور میں بدلا جا رہا ہے

یہ ایرانی قوم کو ختم کرسکتا ہے (ابتدائی حملہ)
... صرف اس لیے کہ اس پہ شبہ ہے
کہ وہ ایٹم بم بنا رہا ہے
میں کیوں خاموش رہوں
بہت لمبی ہے مری خاموشی
یہ عیاں ... ہے یہ شاطرانہ چال ہے

دوسری جنگ عظیم میں پندرہ سال کی عمر میں ان کی اپنی تصنیف میں بیان کردہ حقیقت کے مطابق، انھوں نے ابتدائی ہچکچاہٹوں سے جان بچانے کی خاطر آزادانہ طور پر فوج میں فضائیہ کے مددگار کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ 8 مئی 1940 کو قید کر لیے گئے اور 26 اپریل 1936 تک وہ امریکی فوجیوں کی قید میں رہے۔ نازی جرمنی کی فوج میں اپنی مرضی سے شمولیت کا انکشاف 2006 اپنی سوانح حیات میں کرنے بعد گراس بہت مشکلوں میں پھنس گئے۔ ان سے نوبل انعام کو واپس لیے جانے کا مطالبہ کیا گیا مگر وہ گراس ہی کیا جو ہار مان لیتے۔

گراس نے برلن اور اشٹٹگارٹ شہر میں اپنے پینٹنگ اور گرافک فن پاروں کی نمائش کے ساتھ ہی لکھنے کا آغاز کیا۔ پہلے پہل انھوں نے نظمیہ شاعری، ڈرامے، تھیٹر وغیرہ لکھے اور شائع کرائے۔ 31 سال کی عمر میں سن 1959 میں انھیں اپنی کتاب اور پہلے ناول بلش ٹھرومل ٹین کے ڈھول کے ذریعہ انھیں ادبی حلقوں میں شہرت ملی۔ ان کے اسی ناول کو بعد میں فولکر شلونڈورف نامی فلم ڈائریکٹر نے فلما کر انھیں شہرہ آفاق پر پہنچا دیا۔ اس ناول میں انھوں نے جرمنی کی تاریخ 1899ء سے لیکر آج کے جدید جرمنی تک کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے سیاست میں بھی حصہ لیا۔

1969 میں شہر اشٹٹگارٹ میں گراس نے وہاں کے ایک چرچ میں ایک مضمون پڑھا اور اس میں ایک نازی رکن کا تذکرہ کیا جس نے بعد میں خودکشی کر لی تھی۔ انھوں نے سیاست میں بھی حصہ لیا۔ مختصر گراس کی ایک مشہور کتاب "میری صدی" کی ایک کہانی کا یہاں ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

انیس سو سینتالیس

اس موسم سرما میں تھرمامیٹر کا پارہ نقطہ انجماد سے نیچے منفی 25 درجے کے نشان پر تھرک رہا تھا۔ اور دریا کے اپنے موج رہے اور ان کے پانی کے جم جانے کی وجہ سے معدنی کوئلے کی ترسیل ملک کے مغربی حصوں کو

ناممکن ہو چکی تھی۔ میری بحیثیت وزیر توانائی یہ ذمہ داری تھی کہ میں شہر ہمبرگ کو توانائی کی ترسیل کے کام کی نگرانی کروں۔

وزیر اعلیٰ جناب براؤر کے بیان کے مطابق ایسی سنگین صورتحال اس سے قبل جنگ عظیم کے دوران بھی نہ ہوئی تھی۔ اس مستقل نقطہ انجماد سے نیچے کے درجہ حرارت والے موسم میں اب تک پچاس افراد سردی سے ٹھٹھر کر مر چکے تھے جبکہ پچھلی دہائی میں بھی لا تعداد اموات ہو چکی تھیں۔ حکومت کی جانب سے مہیا کردہ ہال جو کہ عام لوگوں کی سہولت کی خاطر گرمی پہنچانے کا کام دیتے تھے تھوڑی بہت حد تک شہر کے مختلف حصوں میں لوگوں کو سردی سے بچانے کے کام آرہے تھے۔ یہ ہال شہر کے مختلف حصوں مثلاً آسٹوول، بارمبیک، وِنڈسبیک اور لانگن ہورن میں قائم تھے چونکہ پچھلے سال جمع کیے گئے کوئلے کے ذخیروں پر، برطانوی قابض سرکار نے فوجی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور ہمبرگ شہر کے لیے بجلی پیدا کرنے والی اور بجلی ترسیل کرنے والی کمپنی کا اپنا ذخیرہ صرف چند ہفتوں کے لیے ہی بچ رہا تھا۔ اس لیے بجلی کی بچت کے پروگرام پر نہایت سختی سے عمل کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔

شہر کے تمام حصوں میں بجلی روک پر عمل ہو رہا تھا۔ شہری ریل اور ٹرام نے اپنی سروس میں کمی کر دی تھی۔ تمام ریستوران رات کو نو بجے بند ہو جاتے۔ تھیٹر اور سینما گھر بند پڑے تھے۔

ہزاروں اسکولوں میں تدریس بند کر دی گئی تھی۔ ایسی تمام صنعتیں جو ضروریات زندگی کی نہایت اہم اشیاء نہیں تیار کرتی تھیں اول تو بند تھیں اور اگر ان میں سے اکا دکا میں کام ہو بھی رہا تھا تو محض جز وقتی۔ اس سے بھی بڑھ کر بری حالت یہ تھی کہ ہسپتال بھی بجلی کی کمی کا شکار تھے۔ مثال کے طور پر برز اسٹریٹ میں واقع ٹیکہ برائے صحت عامہ کے مرکز میں ایکسرے لینے کا کام بند کر دیا گیا تھا۔ مشکل در مشکل یہ ہوئی کہ ایک سال قبل ہی تیل کے بیج کی پیداوار میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی اور اس کمی کے باعث تقسیم ہونے والی غذا میں چکنائی جو پہلے ہی نہایت قلیل تھی اب صرف کاغذی طور پر فی کس 85 گرام مصنوعی گھی کی صورت میں باقی رہ گئی تھی۔

ایک جانب برطانوی سرکار نے وہیل مچھلی کے شکاری بیڑے میں جرمنی کی شمولیت کی درخواست کو یکطرفہ طور پر مسترد کر دیا تھا دوسری جانب وانڈ بی کی مصنوعی گھی تیار کرنے والی کمپنی۔ یونی لیور نے، اپنی مقامی صنعت کی پیداوار میں اضافہ سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ بھوک اور شدت سردی میں کوئی بھی مدد کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس تمام صورتحال سے سب سے زیادہ اگر متاثر تھے تو یہ وہ لوگ تھے جنکے گھروں کو پہلے ہی بمباری سے تباہ کر دیا گیا تھا اور یہ تباہ شدہ تہہ خانوں، کھنڈر بنے گھروں، مقیم اور مشرقی حصے سے آئے ہوئے وہ مہاجرین تھے جو جھونپڑ پٹی جیسی صورتحال میں رہنے پر مجبور تھے۔ جبکہ میں اس زمانے بھی بہتر زندگی گذارنے والے افراد پر

انگلی اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گر چہ کہ بحیثیت توانائی کے وزیر کے رہائشی امور کے معاملات میری ماتحتی میں نہیں تھے پھر بھی میں وانزسہوف میں تیزی کے ساتھ تیار کی جانے والی وقتی رہائش، جو کہ ٹین کی چھت اور چہار دیواری پر مشتمل تھی کی نگرانی کے دورے کو نکل کھڑا ہوا۔ تیار شدہ اس وقتی رہائش میں جو لوگ مقیم تھے ان کی بھی صورتحال ناقابل بیان تھی۔ تیز ہوا کے جھکڑ کے چلنے سے سوراخوں سے گذرتی ہوا سیٹی سی بجا رہی تھی لیکن گرمی پہنچانے والے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ ضعیف افراد بستر سے لگے پڑے تھے۔

ایسی صورتحال میں کیا تعجب کی بات تھی اگر غربت کے مارے افراد جن میں، بیماری اور شہر بدری سے متاثر غریب بچے بھی شامل تھے کبھی کبھی سامان کی عدم موجودگی میں، کوئلے کی مال گاڑی سے چرائے ہوئے کوئلے کی چار اینٹیں ایک انڈے یا تین سگریٹوں کے عوض بیچتے پھر رہے تھے جبکہ یہ غیر قانونی دھندا ابھی نہیں چلتا نظر آتا تھا۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ایسی صورتحال میں، میں خود اسوقت قانون شکنی کا مرتکب ہو گیا جب میں پولیس کے افسران کی معیت میں کھڑا نظارہ کر رہا تھا کہ کس طرح ایک جانب رات کی تاریکی کم سن بچوں کے سایوں کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تحفظ مہیا کر رہی تھی اور بچے تھے کہ بلا خوف و خطر مال بردار ریلوے اسٹیشن پر کھڑی مال گاڑی کے ڈبے سے کوئلے کی اینٹیں چرانے میں مصروف تھے۔ تھیلے اور ریڑی لیکر آتے جاتے بچے کوشش کرتے کہ چھپتے چھپاتے اپنا کام کر جائیں اور کبھی کبھار مدقوق بجلی کے بلب کی روشنی کی زد میں آجاتے۔ کوئی بچہ کسی ڈبے میں چڑھ کر کوئلے کی اینٹیں نیچے پھینکتا تو دوسرا اسے جمع کر کے تھیلے میں بھرتا۔

میں نے ریلوے پولیس کے افسر سے درخواست کی کہ وہ مداخلت سے گریز کرے لیکن پولیس حرکت میں آچکی تھی۔ کارروائی شروع ہو گئی، سرچ لائٹیں جل اٹھیں اور پورا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ لاؤڈ اسپیکر سے پولیس کے انتباہیہ جملے بلند تر ہوتے گئے، پولیس کے مخصوص کھوجی کتے بھونکنے لگے۔

میرے کان آج بھی ان بجتی سیٹیوں کی آوازیں سن سکتے ہیں اور میری نظروں کے سامنے ان معصوم بچوں کے آزردہ چہرے گھوم جاتے ہیں۔ کاش یہ بچے اسوقت رو ہی لیتے مگر ان میں اتنی بھی سکت نہ تھی۔

نہ پوچھئے میری کیفیت اسوقت کیا تھی، آپ کی معلومات کے لیے اتنا ہی لکھنا کافی ہوگا کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ حکومت اور خصوصاً پولیس کو خاموش تماشائی بننے کی اجازت بھی تو نہ تھی۔ مارچ کے مہینے سے سردی کا زور ٹوٹ گیا۔

☆☆☆☆

سلینہ حسین
انگریزی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

خودرو پھول

ڈھاکہ پہنچتے ہی اس لڑکی میں ایک تبدیلی آئی کہ وہ کسی کو بھی اپنی پہچان نہیں کرائے گی۔ اگر پوچھا گیا تو وہ اپنے بجائے اپنی ماں کا نام بتائے گی۔ اُس نے خود کو اس طرح رضامند کر لیا کہ اس طرح وہ ہر مرد کی غیر ضروری توجہ سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ وہ اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ اس چبھن نے اس کے اندر کب جڑ پکڑی تھی؟ وہ اتنی پڑھی لکھی نہیں تھی کہ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو کوئی روپ دے سکتی۔ یہ خیال اُسے اس وقت عود کر آیا جب وہ بس کے لمبے سفر کے دوران اونگھ رہی تھی اور ساتھ بیٹھے مسافر نے بہت رازداری کے ساتھ اس کی ساڑھی کے نیچے اس کی چھاتی کو چھوا تھا۔ اسے یہ خیال بہت بھلا اور دل موہ لینے والا لگا۔ وہ پُراعتماد تھی کہ وہ ڈھاکہ میں اپنا کوئی ذاتی ٹھکانہ ڈھونڈ لے گی۔ تاہم وہ یہ بیان کرنے سے قاصر تھی کہ اس نے ایسا کیوں سوچا تھا؟

گبتلی بس اڈے پر اترنے کے بعد لڑکی کو بہت بھوک محسوس ہوئی۔ اس نے ڈیڑھ دن سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے بھلا ایک انسان کتنا پانی پی سکتا ہے! اس کے پاس سو روپے کا ایک نوٹ تھا جو اس کے چولی کوٹ کے گریبان میں اڑسا ہوا تھا۔ چولی کوٹ کی ڈوری کے ایک ڈھیلے بٹن سے وہ نوٹ اُڑ جاتا تھا۔۔۔ وہ اپنا جسم کھو جانے سے زیادہ نوٹ کھو جانے سے خوفزدہ تھی۔ وہ اس خیال کے ساتھ شہر آئی تھی کہ یہاں رقم کی بہت قیمت تھی جبکہ اس کی جان کی اتنی قیمت نہ تھی۔ لڑکی نے اپنے ارد گرد مردوں کو دیکھا۔ اپنے بہت اندر، وہ ان سب سے یکسر بہت متنفر تھی۔ وہ اسے چکنائی سے بھرے ہوئے لگے۔ جن کے بھدے جسموں سے عجیب سی بدبو آ رہی تھی اور وہ اس کے ساتھ وہ بہت غلیظ بھی تھے۔ اس نے ذہنی دباؤ اور نفرت کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ کھولیں۔

شام کو بس جلدی ہی آ گئی۔ اس کے بعد کافی حد تک، رش میں کمی آ گئی تھی۔ لڑکی اب خود کو آرام دہ محسوس کر رہی تھی۔ ایک بار، ادھر لوگوں کے چلے جانے کے بعد، وہ مکمل طور پر اس بس اڈے کی مالک بن جائے گی۔ یقیناً ان میں کچھ بسیں اور ٹرک یہیں پڑے رہیں گے۔ پھر اُسے کسی کا خوف نہیں رہے گا۔ وہ قریبی درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر آرام کرنا چاہتی تھی لیکن اُسے ڈر تھا کہ وہ ڈگمگا جائے گی۔ جونہی وہ بیٹھی، ایک

آوارہ و دھتکارا ہوا کتا اس کے پاس آ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے پیار سے اپنا ہاتھ کتے کی پیٹھ پر رکھا اور جواب میں
کتا دوستی کے لیے اس کا بازو چاٹنے لگا۔ اس کا رال منہ سے بہا اور بازو گیلا ہو جاتا لڑکی کو اچھا لگا اور اُسے اس
ننھے حیوان پر غصہ آ گیا۔

"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر میرا ہاتھ کیوں چاٹا؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم [illegible] کے بیٹے ہو؟ تم کچھ
بھی نہیں لیکن ایک گندے کتے کے بچے ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔۔"

قریب کھڑا ایک لڑکا آم کی گٹھلی چوس رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "تم اس کے ساتھ انسانوں جیسا
سلوک کیوں کر رہی ہو؟"

"ایک بندے اور ایک کتے میں کیا فرق ہوتا ہے؟" اس نے کہا۔ لڑکے نے آم کی گٹھلی کو دور پھینکا۔

"کیا تمھارے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟"

"ہاں، ہے۔۔۔ کیوں؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں فقیر ہوں۔؟"

"تو پھر گھر جاؤ۔۔" اس لڑکے نے کہا۔

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"تو پھر تم کہاں رہو گی؟" لڑکے نے پوچھا۔

"اسی گلی میں۔"

"گلی رہنے کے لیے اچھی جگہ نہیں۔"

"دفع ہو جاؤ۔ میں وہی کروں گی جو میرا جی چاہے گا۔"

"کیا تمھیں بھوک نہیں لگی؟"

"ہاں۔ میں بھوک سے مر رہی ہوں۔"

"آؤ اس ریسٹورنٹ میں چلیں۔ اس کا مالک تمھیں کچھ چاول دے دے گا۔"

"مالک کیوں مجھے چاول دے گا؟ کیا اس نے مجھے کچھ دینا ہے؟"

"نہیں۔ اس نے کچھ نہیں دینا۔ لیکن تمھیں پتہ ہے کہ وہ ایک رحمدل انسان ہے جو غریبوں کو کھانا
کھلاتا ہے۔ آؤ چلیں۔"

لڑکی کچھ دیر تک بدگمان سی رہی۔ اُسے اپنے اندر کچھ نامعلوم خوفناک سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔
اس نے غصے میں اپنے باپ کو چھوڑ دیا تھا اور ایک ہی لمحے کے فیصلے میں، وہ ڈھاکہ جانے والی بس میں سوار

ہو گئی تھی۔ اب وہ حیران ہو رہی تھی کہ اس انجان شہر میں وہ جہاں کا رُخ کرے گی الو کا ابھی تک اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بھرے بیار رنگ اور ہڈیوں کے ڈھانچے میں، وہ لڑکا کسی بندر کے مشابہ تھا۔ لڑکی نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ ہاں، در حقیقت وہ ایک بندر ہی تھا۔ آج وہ چھوٹا تھا لیکن جلد وہ بڑا ہو جائے گا۔ سردرد کی ایک تیز ٹیس نے اس کو پکڑ لیا اور اس کو کمزوری محسوس ہوئی۔ تیز چلاتی ہوئی آواز میں، وہ لڑکے سے مخاطب ہوئی: "تم کیوں ابھی تک یہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"صرف تمھارے لیے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ورنہ اب تک تم وہاں جا چکی ہوتی۔"

"کیا نام ہے تمھارا؟ تم چھوٹے شیطان؟"

"جلو جلو علی۔"

"تمھارے باپ کا نام کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا تمھاری ماں نہیں ہے؟"

"میری ماں مر گئی ہے۔ میں نے اسے کبھی بھی نہیں دیکھا۔"

"او اچھا..."

"کیا اچھا؟"

"کہ تم چوحرامے ہو..."

جلو علی کھکھلا کے ہنسنے لگا۔ اس کو لطف آیا۔ اس میں کوئی حیرت نہیں تھی کہ وہ اس طرح کے طنزیہ مذاق بھی بارہا سن چکا تھا۔ لوگ ایسے الفاظ ان بچوں کے لیے بھی استعمال کرتے تھے جن کے باقاعدہ پیدائش کے ریکارڈ موجود تھے۔ گلیوں کے یہ بچے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سیانے تھے۔ جلو اکڑا کے لڑکی کے سامنے آ گیا اور پوچھا۔

"آنٹی آپ کا نام کیا ہے؟"

"گوری گاؤں..."

"یہ کیسا نام ہے؟"

"چپ ہو جاؤ بندر..."

لڑکا ایک بار پھر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ایک بوڑھی بھکارن اُن کی جانب آئی۔ "یہ عورت کا بھوت کس کا ہے؟" لڑکی نے اس کو دیکھنے کی کوشش کی: بالکل خشک، روکھے اور اُلجھے ہوئے بال، گھٹنے کی لمبائی تک گندی سی ساڑھی، جس کا دھڑ کو چھپانے کے لیے کوئی بلاؤز اور پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹین کی ایک خالی پلیٹ تھی۔ اس کی کمر میں کچھ اڑسا ہوا تھا، شاید پان یا پھر رقم۔ اس کا اظہر دانتوں کے منہ سامنے کی جانب سے بہت بھدا تھا۔ اس کے چہرے کی جلد کی مختلف تہوں نے سڑک کی ساری دھول جمع کر رکھی تھی۔ لڑکی اس کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی اور آہستگی سے خود کلام ہوئی: "میں نے ایسی چڑیل پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" بوڑھی عورت اس کے قریب بیٹھ گئی اور پوچھا،

"کیا تم آج کچھ نہیں کما سکی؟"

"نہیں، میں بھیک نہیں مانگتی۔"

"آہ۔" بوڑھی عورت نے لڑکی پر بڑا احسان جتایا: "اے لڑکی، نام کیا ہے تیرا؟"

"گوری گاؤں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"گوری گاؤں تو تمھارے گاؤں کا نام ہے۔ تم اپنا نام بتاؤ؟"

"گوری گاؤں۔"

"یہ کیسا نام ہے؟"

"کیا مسئلہ ہے؟ کوئی نام وہی کام کر سکتا ہے جب تک آپ مجھے اس نام سے بلاتے رہیں اور میں جواب دیتی رہوں۔۔۔ نام کا مقصد پورا ہوتا رہتا ہے۔ اس نام والے سارے ڈرامے کا مقصد ہی کیا ہے؟"

بوڑھی عورت اس کے اس خیال پر کھلکھلا اٹھی۔ اس کے خشک اور کھردرے بال ہوا میں لہرائے، کچھ اس کے چہرے پر آگئے جنھوں نے اسے مزید بھیانک بنا دیا۔ اس کے ہنستے ہوئے چہرے نے لڑکی کو وہ چڑیلیں یاد دلا دیں جن کے بارے میں اس نے اپنے بچپن میں سنا تھا۔ "تم کیوں ہنس رہی ہو؟ ہنسنا بند کرو۔" وہ زور سے چلائی۔

بوڑھی عورت اچانک ہی خاموش ہو گئی۔ آنکھیں پھیلاتے ہوئے، اس نے کہا: "اے لڑکی، میں نے تمھارے لیے نام ڈھونڈ لیا ہے: میں تمھیں 'شہزادی' کہوں گی۔" ٹلو نے اچھلنا شروع کر دیا: "ہم نے ڈھونڈ لیا! ہم نے ڈھونڈ لیا! ہم نے تمھارے لیے نام ڈھونڈ لیا۔" لڑکی نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بندر جیسی حرکات کر کے بندر ہی لگ رہا تھا۔ شاید وہ بندروں کے کسی گروہ میں پیدا ہوا تھا۔

لڑکے نے تیوری چڑھائی: "تم کیوں مجھ پہ ناک بھوں چڑھا رہی ہو؟ آؤ! ہم سب اس ہوٹل پہ

چلیں۔ تم نے ابھی کہا نہیں کہ تمھیں بہت بھوک لگی ہے شہزادی آتی؟"

"چپ کرو۔۔۔ننھے شیطان۔۔۔"

"لیکن کیا آپ بھوکی نہیں ہو؟"

لیکن اس سے پہلے لڑکی کوئی جواب دیتی۔ بوڑھی عورت نے جیلو کا ہاتھ پکڑ لیا: "میں بھی بہت بھوکی ہوں۔ کیا تم مجھے کچھ چاول لے کے دے سکتے ہو؟"

"نہیں نہیں۔ میں تمھیں نہیں کھلا سکتا۔ اگر مالک نے تمھیں دیکھ لیا تو وہ بہت غصہ کرے گا۔"

"لیکن تم نے ابھی نہیں کہا کہ تمھارا مالک بہت رحم دل ہے۔" بوڑھی عورت نے اُسے جواب دیا۔

لڑکی نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ جیلو سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ کچھ ناقابل سماعت سے الفاظ بڑبڑایا اور پیشاب کرنے کے لیے تھوڑی دور چلا گیا۔ بوڑھی عورت نے جب کوئی بات بنتی نہ دیکھی تو جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شہزادی، اس دنیا میں مہربانی کی بہت سی اقسام ہیں! ایک قسم کی مہربانی تمھارے لیے ہے جبکہ میرے لیے کوئی اور قسم ہے۔" وہ دوبارہ دل کھول کے ہنسنے لگی اور اسکا لعاب ہر طرف گرنے لگا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کے بدصورت چہرے پہ ڈالی:

"تم بالکل ایک چڑیل لگتی ہو۔" بوڑھی عورت نے چلتے ہوئے جواب دیا۔

"تم یہ کیوں کہتی ہو؟ اگر تم شہزادی ہو تو میں شہزادی کی دادی ہوں۔"

"ہٹ۔۔۔ دادی۔۔۔ جاؤ اب۔۔۔"

بوڑھی عورت کے جانے کے بعد جیلو آیا اور لڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔

"آؤ چلیں۔۔۔ شہزادی آتی" اس نے لاڈ کرتے ہوئے کہا۔

"تمھارے مالک کا نام کیا ہے؟"

"توفیق۔ تمام لوگ اسے توفیق بابا کہتے ہیں۔"

"کتنی شادیاں ہیں اس کی۔۔۔؟" جیلو ہنسا۔ اس کی ہنسی کے انداز نے بتا دیا جیسے اس جواب میں کئی کہانیاں پوشیدہ تھیں۔ لڑکی کو پتا چل جائے گا۔

"اچھا! تو اس نے کبھی بھی شادی نہیں کی؟ کیا یہی بات ہے؟" لڑکی نے اس سے جواب نکلوانے کے لیے پوچھا۔

"کیوں نہیں کی؟ کیا ایک مرد شادی کے بغیر رہ سکتا ہے؟"

"تمھیں کیسے پتہ ہے کہ وہ نہیں رہ سکتا؟"

"مجھے سب پتہ ہے۔ میرے مالک نے پانچ شادیاں کی ہیں۔ پہلی بیوی بچہ جنتے ہوئے مرگئی تھی۔ چھوٹی نوزائیدہ بچی بھی مرگئی تھی۔ دوسری کسی اور مرد کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کے بعد آنے والی بیوی کو مالک نے خود ہی طلاق دے دی تھی۔ تو۔ میں نے کتنی گنوا دی ہیں؟"

"صرف تین۔۔۔" لڑکی نے دلچسپی سے جواب دیا۔

"جہاں تک چوتھی بیوی کا تعلق ہے تو اُسے چیئرمین کا بیٹا پٹ سن کے کھیت میں لے گیا۔۔۔۔۔"

"رکو! تمھیں اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔۔۔"

"یقینی طور پر، مالک کو اُسے طلاق دینی پڑی! اب حال ہی میں، اُس کی اپنی پانچویں بیوی سے شادی ہوئی ہے۔ اُن کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ قدرتی طور پہ مالک اس بارے میں بہت اداس ہے۔"

"اداس! اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں دیکھا!" لڑکی نے آہ بھری۔ وہ اس عجیب و غریب انسان سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنی ٹانگیں اور بازو سیدھے کیے۔ اپنا پاؤں سیدھا کیا اور زور زور سے ہلا یا جو کہ شل ہو چکا تھا۔ جلیلو نے محسوس کر لیا کہ بالآخر وہ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا بازو اس کی جانب بڑھایا اور کہا۔

"آؤ چلیں۔"

"ہاں، آؤ چلیں۔" آخر کار لڑکی بے نیازی کے ساتھ اٹھی اور خود کو سنبھالتے ہوئے جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اگر وہ ابھی کچھ بھی نہ کھاتی تو رات کو کھڑے ہونے کے قابل نہ رہتی۔ انھوں نے گلی پار کی اور تو ڈ کلی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں چند زیادہ لوگ نہ تھے، صرف دو آدمی کھانا کھا رہے تھے۔ جلیلو نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر لڑکی کی آمد کی اطلاع دی۔

"مالک، میں اسے لے آیا ہوں۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"آؤ آتی۔"

"مالک، میں اسے لے آیا ہوں۔" جلیلو نے دو بار وہی الفاظ اگلی رات بھی دوہرائے تھے۔ لڑکی کے لیے دو بار وہی الفاظ سننا بہت تکلیف دہ عمل تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے گرم پگھلا ہوا لوہے کا راڈ اس کے کانوں میں ڈال دیا گیا ہو۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ اس راہ کی لمبائی کتنی تھی یا یہ داخل ہونے میں کتنا وقت لے گا۔ تو ڈ بابو اپنے چہرے پہ کھسیانی اور دانتوں کی نمائش کرتی ہنسی لیے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی موتیوں کی طرح کالی آنکھوں پہ دو کالی بہت ہی گھنی ابرو تنک رہی تھیں اور ایک موٹا اور بڑا سا ناک اس کے چہرے پہ

قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ سامنے سے اُس کے بالوں کا اچھا خاصا حصہ اُڑ گیا تھا۔ اس کا موٹا پھولا ہوا پیٹ، اُسے حاملہ گائے کی یاد دلاتا تھا۔ لڑکی یہ منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکی۔ اس نے دوسرے دو کھانا کھاتے مردوں کو دیکھنے کے لیے نظریں دوسری جانب موڑ دیں۔ جلو نے اُس کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔

"مالک، اس کا نام شہزادی ہے۔ بوڑھی بھکارن نے اسے یہ نام دیا۔"

یہ سُن کر، دونوں آدمی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور کھانے کے ذرات اُن کے منہ سے باہر اچھل پڑے۔ توفی بابو بھی ہنس رہا تھا۔ وہ اشارے سے اُسے بلا کر اندر لے گیا۔

"آؤ اور بیٹھ جاؤ، شہزادی۔"

"میرا نام گری گاؤں ہے۔۔۔" لڑکی نے کہا۔

"مجھے کھانا بھی۔ آپ عورت نہیں ہو، آپ ایک گاؤں ہو۔ گاؤ۔۔۔ کیا تم بھوکی نہیں ہو؟"

"ہاں۔ میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔"

"ارے جلو، اسے چاول اور گوشت کی دو پلیٹیں لا دو۔ کیا تم یہ سب ختم کر لو گی؟"

"ہاں۔ میں کر لوں گی۔ چاول کھانا کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے۔"

تینوں مرد اور لڑکا ایک بار پھر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے، جیسے لڑکی نے بہت انوکھی اور مزاحیہ بات کہہ دی ہو۔ دونوں مردوں کا دم گھٹ گیا کیونکہ انہوں نے اپنے بھرے ہوئے منہ کے ساتھ بولنے کی کوشش کی۔ لڑکا بھاگ کر اُن کے لیے پانی کے گلاس لے آیا۔ توفی نے لڑکی کے کان میں سرگوشی کی، "کھاؤ، میری جان۔" لڑکی جلدی سے بینچ پر بیٹھ گئی اور چاولوں کی پلیٹ اپنے قریب کھسکائی۔ وہ ہاتھ تک دھونا بھول گئی تھی۔ توفی کا گرم سانس ابھی تک اس کے کانوں میں تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ یہ توفی بابو ہی تھا جس نے اس چھوٹے بندر کو اُسے پہچاننے کے لیے بھیجا تھا۔ شاید اُس نے بہت فاصلے سے ہی اُس کو دیکھ لیا تھا اور اُسے خاصی دیر اکیلا بیٹھے ہوئے دیکھ کر اس نے بھی جانچ لیا تھا کہ اس کے پاس جانے کے لیے کوئی خوف دور تھا۔ اس نے کھانا دو کا اپنا سر اُٹھایا اور دیکھا کہ دونوں مرد اپنا کھانا ختم کر چکے تھے۔ وہ بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اُس کی سماعت میں جلو کی آواز گونجی، "میں اسے لایا ہوں۔" یہ کیسی زندگی ہے! احساسِ ذلت نے اُسے آلیا۔ اُس نے جلدی جلدی مٹھیاں بھر کر چاول اپنے منہ میں ڈالے۔ اس کو کھانا بھلا لگا اور اُس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر گئیں جو اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے صاف کیے۔ تینوں مرد اُس کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

"آپ کیوں رو رہی ہو؟" ایک آواز نے پوچھا جیسے وہ نہیں پہچانتی تھی۔

"شہزادی، کس بات نے تمہیں رلا دیا؟" توفی بھی باتوں میں شامل ہو گیا۔

لڑکی نے غیر یقینی نظروں سے اُن کو دیکھا: "میں کیوں رونے لگی؟ میں کیوں روؤں گی جب میرے پاس چاول ہیں؟ میں بہت خوش ہوں۔ تم نے مجھے کھانے کے لیے بہت کچھ دیا ہے۔ میں نے ایک کھانے میں کبھی بھی اتنا گوشت نہیں کھایا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

"شہزادی، کیا تم آرام کرنا چاہتی ہو؟"

"ہاں، چاول کھانے کے بعد، مجھے بہت نیند آتی ہے۔"

اُس نے ایک بڑی ڈکار لی، ایک لمبی جمائی لی اور اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو زور سے رگڑا۔ اس نے پلیٹ پر اپنے ہاتھ دھوئے اور پاؤں سمیت کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی پیٹھ، کندھے اور گردن ڈھانپنے کے لیے اپنی ساڑھی کا آنچل ٹھیک کیا لیکن اس کی چھاتیاں ابھی بھی نمایاں تھیں۔ مجرے رنگ روپ اور اچھے نین نقش کے ساتھ، اس کا جسم غربت کے باوجود، صحت مند اور جوانی سے بھرپور رہتا اور دل موہ لینے والا چہرہ اس کے علاوہ تھا۔ قصہ مختصر، اس کی شخصیت پُرلطف تھی۔

لڑکی نے محسوس کر لیا کہ تینوں مرد ابھی تک اس سے عشوہ گری کر رہے ہیں۔ اس نے تسلی بخش معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہاں کھڑا رہنے کی کوشش کی۔ وہ مرد اس کی مسکراہٹ کو نہ سمجھ سکے۔ یہ اتنی معصوم تھی جیسے ابھی تک دنیا کا کوئی گناہ اسے چھو کر بھی نہ گزرا ہو اور ایسے ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ کیا وہ ابھی ابھی آسمانوں سے اتر کر نہیں آئی تھی؟ تینوں مرد مکمل طور پر دنگ رہ گئے۔

"شہزادی، تم کہاں سوؤں گی؟"

"یہیں، بنچ پر ہی..."

"کیا تمھارے پاس تکیہ اور کمبل ہے؟"

"نہیں۔ میں نے اپنے باپ کا گھر بہت ہی غصے کے عالم میں چھوڑا۔ میں تکیہ اور کمبل تو ایک طرف، اپنے کپڑے تک نہیں لا سکی۔"

"شہزادی، میں تمھیں تکیے اور کمبل دوں گا۔ میں ایک ٹرک چلاتا ہوں۔ تم میرے ٹرک میں سو سکتی ہو۔ حقیقت میں، تمھیں وہاں پر بہت سکون ملے گا۔"

"نہیں، نہیں، وہ کیوں ٹرک میں سوئے گی؟ میں چارپائیوں کو آپس میں ملاؤں گا۔ ان پر ایک گدا اور خوبصورت چادر بھی ڈالوں گا۔ تمھیں فوراً ہی نیند آ جائے گی جیسے ہی تم اس پر لیٹوں گی۔"

اس سے پہلے کہ دوسرا آدمی بولتا، توقو نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "اپنی بکواس بند کرو! نہیں تو مجھے تم لوگوں کو باہر پھینکنا پڑے گا۔"

"کیوں؟ میں کیوں نہ بولوں؟" اُن دونوں میں سے ایک آدمی بولا جو وہاں کھانا کھا رہے تھے۔

"تم بھول رہے ہو کہ میں نے اُسے کھانا دیا۔"

"کتنے کا کھانا تھا؟ میں تمہیں پیسے دیتا ہوں۔"

"کیا؟ کیا تم مجھے اپنا پیسہ دکھا رہے ہو؟ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

جب دونوں آدمی توڑ کو گھونسے مارنے کے لیے اُٹھے، لڑکی اپنے دونوں بازو پھیلا کر بھاگتی ہوئی آئی اور ان کے درمیان کھڑی ہو گئی۔

"تم کیوں لڑ رہے ہو؟ تم لوگ مجھ سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میں کہاں پہ سوؤں گی؟ تم لوگ خوامخواہ ہی جھگڑ رہے ہو۔"

ایک لمحے کے لیے، تینوں مردوں اور لڑکے نے خود کو احمق سمجھا اور بالکل خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ اب وہ اپنی اصلیت اس پہ ظاہر کر چکے تھے۔ وہ دونوں مرد لڑکی کو کسی بھوت کی طرح لگے۔ ایک ہڈیوں سے بھرپور جسم تھا جس پہ گدھ کی طرح کا حامیز سا چہرہ تھا۔ اس کے بال چھوٹے چھوٹے تھے اور اس کی کھردری آواز بھی الو کی طرح تھی۔ وہ کوئی زنانی پولیس والا لگتا تھا۔ دوسرا آدمی فلم کے کسی ولن کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس کی بٹن کی طرح آنکھوں میں کبھی قاتل جیسی بے روح سی لگتی تھی۔ لڑکی کو اس کا موٹا تازہ چربی زدہ جسم دیکھ کر گھن آنے لگی۔ ہر شخص ہوس کے ساتھ اس کو تک رہا تھا اور وہ محظوظ ہو رہی تھی۔

اچانک بلو نے پوچھا: "شہزادی آتی! تو آپ سوچ لو کہ آپ نے کہاں سونا ہے؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد لڑکی نے جواب دیا۔

"آج رات، میں یہیں سوؤں گی۔ کل رات میں ٹرک میں سوؤں گی۔ اب، ڈھاکہ شہر میں ہر کہیں ایک بستر میرا منتظر ہے۔" لڑکی نے ایک اونچا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جس سے سارے مرد لطف اندوز ہوئے۔

توڑ بابو نے تھکا دینے والے لہجے میں کہا: "شہزادی، میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم اسی ہوٹل میں کام کرو گی اور میں تمہیں تنخواہ دوں گا۔ تم یہیں، میرے ساتھ رہو گی۔" لڑکی اپنے جسم کو لہراتے ہوئے کھلکھلا کے ہنسی۔ اس نے توڑ بابو کی رائے پہ کوئی توجہ نہ دی؛ اس کے بجائے اس نے دونوں مردوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ابھی تم لوگ گھر جاؤ اور کل واپس آنا۔"

آج رات کے لیے ان دونوں کے چلے جانے کے بعد، اس نے اپنے پاؤں بینچ پہ سمیٹ لیے۔ وہ

ننھے گا ایک کھانے کے لیے آئے اور توفہ اور جلو ان دونوں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ دال، گوشت، چاول اور بھنے ہوئی سبزی کی بھری ہوئی پلیٹیں ان کو لا دی گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنا کھانا ختم کیا اور چلے گئے۔ انہوں نے لڑکی کو دیکھ لیا تھا لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ کم از کم، ابھی تک اس زمین پر کچھ انسان بس رہے تھے۔ اپنے ذہن میں انہیں خیالات کے ساتھ لڑکی نے اپنا سر میز پر ٹکایا اور سو گئی۔

رات کے کسی پہر لڑکی نے محسوس کیا کہ وہ لکڑی کے بنچوں کے جوڑے پر سوئی ہوئی تھی جن کو ملا کر ایک بستر بنایا گیا تھا۔ توفہ اس کے قریب سویا ہوا تھا۔ وہ اس رات گھر نہیں گیا تھا۔ اس کے ننگے بدن پر حملہ آور ہونے کے بعد، وہ بے سدھ پڑا تھا۔ کیا وہ واقعی ہی سویا ہوا تھا؟ جب لڑکی نے اسے کہنی ماری تو وہ بہت ہی دلفریب آواز میں گویا ہوا۔

"شہزادی، کیا تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"میرا نام گری گاؤں ہے۔"

"کسی کو کسی بھی نام سے پکارا جا سکتا ہے۔"

"مجھے گری گاؤں ہی کہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ کیا تم خوش ہو، گری گاؤں؟ یا تمہیں کچھ اور چاہیے۔"

خوش! لڑکی کی حالت رونے والی ہو گئی؛ اسے دکھ اور غم کا شدید احساس ہوا۔ وہ اپنا کنوارہ پن اسی طریقے سے کھو چکی تھی؛ جس طرح زبردستی بستر سے دھکیل کر، دو مردوں نے اسے اپنے گھر سے پٹ سن کے کھیت میں لے جا کر توڑا تھا۔ اس کو رتی خوشی محسوس ہوئی اور نہ ہی اداسی؛ اسے اپنی پیٹھ پر بچھو کے ڈنگ جیسا درد محسوس ہوا اور شدید نفرت کی لہر اس کے من میں ابھر آئی۔ توفہ دوبارہ اس پر سوار ہو چکا تھا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ آج اس کو اس بیچ پہ صرف ایک مرد کو مطمئن کرنا تھا؛ کل رات ٹرک میں اسے دو مردوں سے نمٹنا پڑے گا۔ توفہ نے لڑکی سے دوبارہ پوچھا۔

"گری گاؤں، کیا تم خوش ہو؟" تب لڑکی نے توفہ کو اپنی کہانی سنانا شروع کی۔

"ایک دن، جب میرا باپ گھر پہ نہیں تھا، تقریباً آدھی رات کے قریب، جگلو دیوار پھلانگ کر ہمارے گھر گھس آیا اور میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جگلو کے ساتھ دو تین اور بندے بھی آئے تھے۔ انہوں نے میرا استحصال کیا اس کے ٹولے کے ساتھ باندھا اور پھر اپنی باریاں لینے لگے۔ ہمارے ہمسایوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے جگلو کو پکڑ لیا لیکن دوسرے سارے بھاگ گئے۔ جگلو چیئرمین کا بیٹا ہے جس نے اس طرح کی کاروائیاں کئی دفعہ کی ہیں۔ ہر بندہ اسے جانتا تھا۔ اگلے دن، میرے باپ کو ساری کہانی پتہ چلی اور وہ ٹھٹک کر رہ

گیا، جو اس کے بحال ہوتے ہی اس نے انصاف کا مطالبہ کر دیا۔ پہلے، وہ اس مسئلے کو گاؤں کے سردار کے پاس لے گیا جس نے اسے بتایا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جگلو کا باپ گاؤں کا چیئرمین بہت ہی طاقتور آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ہماری زندگیاں تک تباہ کر سکتا تھا۔ پھر میرا باپ پولیس کے پاس گیا جہاں پہ ان کو صرف و صرف پیسے سے مطلب تھا۔ کسی کو بھی پروا نہ تھی کہ ایک دیہاڑی کرنے والا مزدور ان سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود بھی، وہ جگلو کے خلاف کیس کو سامنے لے آیا۔ جگلو کے باپ نے کیس ختم کرانے کے لیے پیسے کا خوب استعمال کیا۔ لیکن میرے باپ نے حقیقت کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتا گیا کہ ایک ایسا ملک جہاں پہ انصاف نہ ہو، کبھی بھی مسائل سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا۔ میں نے بھی اسے کہا کہ وہ کیس ختم کر دے لیکن وہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخرکار، چیئرمین نے اپنے غنڈے بھیجے تاکہ ہمیں اپنے گھر اور گاؤں سے بے دخل کیا جا سکے۔ میں نے اپنے باپ کے ساتھ جا کر جگلو کے باپ سے التجا کی اور اس سے معافی کی درخواست کی تاکہ ہم اپنے گھر میں واپس جا سکیں۔ میں نے کہا کہ ہم جیسے غریب لوگ، اتنے غرور اور عزت کے بھی حقدار نہیں ہو سکتے۔ پورے گھر میں سارے لوگ صرف میری وجہ سے تکلیف کیوں برداشت کریں؟ میری ماں ہے، بھائی اور بہنیں ہیں! اب وہ سب کہاں رہیں گے؟ جب اس نے میری التجا کی کوئی پروا نہیں کی، میں نے اپنا راستہ ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ میں شہر جانے والی ایک بس پہ سوار ہو گئی اور اب میں یہاں ہوں۔۔۔“

”اوہ اچھا، پھر تو تم کنواری نہ ہوئی۔ یہ کام پہلے ہی کوئی تمہارے ساتھ کر چکا ہے۔“ آصف نے مایوسانہ آواز میں کہا۔

”اگر میں کنواری ہوتی تو کیا میں تمہیں اس طرح ہاتھ لگانے دیتی؟“ ایک کھلکھلاتی ہوئی بے عزتی کے ساتھ ان الفاظ کو اس کے منہ سے پھسلتے جیسے ہی لڑکی نے بستر پہ اپنا پہلو تبدیل کیا، تو گھر میں اپنی بیوی ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اپنا وقت گزار رہا تھا۔ اس نے جلو کو اسے بتانے کے لیے بھیجا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں ہانگ کانگ جا رہا ہے۔ جلو اپنی عمر سے زیادہ چالاک لڑکا تھا اور سب کچھ سمجھتا تھا شاید۔ ایک دن وہ بھی بغیر پیسوں کے اس کے ساتھ سونے کی فرمائش کرے گا۔ لڑکی نے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ اسے بے عزتی محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے وہاں سب کچھ سیکھنا ختم کر دیا تھا کیونکہ وہ اب کافی کچھ سیکھ چکی تھی۔ آصف نے اس کی جوانی صرف دو پلیٹ چاول
میں خرید لی تھی۔

اگلی رات اسے کچھ رقم ضرور حاصل کرنا ہو گی۔ اسے شدت سے رقم کی ضرورت تھی۔ آصف کو اس کی ساری خدمات کا معاوضہ چکانا پڑے گا۔ اس نے بستر پہ دوبارہ اپنا پہلو بدلا اور پوچھا،

"کیا تم جاگ رہے ہو؟"

"کیا تم نے کچھ کہنا ہے؟"

"کیا تم مجھے پیسے دے رہے ہو؟"

توفو بلبلا اٹھا: "میں نے تمہارے کھانے اور سونے کا بندوبست کیا ہے۔ اس کے علاوہ تم مجھ سے پیسے بھی مانگ رہی ہو؟ تم نے کیا ہی کیا ہے؟"

"آہا! ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے تمہارا کیا کام کیا ہے۔ اگر تم مجھے پیسے نہیں دو گے، میں تمہاری بیوی سے شکایت کر دوں گی۔"

"کیا کیا ہے تم نے؟"

"جو بھی میں کہا وہ سچ ہی ہے۔ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ میرا باپ جو دیہاڑی کا ایک مزدور ہے، اسے گھر واپس لینے کے لیے رقم کی شدید ضرورت ہے جو میری وجہ سے اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں اسے کچھ رقم بھیجنا چاہتی ہوں، گھر کے اخراجات کے لیے اور اس کی مرمت کے لیے بھی۔ کیونکہ ٹلو نے میرے کمرے میں داخل ہونے کے لیے اس کی ایک دیوار توڑ دی تھی۔"

"میرے خدایا! مجھے تو اب پتہ چلا کہ تم بہت چالاک عورت ہو!"

"تم مجھے کتنے پیسے دو گے؟"

"میں تمہیں بتاؤں گا۔ مجھے اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔۔۔ ایک دفعہ پھر؟"

"ٹھیک ہے۔ پھر حساب کرتے رہنا کہ تم نے مجھے کتنے پیسے دینا ہیں۔"

"کیوں؟ کیا تم گن نہیں رہی ہو؟"

"یقیناً۔ میں گن رہی ہوں۔"

"تم گنتی میں بہت اچھی لگتی ہو! تمہاری تعلیم کتنی ہے؟"

"اس طرح کے حساب کتاب کے لیے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ گنتی عورت خود بخود سیکھ جاتی ہے۔"

"دراصل تم بہت اچھی طرح سیکھ چکی ہو۔" توفو دل کھول کر ہنسا۔

جب اگلی صبح سویرے توفو نے دوبارہ اس کو بلایا لڑکی کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ زور زور سے چلائے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ یہ جنگ زیادہ دیر نہیں لڑ سکتی۔ اس نے سوچا کہ اس کی زندگی دریا کی طرح تھی جو اس کے گاؤں گری گلاؤں کے ساتھ بہتا تھا۔ کبھی اس میں

بڑے بڑے لدے ہوئے بحری جہاز سفر کرتے تھے لیکن اب یہ دریا ایک نہر سے زیادہ نہیں بچا۔ اس کا زیادہ تر حصہ کٹاؤ کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا اور اب اس میں دو کشتیاں بھی ایک ساتھ نہیں تیر سکتی تھیں۔ اس نے خود کو بھی اس مردہ دریا کی طرح سمجھا جس کی زندگی بیمزہ ہو چکی تھی جو کبھی بھی ٹھیک نہ ہونے والی تھی۔ کام ختم ہونے کے بعد لڑکی کمرے سے باہر نکلی۔ ابھی بہت سویر تھی اور دن کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ سڑکیں بالکل خاموش تھیں۔ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے۔ صرف وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے کہاں جانا تھا۔ وہ واپس کمرے میں آئی اور توفو کے ساتھ لیٹ گئی۔ اس نے یاد کیا کہ پچھلی رات وہ گھر نہیں گیا۔ اس کی طرح، اس کی بیوی نے بھی نیند کے بغیر رات گزاری ہوگی۔ اس نے اس کو بستر سے دھکیل دیا اور اس پر لعنت بھیجی: "بے غیرت گدھے۔۔۔!!!"

توفو کی تجوری میں سے پیسے چھپانے کے بعد لڑکی نے اپنی ساڑھی کے پلو کے آخر میں اس رقم کو باندھا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ جب توفو میز کے نیچے سے اٹھا جہاں وہ لیٹا تھا لڑکی نے ایک رکشہ کر لیا تھا اور وہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔

"کہاں جانا چاہتی ہو؟" رکشے والے نے پوچھا۔ لڑکی نے بغیر کسی تکلف کے پوچھا: "بھائی۔ کیا تم کام ڈھونڈنے میں میری مدد کر سکتے ہو؟"

"کام؟ کیسا کام؟"

"کسی گھر میں کوئی کام کاج، یا کسی تعمیراتی جگہ پہ اینٹیں توڑنے کا کام، جہاں سے مجھے کچھ پیسے مل جائیں۔"

"پھر میری بیوی کے پاس جاؤ۔۔۔ وہ تمہیں کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ کے دے گی چاہے وہ کوئی چھوٹا کام ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔۔۔"

"وہ کیا ہے؟"

"نوکری ملنے کے بعد تمہیں میرے ساتھ ایک دن کے لیے سونا پڑے گا۔"

لڑکی کے قہقہے پھوٹ پڑے۔ دن کے اس وقت سڑکوں پہ کسی قسم کا کوئی رش نہ تھا۔ ہوا میں تھوڑی سی خنکی تھی۔ اسے اتنا اونچا ہنستا بہت بھلا لگا۔ اتنا اونچا کہ رکشے والے نے واپس مڑ کر دیکھا اور اس سے پوچھا:

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

"یہ سب سے آسان کام ہے جو میں کر سکتی ہوں۔" لڑکی نے کہا: "تم یہ کب کرنا چاہتے ہو؟ پہلی بار یہ مفت ہوگا۔ باقی تمام بار تمہیں پیسے دینا پڑیں گے۔ مجھے اپنے دیہاڑی دار باپ کو پیسے بھیجنا ہوتے ہیں۔ جو

سراسر میری وجہ سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔۔۔اور اگر میں تمھیں آج جیسی ٹھنڈی بسوں میں رکشے کی مفت سواری دے کر تمھارا معاوضہ چکا دوں تو؟"

"نہیں، مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ تم مجھ سے کام لینا چاہتے ہو لیکن مجھے پیسے دینے کے لیے راضی نہیں ہو۔۔۔اس طرح کیسے کام چلے گا؟" لڑکی نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

اُس آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لڑکی کو اپنے گھر کے قریب دجوبر میں لے گیا اور فاصلے سے ایک جانب اشارہ کیا۔

"اس کے پاس جاؤ۔ وہ ایجنٹ تو رتی ہے۔ اگر ممکن ہوا تو وہ تمھیں کام ضرور دے گی۔ ابھی میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا لیکن تم نے اپنا وعدہ یاد رکھنا ہے۔" لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہاں پر کام کی کوئی کمی نہ تھی۔ اب وہ باقاعدگی سے اپنے باپ کو رقم بھیجتی تھی۔

وہ ڈھاکہ شہر میں، لاکھوں لوگوں میں سے ایک ہوگئی تھی۔ وہ خود پہ عجیب و غریب سی خوشی محسوس کرتی۔ اگر وہ کرایہ نہ دے سکتی تو وہ گلیوں میں سو جاتی یا پھر کسی ٹرک کی چھت پہ۔ ایک دفعہ وہ کچھ مردوں کے ساتھ ایک دوسرے شہر بھی گئی تھی اور وہاں پہ یادگار وقت گزارا تھا۔

ایک دن، اُس نے وہ مشکلات محسوس کیں جو ہر بچی کی حاملہ ماں گلی میں محسوس کرتی تھی۔

"تمھارے اتنے زیادہ بچے کیوں ہیں؟" اس نے ایک دن پوچھا تھا۔

"میں گلی میں سوتی ہوں، بھلا ہر رات، میں کتنے مردوں کو پیچھے دھکیل سکتی ہوں؟"

لڑکی بلا ارادہ بھی، اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب سا خوف لہرایا۔ اُس نے جلدی جلدی حساب لگایا۔ اس کو پچھلے مہینے ایام مخصوصہ میں حیض نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ اسی وجہ سے ہو۔۔۔؟ اُسے صرف انتظار کرنا اور دیکھنا پڑے گا۔ دن گزرے اور حقیقت میں، اُس کو اس ننگے سچ کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنی پرانی نوکری کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کوئی بھی اُسے گھر میں نوکر رکھنے کو تیار نہ تھا۔ اب اس کو صرف ایک ہی نوکری ملی تھی، ایک ہوٹل میں باورچی کے معاون کی نوکری، جس میں اس کا کام مصالحے کوٹنے کا تھا۔ اس کی چھوٹی سی تنخواہ میں اتنی رقم ہی ہوتی کہ وہ ایک دن سے دوسرے دن تک بمشکل گزارہ کرتی۔ لوگ اس کے بڑے پیٹ کا حقارت کے ساتھ مذاق اُڑاتے۔ کچھ اس کا منہ چڑاتے جبکہ کچھ کبھی کبھار اس کے کپڑوں میں پانچ روپے کا ایک نوٹ اڑوس دیتے۔ ابھی بھی لڑکی چاہتی تھی کہ وہ ڈھاکہ شہر کے اس اسٹیل میں، کسی معجزانہ بچے کو جنم

دے۔ ایک ایسا بچہ، جو ڈھا کر شہر سے ساری گندگی کو دور باہر کرے اور یہ اعلان کرے: "دیکھو میں ماں کہتا تھا کہ یہ شہر بہت خوبصورت ہے۔۔۔!!" مرد اپنے دلوں کو ٹٹولیں گے اور وہاں اُن کو کوئی گندگی نظر نہیں آئے گی بلکہ صرف و صرف صاف و شفاف پانی نظر آئے گا۔ لیکن ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کے پتھریلے دل اتنے صاف شفاف پانی سے بھی نہ دھل سکیں گے۔ وہ ہاتھوں میں پھندے لے کر ہر وقت تیار ہوں گے اور غراتے ہوئے پھریں گے۔

"شہر کو صاف کرو! جلدی کرو۔۔۔! اوہ۔۔۔! اس جرم کے لیے تمہاری سزا موت ہے۔۔۔!"

کھلکھلاتے ہوئے لڑکی نے خوفزدہ ہو کر اپنے دن بدن بڑھتے ہوئے پیٹ کو چھوا۔ جوہی کی ماں نے ایک بار اشارہ دیا تھا کہ وہ جڑواں بچوں کی ماں بنے گی۔ لڑکی ہنسی تھی: "ایک کے بجائے، مجھے اس مزدوری کے دو بچے ملیں گے۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن ان کے باپ کا کوئی اتا پتہ نہیں ہے۔ تم ان کو کیسے پالو گی؟"

"گلی میں پیدا ہونے بچوں کو بڑا ہونے کے لیے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی؛ وہ خود بخود بڑے ہو جاتے ہیں۔"

وہ دوبارہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کا بھی ایک باپ تھا جو ایک دیہاڑی دار مزدور تھا۔ وہ اس کی زندگی میں کتنا فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ وہ حیران تھی۔

یہ عام سی نیلی چاندنی والی رات تھی۔ لڑکی کو مزدوری جیسے درد کی ٹیسیں اُٹھیں۔ وہ کچی آبادی میں اپنے گھر سے باہر نکلی۔ درد آہستہ آہستہ بڑھتا گیا جو لہروں کی طرح اس کے سارے جسم میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ خاموش گلی کے درمیان بیٹھ گئی۔ رات کی سرد ہوا نے اس کے جسم کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔ وہ اس شدید درد پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی چیخوں نے ہمسائے میں سارے کتوں کو متوجہ کر دیا تھا۔ وہ آ کر اس کے قریب بیٹھ گئے اور کبھی کبھار اس کا سر چاٹنے لگتے۔

اس رات، اس نے دو بچوں کو جنم دیا، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس شہر کی یہ گلی جو کہ کسی کے کسی نالے کی طرح گندی تھی پورے چاند کی بھی رات میں بھی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ آخری کچھ مہینوں میں، اس نے اس شہر میں خوبصورتی کی کوئی بھی شے محسوس نہیں کی تھی۔ کسی نہ کسی طرح، وہ اُٹھنے میں کامیاب ہو گئی اور اپنی کمربند میں سے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے ایک نیا بلیڈ نکال کر بچوں کی نال کاٹ کر اپنی ناف سے الگ کیا۔

لڑکی جانتی تھی کہ ابھی کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔ کچی آبادی میں سے عورتیں، اسکی دوست اس کو

تلاش کرتی ہوئی آئیں گی اور اسے اس گلی میں پائیں گی۔ وہ بچوں کو دیکھیں گی اور ایک دوسرے کو کہیں گی،

"دیکھو! گھری گلاؤں نے بالآخر کچھ اچھا کیا ہے۔ اس نے ایک ہی وقت میں دو بچوں کو جنم دیا ہے۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی اور ایک پیارا سا چھوٹا لڑکا! آؤ ان کو اٹھائیں اور ان کو گھر لے چلیں۔ ہم ان کو سب کچھ دیں گے جو بھی ہمارے پاس ہے۔ اور اری گھری گلاؤں! کیا اب آخرکار تم ہمیں اپنا اصل نام بتاؤ گی؟"

لڑکی نے اپنا سر خوشی کے مارے جھٹکا۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ وہ چلائی، اس کی آواز خوشی کے مارے بلند ہوگئی۔

"ہاں، میں بتاؤں گی۔ میں ہر کسی کو خوشی خوشی اپنا نام بتاؤں گی۔ سنو! سب سنو جو بھی اس شہر میں رہتا ہے! میرا نام کُش پلا تا ہے۔ پھیلنے والا پھول ۔۔۔ اور مجھ میں یہ طاقت ہے کہ میں ہزاروں پھول کھلا سکتی ہوں۔

(بنگلہ دیشی ادب)

☆☆☆☆

جان کرسٹوفر فریڈریش شیلر (جرمنی)
تعارف و جرمنی سے ترجمہ: انور ظہیر

رہبر شیلر کی دو نظمیں

جان کرسٹوفر فریڈریش شیلر 10 نومبر 1759ء کو جرمنی کے ایک گاؤں مارباخ جو دریائے نیکر کے پہلو میں واقع ہے، میں ایک فوجی ڈاکٹر کے گھر پیدا ہوئے۔ شروع کے چار سال بیماری اور غریبی میں گزرے۔ 1762ء میں شیلر کے والدین مارباخ سے لورش منتقل ہو گئے اور یوں شیلر نے پہاڑی اور گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے اس گاؤں میں پرورش پائی۔ شکل وشباہت انھوں نے اپنی ماں سے لی تھی یعنی دبلا پتلا جسم، سرخی مائل بال، چوڑی پیشانی اور حساس چمکتی آنکھیں۔

پانچ سال کی عمر میں انھوں نے گاؤں کے اسکول میں اپنی تعلیم کا آغاز کر دیا تھا اور چھ سال کی عمر میں ان کے والد نے انھیں لاطینی زبان سیکھنے کے لیے ایک دوسرے اسکول میں بھی داخل کرا دیا۔ عمر کے لحاظ سے یہ سب کچھ بہت جلد تھا لیکن شیلر نے یہ سب کچھ اس قدر جلد سیکھا کہ بہت چھوٹی ہی عمر میں ان میں چرچ کا پادری بننے کی خواہش پیدا ہو گئی۔

سات سال کی عمر میں ان کے والد کو فوجی خدمت کے لیے لوڈوگسبرگ جانا پڑا جہاں وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ چلے گئے۔ یوں شیلر نے پہلی بار شہر میں قدم رکھا۔ شہر کے بہترین اسکول میں تعلیم کا دوبارہ آغاز کیا، ساتھ ہی ساتھ لاطینی زبان کے سلسلے کو بھی دوبارہ سے شروع کیا۔ تیرہ سال کی عمر میں شیلر نے چرچ میں دینی تعلیم کا آغاز کیا اور اس سے ایک سال قبل ہی انھوں نے اپنی معنی خیز شاعری کی ابتدا کی۔

فریڈریش شیلر کے یہاں ان کی ابتدائی زندگی میں ہی گھر کرنے لگے تھے۔ انھوں نے اصل میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن وجہ شہرت ان کی تخلیقات ہی ہیں۔ شیلر نے شاعری کا آغاز بہت جوانی میں کر دیا تھا۔ شیلر اپنے کلاسک دور کے نمائندہ شاعر ہیں اور اپنے ہی عہد کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ 1765 اور 1790 کے درمیان کے سالوں کی ہم حساسیت اور کلاسیکیت کے ادبی دور کے طور پر درجہ بندی کر سکتے ہیں۔ اس دور میں احتجاجی تحریک نے روشن خیالی کے بطن سے جنم لیا تھا اور احتجاج اس وقت کی درباری دنیا کے ساتھ ساتھ دیگر مطلق العنان حکام کے خلاف بھی تھا۔ جسے تنگی اور بے خوشی کا دور بھی سمجھا جاتا تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس دور کے اخلاقی تصورات بہت پرانے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس تحریک کو طبقے کے

خلاف بھی سمجھا جانے لگا تھا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ احتجاج کو ادب میں روایات کے خلاف سمجھنے کی غلطی آج بھی
دوہرائی جاری ہے۔ اس عہد کے نمائندے اکثر نوجوان مصنفین تھے جنھوں نے روشن خیالی کی اس وقت کی
موجودہ شکل کی مخالفت کی تھی تو دوسری طرف ادیبوں نے شاعری میں شاعری کے ذاتی جذبات کے اظہار کے
لیے موزوں زبان تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ دو واضح طور پر مختلف نظریات کو 18ویں صدی میں
منتقل کیا گیا۔ روشن خیالی اور ایک جذباتی تحریک جس کی نمائندگی اس دور کے مصنفوں نے کی۔ وائی مر
کلاسیکل دور بھی ان دو عناصر کا ملاپ ہے۔

وائی مر کلاسیزم کا آغاز 1786 میں گوئٹے کے اٹلی کے سفر سے ہوا اور 1832 میں جوہان وولف
گانگ فان گوئٹے کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ وائی مر کلاسیزم کی ادبی موضوعات اور نقطہ آغاز انسانیت،
مہربانی، انصاف، رواداری، عدم تشدد اور ہم آہنگی سب سے اہم تھے۔ کلاسیکل ادب میں اعلیٰ سطح کی زبان کا ہونا
ایک لازمی امر سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ شیلر کے دور میں فطری زبان کو دوبارہ پیش کرنے کا رجحان عام ہوا۔ کلاسیکی
دور میں شیلر، گوئٹے، وائیلینڈ اور ہرڈر کلاسیکی ادب کے "چار ستارے" گردانے جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس دور کے
دوسرے مصنفین نے بھی اہم کام کیے ہیں لیکن ان چار مصنفین کی مقبولیت سے کوئی بھی آگے نہیں نکل پایا۔

1794 میں شیلر نے گوئٹے کو بہتر طور پر جانا۔ یہ دونوں بظاہر بہت مختلف انسان تھے۔ گوئٹے کو کبھی
بھی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، دوسری طرف شیلر کو مالی پریشانیوں اور بیماری کی وجہ سے بہت زیادہ
مشکلات سے گزرنا پڑا۔ جب گوئٹے نے شاعری کرنی شروع کی یا دوسرے سائنسی کام کیے تو اسے یہ سب کچھ اپنی
بہتر زندگی کے باعث محسوس کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوئی لیکن دوسری طرف شیلر اپنے اردگرد کے ماحول کی
وجہ سے خوبصورتی یا انسان دوستی جیسے نظریاتی تصورات سے فلسفے کو ترجیح دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیلر کی زبان
گوئٹے کی طرح فطری نہیں ہے لیکن بہت حد تک مصنوعی بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان ہمیں متاثر
کرتی ہے اور سوچ کی راہیں کھولتی ہے۔ لیکن ان تضادات کے باوجود دونوں شاعروں میں ہمیشہ گہری دوستی اور
بہت احترام رہا۔

1799 میں شیلر وائی مر چلے گئے۔ وہاں گوئٹے اور شیلر کی دوستی نے دونوں کو دوبارہ شاعری
کرنے کی تحریک دی۔ شیلر اس سے قبل ڈرامہ "ڈان کارلوس" تحریر کر چکے تھے۔ یہاں شیلر نے شہرہ آفاق
ڈرامے "والنسٹائین"، "دی میڈ آف اورلینز" اور "میری اسٹیورٹ" لکھے۔ اس ڈرامے میں شیلر بتاتے ہیں کہ
کس طرح ملکہ میری اسٹیورٹ کو اس کی مخالف ملکہ الزبتھ نے ناحق موت کی سزا سنائی تھی۔ لیکن وہ اپنی موت کی
تصدیق کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی میں ماضی کے جرم کی سزا کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس طرح وہ

الاجتہ پہ باطنی طور پہ فتح پالیتی ہے گو کہ وہ ظاہری طور پہ فنا ہو جاتی ہے۔

"ڈی گو کے" نظم میں شیلر نے پیدائش سے موت تک انسانی راستے کو بیان کیا ہے۔ ان کا آخری مکمل ڈرامہ" ولیم ٹیل" ہے۔ اس میں انھوں نے سوئزر لینڈ کی آزادی کی جدوجہد کو ان کے لیڈر ٹیل کے نام سے منسوب کیا ہے۔

شیلر ایک بہادر، ایک دلیر لڑاکا اور محنتی انسان تھے۔ انھوں نے اپنے آپ سے بہت زیادہ امید یں لگا رکھی تھیں اسی لیے وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ ان کا انتقال 46 سال کی عمر میں 1805 میں وائی مر میں ہی ہوا۔ اگر زندگی اتنی جلدی ختم نہ ہوتی تو وہ مزید بڑے کام کر گزرتے۔ ان کے جلد انتقال سے جرمنی گوئٹے کے بعد اپنے سب سے بڑے شاعر سے محروم ہوا۔ شیلر اکثر خدا کی بات کرتے تھے۔ مثال کے طور پہ (To Joy) اپنی مشہور نظم" ایک خوشی" میں لکھتے ہیں:

بھائیو! ستاروں سے بھرے آسمان پہ ایک مہربان باپ رہتا ہے" لیکن خدا شیلر کے لیے محض ایک خیال تھا۔ کیونکہ دعا میں خدا سے باتیں کرنا، خدا کی آواز سننا، خدا کو اپنی مدد کے لیے پکارنا ان کی روزمرہ زندگی کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شیلر جو کچھ بھی کرنا چاہتے تھے وہ خدا کے بغیر اپنی طاقت سے کرنا چاہتے تھے۔

ہم انسان اپنے طور پہ بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم آج دنیا کو اس کے متعدد مصائب کے ساتھ دیکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کس قدر بے اختیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیلر بھی اچھے دنوں کے لیے اپنی لڑائی جاری نہیں رکھ سکے اور انھیں اپنی زندگی کے بیچ میں ہی مرنا پڑا اور یوں ان کی ساری خوشی ختم ہو گئی لیکن شیلر کی طرح ہمیں بھی یہ امید ابھی بھی باقی ہے کہ ایک دن خدا ایک ایسی دنیا ضرور بنائے گا جو تکلیف، آنسوؤں اور درد کے بغیر ہوگی۔ ذیل میں ان کی دو نظمیں ان کے تفکرات کی نمائندگی کرتی ہیں:

پہلی نظم

شرف انسانی

انسانی وقار حوالے کر دیا ہے قدرت نے

محل کرنا ہے کام تمہارا

اسے چاہو تو زیادہ

اسے چاہو تو

سمندر انسانیت بنا دو
بھی نہ ڈوبنے کے لیے!!
خوبصورتی اور خوشی
ایک فصل ہے
گر اس کو بو دو گے آج
تو کل اسی کو کاٹو گے بھی!!

☆☆

دوسری نظم

دوست دشمن

میرا دوست مجھے عزیز ہے
لیکن میں اپنے دشمن سے بھی پیار کرتا ہوں
دوست مجھے بتاتا ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں
دشمن مجھے سکھاتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے

☆☆☆☆

Muhammad Maroof Shah

Intertextuality in Master Works of Contemporary Kashmiri Literature: The Quest in Rahi and his Poem "Zindagi"

Rahman Rahi, arguably modern Kashmir's most important poet, is best read as a cosmopolitan poet who adopted postmodern idiom to express what is most important in local tradition, at least at poetic plane, and bears reading with the best contemporary poets across cultures. Poetry as such is an identity that subsumes other identities. By being artists other divisive identities are transcended without being disrecognized. Rahi has appropriated in captivating and sublime language, the best of Persian Masters in(post)modern idiom. Certain important elements in Hafiz, Bedil and Ghalib, on the one hand, and German Romantic-mystic poets on the other hand, find echoes in him without forgetting the question of the political that he subtly engages with. And this, without failing to appropriate the mostly benign influences from almost a dozen of the best writers including transcendentalists, modernists, existentialist and absurdists. I focus particularly on his poem"Zindagi" in his latest collection Kadl-iTaethesPaethio show cross cultural influences and appropriations and how it turns to be local and global and his vision of life as an artist avoids other ideological visions whose politicization is partly responsible for Kashmir conflict.

Rahi has been self avowedly a poet in love with the best of East and West and this is amply exemplified in his work. This thesis I seek to illustrate by making a study of one of his poem"Life" in which we find his"statements" about the most important subject of poetry(in fact the subject of poetry. I can't invoke varied influences which he has himself acknowledged influencing his fundamental convictions or aesthetics or worldview which are important for understanding his work. Rahi has especially acknowledged influence of Bedil, Ghalib, Hafiz and to an extent of Romantics, especially German Romantics and key modern thinkers/. I will especially touch upon Bedil and Ghalib and tangentially refer to Rilke whom he has also translated.

What better gift to culture than the gift of words/images that is Rahi? What better tribute to Kashmir and Kashmiri genius than in the pages of Rahi where its language(in the beginning of Under the Dark Downpour(, its pluralism and culture of knowledge, its aesthetic framing of life and spirituality and most significantly mystic-romantic sensibility)(for instance, in his Ad nimaeroodum panes tam) are celebrated in a manner that would continue to resound for ages. In any serious discussion on contemporary Kashmir facing crisis upon crisis of faith, of reason, of identity(we can bank upon Rahi's verse to express the darkness and pave way for rebirth.

Rahi remains little explored by his contemporaries in Kashmir, even by the elite literary audience. Very little of quality criticism has been written on his works. His critical works have also

suffered oblivion with time. He has remained, for the most part, obscure or inflected in an idiom that would fail to gain recognition for variety of reasons. And he has not been immune to controversies and some serious critiques from his contemporaries. And increasing pressure on local languages, in the face of globalization, Kashmiri language probably means uncertainty about his reception and legacy in future in native tongue.

Rahi says that he can't say whether the world is stranger for him or he belongs to it. Absurdity of a universe stripped of God haunts him. Death and transience of things he can't consent to on any terms. He is all protest against the disparity between man's dreams and seemingly sordid reality. Lacking faith in immortality he seeks substitutes in the fragmented images of the Absolute in the world of art and life. He has largely succeeded, in Nietzschean style, by virtue of art, to live with certain semblance of meaning for almost a century.

Muhammmmad Yusuf Taing, well known critic of Kashmiri literature and culture, believes that it will require another 500 years to produce second Rahi. Why "What do you like from Rahi's poetry?" "All of it is dear to me," replied Rashi Majrooh, one of the meticulous readers, and critics of Kashmiri poetry, especially Rahi. If we ask this question regarding even the great Kashmiri Sufi poets, not to speak of other poets, none of our important critics can go to this extent. The reason is his work presents the most creative engagement with the Tradition. If we have to pick up one living

writer from Kashmir who can stand shoulder to shoulder with the literary giants from other cultures in the contemporary world, whom would we pick up?' Rahi.

Rahi's wide readings across traditions (his translations from variety of literatures shows this), his great capacity to be receptive to all experience, (he resists all dogmatic posturing both as a critic and a poet), his great care in handling language and attempt at exploring its riches, deep respect for the Tradition, and his great integrity to concede his"art of failure" in the face of the Inscrutable but Irresistible Power and Beauty that moves all things, make him quintessentially human in Shakespearian-Keatsean-Yeatsean terms.

Some studies on Rahi's poetry have been published but little on him as a translator and critic. Rahi's Kahvit easily passes as the best book on literary criticism in Kashmiri. There is something universal in his sensibility and taste that he could find himself at home (as translator) in such diverse things as Arabic masterpiece Sab'aMuallaqat, Punjabi Baba Farid's Sufi poetry, English Marlowe's Dr Faustus and Russian and German poetic and philosophical texts while not forgetting Persian. He has attempted to assimilate and appropriate the culture of classics of half a dozen languages as evidenced by dense allusions, cross references and interxtextuality in his works.

The difficulties of penetrating Rahi's universe of meaning[] illustrated in the poem Zindagi chosen for detailed study here[] convince me that he is not difficult because he intends to, but

because Kashmiri tradition is"difficult."Rahi has sought to give expression to almost all that is great, grand, noble, profound, and perennial in our tradition. The text used as Kashmir University Tarana shows his horizon of imagination, his assimilative power and his grasp of the quintessential intellectual, spiritual, religious and artistic genius of Kashmir.

Rahi is a poet of heights and depths and that explains why he is not easily accessible. Reading Rahi, one gets a peep into almost everything important that engages modern mind and that calls for response from a truly representative or universal poet. Appropriating all the paths mankind has in approaching the ultimate questions of truth or reality philosophy, mysticism, religion and poetry Rahi gives us a poetry that will need generations to explore in all its riches.

He recovers from the modern wasteland of spirit something of the Sacred to illumine the dark odyssey that life has become today. Rahi's faith consists in opening up to the Mystery that is the Divine or Sacred grounding everything he finds life in its essence while duly acknowledging our inability to have a proper dialogue with it(thus resulting in his essentially tragic but not despairing vision) in the sense that one could ecstatically sing with Rumi or Hafiz. However, he has enough faith to make an address to It: "Chi yuschuktisu, moan faryadboaz" ("Whosoever You are, listen to my my plea") reminding one of a chorus in Aeschylus addressing the Greek God "Zeus: whatever he may be." Like this Zeus, the Sacred of Rahi"constitutes the hidden and unrepresentable background that sustains all the

meaningful practices of the culture." How can we otherwise explain his exquisite Na'atand tributes to Marsia. One can unearth such a deep and powerful conception of the sacred in"Rahi, the gossaen" (Rahi, who wears saffron clothes) Rahi who writes exquisite Na'at, Rahi who, in Kafkaseque vein, finds hard to decode the language in which God talks to us.

Here many critics have confounded the man and the artist in Rahi; his great art redeems him if he needs this redemption. He is not a saint; he is an artist. The best of Rahi is unsaid; I hope we can decipher it between the lines he has bequeathed us. Rahi is a phenomenon. No reader of him can claim to have exhausted his riches. He is too subtle, profound and polysemic to let you sleep complacently after trying to read him.

In his Nobel Prize acceptance speech, Albert Camus declared that a writer's duty is twofold: "the refusal to lie about what one knows and the resistance against oppression." We find in Andre Gide a statement"An artist offers experience not doctrine" One may restate both these points by saying that a writer or artist is one who chooses life against death. Rahi fundamentally celebrates life and is skeptical of different constructions or meaning schemes woven around its mysterious halo. Both these points may help us in responding to popular critiques of Rahi in Kashmir. Rahi has been both hailed and reviled for extra-artistic or ideological reasons that don't help us illuminate the phenomenon that is his work. One can't afford not to fall in love with much of his work because it unveils life with its

contradictions, charms and questions. Life is too complex and mysterious and contradictory to allow neat and clear binaries and judgments. Rahi's work resists and should resist as does the evasive mysterious life in each one of us easy decoding. The tendency to interpret as distinguished from aesthetic enjoyment or contemplation is what great poetry calls into question. Poetry bears witness to life and employs resources like language to their limit for expressing this life's transcendence of all interpretative or linguistic and conceptual framings. One image that describes Rahi's life and universe his mystery, his longing, his Question, his silence is Iqbal's Lala'aySehra. Rahi's work describes human condition as perpetual travel to a destination not clear and our task as struggle to be ourselves, to unfold and to take one's share of "silence and heartglow, rapture and grace." It is in a way summed up in his poem titled Zindagi Life.

In his poem "Zindagi" (translated in English by Hameeda Bano) we read:

> A child wonderstruck
> At the first lesson in school,
> From a multifarious
> ambiguous tome!
> In Python's mouth
> Ruby flashes forth flames,
> It is a bubble rising from the bosom
> Of the dumb ecstatic lover of dreams.

This is mystico-romantic heritage celebration of mystery, of

innocence, of wonder,of childhood, of virginity of nature, of feminine receptivity to other summed up and one finds here romanticization of wonder that we find in great poets, East and West. The Romantics have especially made this point well known. See the title and introduction and conclusion of Abram's book Natural Supernaturalism. Rahi celebrates this natural supernaturalism and that accounts for certain eerie atmosphere of many of his works. He recalls Coleridge in his invocation of the supernatural though he would be averse to taking a transcendentalist turn. A magic realism suffuses his work.

Here I focus on wonder and mystery in inspired texts of world religions and great literature to better perspectivizeRahi and see how he assimilates all this universe in his work and creates an aesthetic of existence.

Bedil whose influence on his work he has acknowledged is dear to him has stated:

> For ages my beloved came into my embrace veiled
> Yet another one of her coquetries that I, Bedil, well know.
>
> In the desert of fancy there are no fixed points
> To find our bearings no need have we
>
> Only the word heard through the veil, no audience with the heart had I.
> How to disclose what I did not see, the mirror-maker you

should ask Bedil (M. A. Farooqi'strans.)

One may quote one representative verse of Bedil (all verses, below, are M. A. Farooqi's translations, unless otherwise specified) that states the thesis of equivalence of earth and heaven or finding heaven here and now that poets have often counseled, especially the Romantic poets:

"What is 'there' becomes'here' when you reach it; likewise your today disguises itself in the form of tomorrow."

"So long as you do not resume silence, the distinction of appearance and reality will remain; a thread not tied by a knot must always have two ends."

What distinguishes Rahi and postmodern poets in general from more mystically informed Persian/Kashmiri mystic poets is acute sense of frustration and failure in enjoying life and its joys to hilt due to transience of life. Bedil, in contrast, has found his salvation in the interior life and doesn't hanker for what can't be granted by the order of the worlds. As Bedil puts it:

Discover eternal joy
A fulfilled heart
None but the self can get us there
I asked my heart what I should do with time
I learned I have no use for time
We are surrounded by amazement
None but the self can show us the truth

Rahi is poet because he wants to live. Meaning of life if any is

in writing poetry. Rahi has stated this theme at many placed. One recalls Bedil again for making the point about holy vocation of poet in Holderlin and Rahi. If it is asked what is Bedil doing when writing if it is not an act to bridge the gulf between himself and the Beyond, one might reply in his own words:

"Friends seek struggle in this world
Struggle takes us to the festivities of the delicate
Do not ask where my writings came from
Grief has a bond with the writer's profession"

Bedil has proposed an"answer" to nihilism by suggesting circumambulating the kaaba of text and text within texts until one is consumed by this created word and world that ceaselessly seems to recede and created anew.

A text, even if it is entirely full of meaning, can be edited or added to: Silence.

Is a text from which one cannot pick and choose(S. R. Faruqi's trans.)

"As long as silence reigned(i.e. as long as there was no verbalization of Reality) all was calm and un-disturbed, it is the tongue of man that has given a hot-bed of stormy waves to the ocean (of life.")

Silence is the answer that Rahi also proposes in this poem and elsewhere as well though this silence is more Becketteau(that stops short of accessing the stillness of Essence or Absolute and thereby bracket every worry or need or obsession with texts/memories) than

properly mystical or sagely as one would notice, for instance, in a Rumi or a Ramana Maharishi. Silence tastes heavenly and resolves all questions including the question of immortality and reconciles one/may makes one celebrate/to life in all its hues including its seeming transience and death.

Rahi like great Persian poets such as Hafiz and Bedil doesn't trade in any grand vision or narrative of Truth. Neither does he claim to have found his Love. God remains somewhat of an enigma as does Meaning/Heaven. One may quote Faizi and then Bedil on this question.

> Don't seek from the heavens the mysteries
> Of beginningless eternity: the heavens are far,
> Day and night there Are but curtains strung by darkness and light.
> Don't harbour the ambition of putting foot on the heights
> For that station is at a great altitude;
> Don't speak of coming close to him, for the Sovereign
> Is jealous of all others(Faizi, S. R. Faruqi's trans.)

This is Bedil:

> Humans are not capable of understanding the truth
> Impossible that truth would appear in this world
> Our heart filled with fear
> Even if we see the truth, we worry to approach it
>
> How can we know the purpose of existence?

Amazement will come with the truth

Do not hold the mirror for each breath

The last breath is enough for me to know the truth

I travelled: by flying or by the labour

Of stumbles and leaps,

I travelled everywhere until

I Arrived at non-arriving.

Rahi has expressed his debt to Bedil and some other poets of sabakihindi tradition. And here we find all these illustrations.

Rahi engages with the tradition, interrogates its gaps and absences and finds something to take home to help him in finding some semblance of meaning. He seems to deploy Socratic questioning and suspend any conceptualizable affirmation in expressible terms. Few know that prophets don't claim(discursive) knowledge of things high but emphasize mystery and humility and that"man has been given but little knowledge. Philosophy also doesn't claim to know wisdom but seeks to prepare one for love of wisdom. Here is how Heschel sums up what the Biblical prophets declared. "I said, I will be wise, but it was far from me. That which is, is far off and deep, exceedingly deep. Who can find it out" (7:23-24)."Wisdom is beyond our reach. We are unable to attain insight into the ultimate meaning and purpose of things. Man does not know the thoughts of his own mind nor is he able to understand the meaning of his own dreams(see Daniel 2:27)." Beware lest we say, we have found wisdom ("Job 32:13").They who

travel in pursuit of wisdom, walk only in a circle;and after all their labor, at last return to their pristine ignorance."

Now read Rahi:

The illusory goal,

Dark jungle of evening,

Steps into nowhere,

This is the dilemma, this the agony of life.

Rahi engages with the tradition, interrogates its gaps and absences and finds something to take home to help him in finding some semblance of meaning. He seems to deploy Socratic questioning and suspend is affirmation in expressible terms. To quote Heschel'sexplication of little understood Prophetic awareness of the Question:

Biblical Prophet who searched for wisdom reported, "I have acquired great wisdom, surpassing all who were overJerusalem before me" (1:16). But he ultimately realized"that man cannot find out the work that is done under the sun. However muchman may toil in seeking, he will not find it out; even though awise man claims to know, he cannot find it out" (8:17). "I said, I will be wise, but it was far from me. That which is, isfar off and deep, exceedingly deep. Who can find it out?" (7:23-24)

Ecclesiastes is not only saying that the world's wise are not wiseenough, but something more radical. What is, is more than whatyou see; what is, is"far off and deep, exceedingly deep." Being ismysterious.

Wisdom is beyond our reach. We are unable to attain insight intothe ultimate meaning and purpose of things. Man does not knowthe thoughts of his own mind nor is he able to understand themeaning of his own dreams(see Daniel 2 :27) (Heschel, 1955:54).

One may here recall popular Urdu verse"zindagi terae masoom sawaloo sae pareeshan hu mei"(O Life, I am troubled by your innocent questions) and Heschel's explication of the Abrahamic orJudaic insight: To quote Heschel: "Indeed religions and mysticism don't identify a particular goal of life. For them life is goal with all its enigmas and its agony is to be embraced and therein lies secret of its splendor." The Prophets have unanimously taught that the existence of the world is a mysterious fact. Referring not to miracles or startling phenomena, but to thenatural order of things, they insist that the world of the known is a world unknown; hiddenness, mystery. What stirred their souls was neither the hidden nor the apparent, but the hidden in the apparent; not the order but the mystery of the order that prevails in the universe......What is our wisdom? What we take account of cannot beaccounted for. We explore the ways of being but do not know what,why or wherefore being is. Neither the world nor our thinking or anxiety about the world are accounted for. Sensations, ideas areforced upon us, coming we know not whence. Every sensation is anchored in mystery; every new thought is a signal we do not quite identify. We may succeed in solving many riddles; yet the mind itself remains a sphinx. The secret is at the core of the apparent;the known is but the obvious aspect of the unknown(Heschel, 1955:56).

Given philosophy's beginning in wonder as we find in Plato and its culmination as well in wonder as Whitehead noted and given literature is a project of defamiliarizationas Russian formalists would phrase it and mysticism as treasured discovery of the station of wonder as Ibn Arabi has shown and religion understood as awareness of the divine beginning with wonder as Heschel notes, one may appreciate Rahi's ecstatic surrender before life's mystery and incomprehension as It is the result ofwhat man does with his higher incomprehension. Even science, despite rationalism's veto, is not ready to do away with mystery and wonder. Einesteinrightly noted that the most treasured things is mysterious. Plank explained in his Scientific Autobiography it in some detail:

The reason why the adult no longer wonders is nor because he has solved the riddle of life, but because he has grown accustomed to the laws governing his world picture. But the problem of why these particular laws and no others hold, remains for himjust as amazing and inexplicable as for the child. He who does nor comprehend this situation, misconstrues its profound significance, and he who has reached the stage where he no longer wonders about anything, merely demonstrates that he has lost the art of reflective reasoning(Plank, 1949: 92-93).

"No illumination", remarks Joseph Conrad in The Arrow of Gold, "can sweep all mysteryout of the world. After the departed darkness the shadowsremain." Heschel further notes that"The world is something we apprehend butcannot comprehend. Significantly, the

Hebrew word'olam that in post-Biblical timescame to denote"world" is, according to some scholars, derived fromthe root'a/am which means to hide, to conceal. The world isitself hiddenness; its essence is a mystery(Heschel, 1955:58). Heidegger's explication of Being converges with the same insight. Rahi as a poet or artist is faithful to the tradition that acknowledges Mystery in the First Principle. Now read Rahi:

The illusory goal,
Dark jungle of evening,
Steps into nowhere,
This is the dilemma, this the agony of life.

Life is a whirling flame
Flashing like a red rose
A darkening glare of beams
Visible as a glistering sun.

Squeeze narcissistic essence
From flaming words,
Life is a torment that entices
With soothing allurements.

Rahi doesn't touch immortality theme but its longing and seeming absence informs much of his work. This theme is conspicuous by its seeming absence contributing to the intensity of longing and celebration of earthly life in the poem.

The gift of the wilderness of love
A glittering lamp for eyes,
The mirage of the cooling khol!

Just a little lifting of the curtain
And the vivid scene of resurrection,
It is the Rabab of
Self-muffled musings.

For the students of Persian and Urdu poetry all this is familiar. Music struck by the Other is what the life of self should aspire to. "Youthful Rahi's ghazal"ad namaeroudum panes tam" echoes it).

Another familiar theme is attention to transience and chance that life is. We find in Sadi, Hafiz and other all great poets allusions to this theme.

Reading the pages of destiny at midnight
Under the blood-burning lamp,
At dawn, life is but
A stodgy random choice.

Lie in ambush for the lion
In a thorny bush,
Life is but a dance
Upon a ditch.

Another universal theme is fana and baqa given by Rahi in his inimitable style and choice of imagery. Mansoor is a hero and moth a

martyr of Beauty called higher life. And its cost is trading the soul.

Kissing the gallows, the frenetic lover
Embraced life,
Breaching the set path
A hot pursuit of retribution.

Life doesn't yield any final meaning. Everything here is a play of signs. All signposts leading to Nowhere. Life's enticements and charms allure us but then what do we find? More movement, Derwiesh's journey from pre-eternity to post-eternity, as Hafiz would put or"her dem ravan hae zindagi" as Iqbal would put it.

Now see Rahi:
Squeeze narcissistic essence
From flaming words,
Life is a torment that entices
With soothing allurements
Without, a vivifying jungle
Within, a volcano
Life is a dream of the ascetic,
Mad after nymphs.

One finds Nietzschean echoes in Rahi who has acknowledged influence of Nietzsche and who has translated parts of ThusSpake Zarathustra, in his embracing of life without judgment, in its totality, its mystery and terrible beauty although his emphasis on love is something un-Nietzschean.

Rahi's more postmodern or more skeptical aspect is further

developed in hitherto little noticed work of Rahi's colleague and arguably our most celebrated postmodern contemporary poet and critic and literary historian, ShafiShouq.

References

S R. Faruqi, S.R.,2003.Stranger in the City. The Poetics of Sabk-ihindi http://www.columbia.edu/itc/mealac/pritchett/00fwp/srf/sabkihindi/srf_sabk_i_hindi.pdf

Mirza Abdul Qadir Bedil,, "Selected Sh'era,"trans. Mudasir Ali Farooqi, in The Annual of Urdu Studiesvol 27

Hameeda Bano"Zindagi,"Eng. translation English Studies in India

Abraham Joshua Heschel, God in Search of Man, New York 1955.

Max Planck, Scientific Autobiography, New York, 1949, 9193.

☆☆☆☆

Salman Bukhari(Japan)

Bees to be

On the arrival of spring, animals, insects, and birds of every region conducted a meeting in which participation of every bird, every animal, and every insect was necessary. But, due to rapid weather changes, participation criteria had quickly changed. Now, only the participation of one of the members of a family of insects or birds was necessary.

Far away from the reach of the world of signals, hidden in the mountain jungles, a large meeting was being held under the presidency of an old Majesty Ant.

As far as the eyes could see, every insect and bird perched on the branches were all ears.

Everyone had the opportunity to showcase the risks to their ancestry.

Though some of the insects and birds seemed frail, they joined the meeting. Everyone was buzzing to reveal their community's problems regarding survival to the old ant.

The old ant was answering their questions calmly, one by one.

One of the bees that seemed quite feeble, her wings and nose affected by rampant disease, addressed the old ant: "Old ant, accept my salutation! I, the Bee, am the representative of my lineage which is on its way to extinction. My being here today and being part of this

congregation is nothing short of a miracle. Oh, old ant! You can see my condition, I'm badly sick with a disease that has been affecting many other bees of my generation. We have tried every remedy to rid us of this illness: we changed areas, sought new climates but, alas, wherever we go these unknown electronic signals follow us.

Yes, you see, just like many before me have stated, in your majesty's presence, the scattered carbon and smoke in the atmosphere is affecting the noses and skins of every creature on Earth.

These electric signals can't be felt but they affect our frail wings badly. Using these radioactive and Wi-Fi signals, humans have become capable of bombarding and eviscerating faraway lands.

Now, these signals have reached our forests because of the placement of several electric poles. There was a time when we decided to leave the polluted cities and settle in the forests. As you know, the forests were already scarce, and were not spacious enough to accommodate all of us. In the last few decades, these radioactive poles have been erected in every forest. Today, is there even a place on Earth where these toxic signals can't reach us?

Old majestic ant! Our generation is unable to fly. A few days after birth, the nose and wings of our children gradually become useless. We can no longer smell the sweet fragrance of flowers, nor can we suck the juice from them. We cannot fly as far and high as we once did with these frail wings. There was a time when we were the greatest source of pollination for different trees, herbs, and plants. Now, pollination is carried out by rain and storms alone. Without this,

it has become incredibly difficult for plants, herbs, and trees to grow.

We have no choice but to crawl in this condition. Old ant, please tell us, where shall we go? What region is fit for us?"

"Hmmm, this is quite a concerning situation, respectable bee." Old ant spoke, giving her a pitiful look."We understand the pain this has caused you. Together we shall warn humans that they must control the vicious amount of poisonous gases and rampant diffusion of radioactive signals in the atmosphere. Otherwise, I am afraid we will die and so will they..." Old ant heeded in a dark warning tone.

"Just as the respected cockroach, leader of the pests, pointed out before, humans have been using poisonous and hazardous chemicals to destroy us for years. The truth is, these chemicals don't even affect them much, but rather, they function as a poison for humans and other creatures. Cockroaches can hold their breaths as a defense mechanism. More frequently, they are crushed by the feet of humans. Despite this, hundreds of litres of their sprays have been spread in the atmosphere, harming other creatures.

One of the respected insects from the algae family emphasized an important point. He said humans use thousands of litres of acid and chemicals in their kitchens and washrooms for so-called cleansing which ultimately travel down to rivers, streams and lakes. In the presence of these chemicals, our aquatic creatures are dying. The eggs of female fish cannot be fertilized because of this toxic and polluted water.

Water is the only guarantor of human life on earth. If it is all polluted, imagine the future of the human race and every living

organism; it will be nothing but death and destruction. In the depth of the sea, there is a network of radioactive electric wires. It is called the Internet, which humans have recognized as a milestone. It may benefit humans in numerous ways but the radiation that it produces has been killing insects, animals, and birds. Humans could never predict the danger this radiation truly poses.

Another insect of the sea spoke about the dangers associated with plastic waste that humans aimlessly throw away in the sea as garbage. Whole progenies of fish are impelled to eat this lethal plastic waste to satiate their hunger. According to the honoured crab, several plants on the deep layer of the sea, that are necessary to the ecosystem, lost their ability to regulate themself due to overconsumption of plastic waste.

In simple words, the deepest layer of the sea has become infertile. And so, the growth of sea plants has become severely inhibited. But no human has thought twice about throwing their plastic waste in the oceans.

A sick firefly, on the verge of its last breath, slowly raised his hand to speak. His interruption was accepted and he was invited to speak:

"Old ant and my honourable friends, accept the salutation of a firefly, a gleam of light in the dark night. My father joined this meeting last year. Today, he is not alive. Last year, more than half of my family members were killed in the shower of pesticides sprayed by humans.

Try as you might, you will not find a human settlement that

does not use pesticides to grow their plants. They may make their plants grow faster and bigger in size, but these chemicals make us gravely ill day by day.

Our generation is dying prematurely. Old ant, I hear the discourse of the flowers. They complain about their premature blossoms that sprout fake smiles while left permanently ruined by these chemicals. Even Woodpeckers, Mynas, Bulbuls, and Nightingales are afraid of going into the gardens in fear that these sprays might kill them.

We, the fireflies, used to spread light in the dark. Now, the night seems brighter than the day. Old majestic ant, please tell us, where shall we go"?

Old ant, spoke in reply, shifting in her seat, "O firefly! I appreciate your courage in coming from so far away to speak of the hazards that face us all. As has been confirmed by all the animals today, our existence is at immediate risk and our lives are in grave danger.

I am grateful to all of you that have honored me with your presence today and always, to have deemed my advice worthy of consideration. Today, I want to unveil a secret which might appeal to your courage. After listening, you will be able to combat these dangers you speak of.

I was told by my ancestors that, hundreds of years ago, ants were living in large colonies as they were carnivorous, lazy and much bigger in size. Our lineage was raised tumultuously and there was no

discipline in our lives. We did not collect any food for winter. We did not bother to stand in queues. And very often, we left our sick fellows helpless. We built our houses on land, which were hit by asteroid showers, every day.

Due to the lack of food and miserable weather, our generation slowly fell prey to extinction. Then, our clever ancestors decided to change their way of life to save their progeny. First, we decided to build our houses under the surface of the earth. Then, we trained to become active and healthy by losing weight. A few thousand years of toil passed, and we achieved our goal. The third strategy was to enact discipline in our lives. The fourth and final was to retain unity which became an essential part of our lives.

After this, we foresaw the path we had to take, a new chapter of life. We emphasized the spirit of life; helping each other, with sympathy for all, positive thinking and not giving up. These became the new pillars of our lives. You are aware, us ants, we are much safer today, as our houses are far away from human reach. I suggest to you all the very same—to distance yourself from the reach of humans and build your lodges in the depths of the earth. Movement should now be done in the dark when there are less humans nearby. The flies should live near wild plants. Try to dwell far from the cities. Otherwise, I fear that the polluted climate of the city will pull you all closer to death much faster."

Having said this, old ant adjourned the meeting for the next day.

☆☆☆☆

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
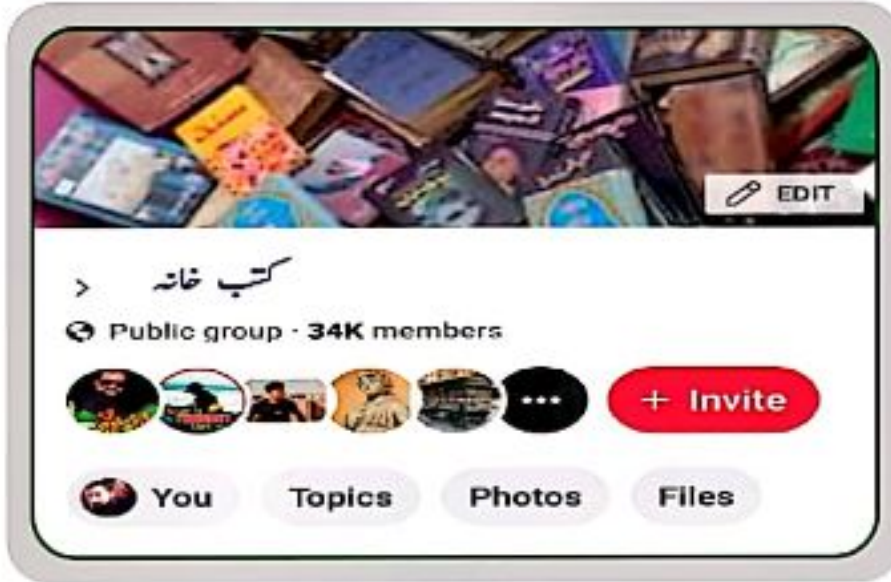
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

Adabiyaat International

2023
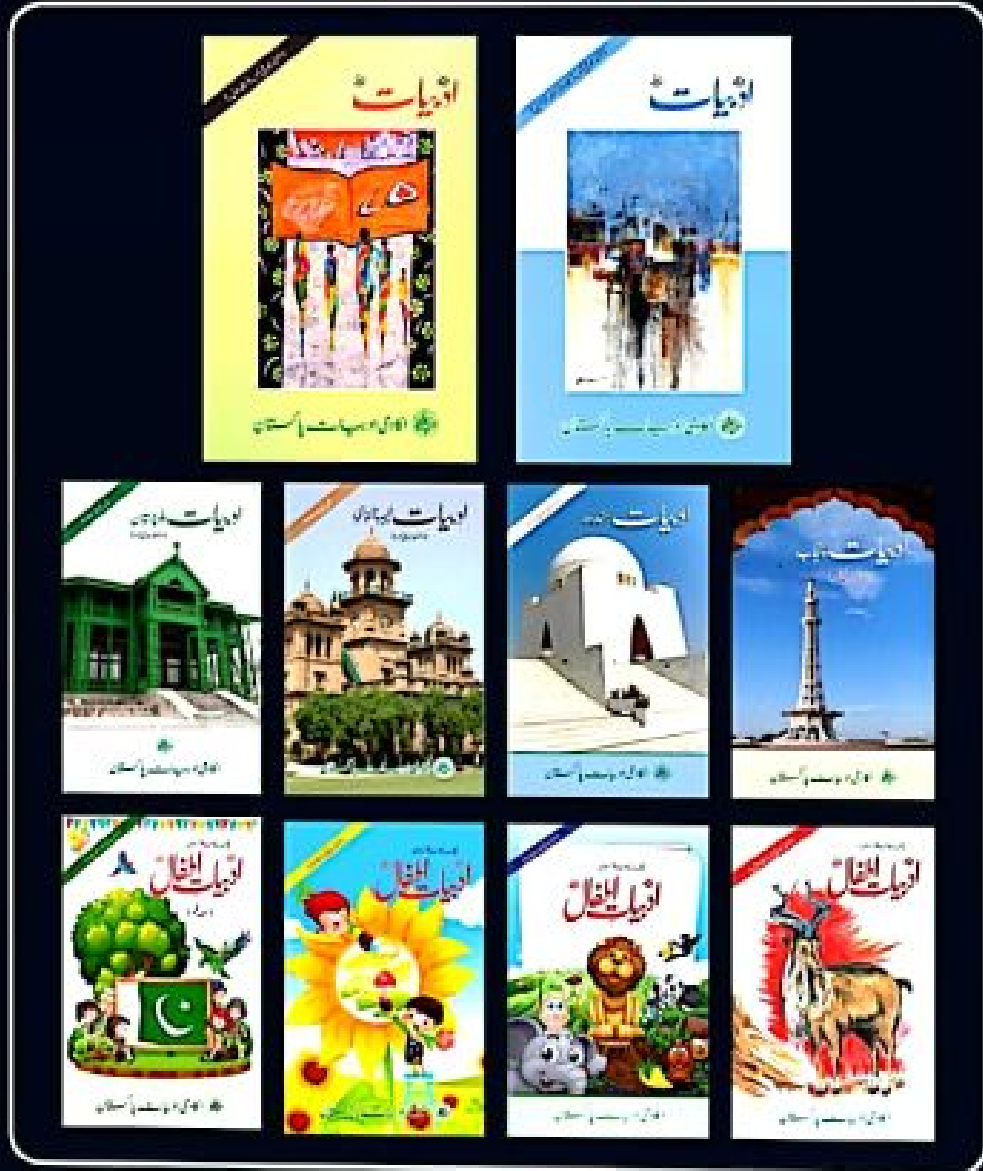
PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: ar.saleemipal@gmail.com